MAIS215CCT

ہندوستان کے مسلم مفکرین اور تحریکات

(Indian Muslim Thinkers & Movements)

ایم۔اے۔(اسلامک اسٹڈیز)

(دوسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Indian Muslim Thinkers & Movements

ISBN: 978-81-967513-2-6

First Edition :**October, 2023**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication	:	2023
Copies	:	600
Price	:	335/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode
Copy Editing	:	Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Masters in Islamic Studies

Indian Muslim Thinkers & Movements

2nd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India

*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

Editors

Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja
Assistant Professor (Islamic Studies)
DDE, MANUU, Hyderabad

ایڈیٹرس

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ
اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Language Editors

Dr. Mohammad Haziq
Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU

Dr. Mohd. Akmal Khan
Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Urdu, DDE, MANUU

لینگویج ایڈیٹرس

ڈاکٹر محمد حاذق
گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو

ڈاکٹر محمد اکمل خان
گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Head, Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syyeda Amina *Guest Faculty/Assistant Professor (Contractual), Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول)، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ، اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامک اسٹڈیز)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر شکیل احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو، کشمیر کیمپس	1
ڈاکٹر عاطف عمران، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو، حیدرآباد	2،3
ڈاکٹر جمشید احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ممبئی، ممبئی	4
ڈاکٹر محمد اسامہ، گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	5
ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، سکریٹری شعبہ تحقیق وتصنیف، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی	6
ڈاکٹر محمد رحمت، اسسٹنٹ پروفیسر، (کانٹریکچول) شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	7
ڈاکٹر فیضان احمد، لکھنو	8
ڈاکٹر وارث مظہری، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی	9
ڈاکٹر ریحان اختر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	10
ڈاکٹر طارق ایوبی، مدیر ماہنامہ ندائے اعتدال، علی گڑھ	11
ڈاکٹر وحید اللہ حسینی ملتانی، سینیر فیکلٹی ممبر، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد	12
ڈاکٹر عبدالرشید، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عالیہ یونیورسٹی، کلکتہ	13
ڈاکٹر فضل الرحمن، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی	14،15
مولانا اجمل فاروق ندوی، انچارج اردو سیکشن، انسٹی آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی	16

پروف ریڈرس:

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فائنل : ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1 : چند مشہور مفکرین

اکائی 1	مشہور مفکر: شاہ ولی اللہ	11
اکائی 2	مشہور مفکرین: شبلی نعمانی، محمد اقبال	26
اکائی 3	مشہور مفکرین: اشرف علی تھانوی، ابوالکلام آزاد	46

بلاک 2 : مشہور تحریکات

اکائی 4	مشہور تحریکات: جمعیت العلماء، امارت شرعیہ	68
اکائی 5	مشہور تحریکات: سنی بریلوی جماعت، تبلیغی جماعت	88
اکائی 6	مشہور تحریک: جماعت اسلامی ہند	107
اکائی 7	مشہور تحریک: مرکزی جمعیت اہل حدیث	125
اکائی 8	مشہور تحریک: مسلم پرسنل لا بورڈ، شیعہ کانفرنس	141

بلاک 3 : تعلیمی ادارے

اکائی 9	تعلیمی ادارہ: دارالعلوم دیوبند	155
اکائی 10	تعلیمی ادارہ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	170
اکائی 11	تعلیمی ادارہ: ندوۃ العلماء	185

اکائی12 تعلیمی ادارے: جامعہ نظامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ 199

بلاک 4 : تحریک آزادی میں مسلمانوں کا کردار

اکائی13 جماعت مجاہدین، فرائضی تحریک 220
اکائی 14 واقعہ 1857 اور مابعد مسلمانوں کی قربانیاں (حصہ اول) 235
اکائی 15 واقعہ 1857 اور مابعد مسلمانوں کی قربانیاں (حصہ دوم) 251
اکائی 16 ریشمی رومال اور خلافت تحریک 265
نمونہ امتحانی پرچہ 290

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اوراس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہم آہنگ کرکے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کرکے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلارہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِدست 144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centers) کام کررہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹرز) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹرز) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ دوسرے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان 'ہندوستان کے مسلم مفکرین اور تحریکات' ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت ایم اے سال سمسٹر دوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں، جو چار بلاک میں منقسم ہیں۔ پہلے بلاک میں اہم مسلم مفکرین، دوسرے بلاک کے تحت ہندوستان میں مسلمانوں کی اہم تحریکات، تیسرے بلاک میں ہندوستان میں اہم اسلامی ادارے اور اخری بلاک میں ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر تحریری مواد شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ (الازہری)

کورس کوآرڈی نیٹر

ہندوستان کے مسلم مفکرین اور تحریکات

Indian Muslim Thinkers & Movements

اکائی 1: مشہور مفکر: شاہ ولی اللہ

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 شاہ ولی اللہ دہلوی

1.2.1 حالات زندگی

1.2.2 تدریسی و تصنیفی خدمات

1.3 تجدیدی واصلاحی خدمات

1.3.1 تجدیدی کارنامے

1.4 سماجی اور سیاسی نظریات

1.4.1 سماجی نظریات

1.4.2 سیاسی نظریات

1.4.3 اصلاحی کوششیں

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

1.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں پوری مسلم دنیامیں بے شمار شخصیات گزری ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں مختلف حیثیتوں سے اسلام کی دعوت و تبلیغ، علوم کی نشر واشاعت اور ملت اسلامیہ کی دینی، سماجی اور سیاسی رہنمائی کا فریضہ انجان دیا ہے۔ بر صغیر ہند میں مغلیہ حکومت کے عہد زوال میں مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی ایسی ہی ایک عظیم شخصیت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ اس اکائی میں آپ کا تعارف، علمی و تصنیفی خدمات، تجدیدی واصلاحی کارنامے اور افکار و نظریات بیان کئے جائیں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ ہندوستان کی مشہور شخصیت شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات زندگی، ان کی علمی و تصنیفی خدمات اور ان کے تجدیدی واصلاحی کاموں سے واقف ہوں گے۔ اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ ان کے افکار وخیالات پڑھ کر مختلف حیثیتوں سے صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہوں گے۔

1.2 شاہ ولی اللہ دہلوی

1.2.1 حالات زندگی

آپ کا نام ولی اللہ بن عبد الرحیم ہے۔ حالاں کہ والد شاہ عبد الرحیم نے آپ کا نام قطب الدین احمد رکھا تھا اور ولی اللہ بھی نام کا حصہ بنایا تھا البتہ آپ نے ولی اللہ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کی ولادت 4 شوال المکرم 1114ھ مطابق 21 فروری 1703ء، قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی میں ہوئی۔ تاریخی اعتبار سے آپ کا سلسلہ نسب بتیس واسطوں سے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب سے ملتا ہے۔ شاہ صاحب کے مورث اعلیٰ میں ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی عہد سلطنت میں ہندوستان تشریف لائے اور ضلع روہتک، صوبہ ہریانہ میں سکونت اختیار کی۔ مفتی شمس الدین نے اس علاقہ میں بدعت وخرافات اور کفر وشرک کے اثرات ختم کرکے صحیح اسلامی عقائد سے لوگوں کو روشناس کرایا اور دین کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا۔ اس خانوادے سے تعلق رکھنے والے دیگر بزرگوں نے بھی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات انجام دیں اور قاضی کا پیشہ اختیار کیا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین بڑے عالم اور متقی و پرہیز گار بزرگ تھے۔ آپ کے والد شاہ عبد الرحیم بھی عالم دین اور سلسلہ نقشبندیہ کے صوفی بزرگ تھے۔ انہیں علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں مہارت حاصل تھی اور مختصر مدت کے لئے مغل بادشاہ اورنگ زیب کی تدوین فقہ میں کی جانے والی کوشش میں معاونت بھی کی تھی۔ بعد میں آپ نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا اور اس میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے مراحل ان کے والد شاہ عبد الرحیم کی نگرانی میں طے ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا گیا اور سات سال کی عمر میں قرآن مجید مکمل کرلیا۔ دس برس کی عمر میں علم نحو کی کتاب شرح جامی پڑھنا شروع کیا۔ اس

طرح شاہ صاحب نے پندرہ سال کی عمر تک اس دور کے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کر لی جن میں عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ۔ علم کلام، منطق و فلسفہ اور طب شامل تھے۔ شاہ ساحب نے قرأت و تجوید محمد فاضل سندھی سے سیکھی اور علم حدیث کی تعلیم شیخ افضل سیالکوٹی سے حاصل کی۔ حدیث میں مشکوٰۃ شریف، صحیح بخاری، ترمذی شریف اور تفسیر میں مدارک اور بیضاوی کا کچھ حصہ والد صاحب سے بھی پڑھا اور اسی عمر میں سلسلہ نقشبندیہ میں والد شاہ عبد الرحیم سے بیعت ہوئے۔ 1131ھ میں والد صاحب کی وفات کے بعد سترہ سال کی عمر سے مدرسہ رحیمیہ میں مسلسل بارہ سال تک درس دیتے رہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی تیس سال کی عمر میں 1143ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور تقریباً چودہ مہینوں تک وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران دو مرتبہ فریضہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور حرمین کے علماء، مشائخ اور محدثین سے کسب فیض کیا۔ مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر مدنی سے حدیث کی کتابیں صحاح ستہ کے علاوہ مؤطا امام مالک، مسند احمد اور جامع کبیر کا درس لیا اور امام شافعی کی کتاب الرسالہ اور قاضی عیاض کی کتاب الشفا کا کچھ حصہ بھی پڑھا۔ اس طرح شیخ ابو طاہر مدنی سے کتب احادیث کی اجازت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں شیخ وفد اللہ مالکی سے مؤطا امام مالک اور شیخ تاج الدین سے صحیح البخاری کا درس لیا۔ آپ نے اس کے علاوہ حرمین کے دیگر مشائخ و صوفیاء سے بھی استفادہ کیا اور تمام صوفی سلسلوں کا خرقہ جامیہ بھی عطا ہوا۔ شاہ صاحب حرمین میں جن اساتذہ سے فیضیاب ہوئے ان کے تعارف اور تذکرہ پر مشتمل آپ نے ایک رسالہ انسان العین فی المشائخ الحرمین تصنیف کیا ہے۔

ہندوستان واپسی کے بعد شاہ صاحب دوبارہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ بہت جلد آپ کے درس کی شہرت اتنی پھیل گئی کہ دور دراز سے کثیر تعداد میں طلبہ اس میں شامل ہونے کے لئے آنے لگے جس کی وجہ سے مدرسہ کی جگہ تنگ پڑنے لگی۔ اسی وجہ سے بادشاہ محمد شاہ نے شاہجہاں آباد کے کوچہ فولاد خان میں واقع ایک وسیع حویلی کا انتظام کر دیا تاکہ تعلیم و تدریس میں طلبہ کے لئے آسانی ہو۔ لہٰذا آپ نے وہاں درس دینا شروع کر دیا اور بہت جلد یہ مدرسہ ہندوستان میں تشنگان علم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ شاہ صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ 29 محرم 1176ھ مطابق 20 اگست 1762ء کو آپ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اور دہلی کے قبرستان مہدیان میں مدفون ہوئے۔ شاہ صاحب نے دین کی تبلیغ، علوم کی اشاعت اور اصلاح احوال کی جو شمع روشن کی تھی اللہ نے آپ کو ایسے لائق فرزند و جانشین شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی کی صورت میں عطا فرمائے جنہوں نے اسے روشن رکھا۔

1.2.2 تدریسی و تصنیفی خدمات

تعلیم و تدریس

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمات کا ایک دائرہ خالص علمی و فکری نوعیت کا ہے جو آج بھی امت مسلمہ کا بیش قیمتی سرمایا ہے۔ آپ نے طویل مدت تک درس و تدریس کے ذریعہ نہ صرف علوم کو فروغ دیا بلکہ علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جنہوں نے ہندوستان میں علوم کی

ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی تدریسی خدمات کا تذکرہ حالات زندگی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ والد شاہ عبد لرحیم کی وفات کے بعد ہی سے جو تدریس کا سلسلہ شروع کیا وہ سفر حرمین کے مختصر وقفہ کے علاوہ تا عمر جاری رہا۔ آپ کی تعلیم و تدریس کا طریقہ اس قدر مؤثر و مقبول ہوا کہ طلبہ کی کثرت سے مدرسہ رحیمیہ کا رقبہ ناکافی ہونے لگا تو اس وقت کے حکمراں محمد شاہ نے دوسری وسیع عمارت کا انتظام کیا۔ یہ نئی درس گاہ بعد میں مدرسہ شاہ عبد العزیز کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ صاحب کا طریقۂ تدریس یہ تھا کہ سب سے پہلے قرآن مجید اور اس سے متعلق علوم پڑھائے جاتے تھے۔۔اس کے بعد کتب حدیث کا درس شروع کیا جاتا بعد میں فقہ، عقائد اور سلوک کی کتابیں بیک وقت پڑھائی جاتی تھیں۔ تفسیر کے تعلق سے طلباء کے لیے یہ ہدایت تھی کہ وہ ابتدائی مرحلے میں تفسیر نہ پڑھیں بلکہ جب عربی زبان میں مہارت حاصل ہو جائے تو اصل متن قرآن پڑھیں اور خود سے آیتوں کے معنی و مفہوم سمجھیں۔ اس کے بعد جلالین کا مطالعہ کریں کیوں کہ وہ مختصر تفسیر ہے اور آخری مرحلہ میں دیگر تفاسیر کا مطالعہ کریں۔

تصنیف و تالیف

شاہ صاحب نے ایک طرف تعلیم کے پرانے نصاب میں مناسب ترمیم اور اصلاح کر کے اسے نئے سرے سے مدون کیا۔ دوسری جانب تصنیف و تالیف کے ذریعہ اسلامی علوم کے تقریبا تمام میدانوں میں قابل قدر اضافہ کیا۔ تفسیر، علوم قرآن، حدیث ، فقہ، تصوف، حکمت، علم کلام، منطق، فلسفہ، سیرت اور اسلامی تاریخ وغیرہ میں آپ کی دستیاب تصانیف کی تعداد پچاس سے زائد ہیں۔

تفسیر و علوم قرآن میں "فتح الرحمان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے فارسی زبان میں ترجمۂ قرآن ہے اور فتح الخیر عربی زبان میں قرآن مجید کی مختصر تفسیر ہے۔ اسی طرح الفوز الکبیر اور مقدمہ فی قوانین الترجمہ کے ذریعہ فارسی زبان میں تفسیر و ترجمہ کے اصول بیان کئے ہیں۔ علم حدیث میں تراجم ابواب البخاری اور شرح تراجم ابواب البخاری دو رسالے حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف کے تراجم اور عنوانات احادیث کی حکمت پر ہیں اور مؤطا امام مالک کی دو شرحیں فارسی میں المصفیٰ اور عربی میں المسویٰ ہیں۔ الاربعین چالیس احادیث کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ علم حدیث پر عربی میں دو رسالے فضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین اور النوادر من احادیث سید الاوائل و الآخر ہیں۔ فقہ میں عقد الجید فی الاحکام الاجتہاد والتقلید اور غایۃ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف میں عربی زبان میں اجتہاد، تقلید اور عدم تقلید کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ہمعات، سطعات، القول الجمیل اور الخیر الکثیر تصوف و سلوک سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ عربی میں عبادات و معاملات کی حکمتوں اور مصلحتوں سے متعلق شہر آفاق تصنیف ہے۔ شریعت کے اسرار و موز کے موضوع پر التفہیمات الالٰیہ اور البدور البازغہ بھی ہیں۔ فیوض الحرمین عربی میں قیام حرمین کے دوران شاہ صاحب پر جو بشارتیں ہوئیں اس سے متعلق ہے۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء عربی میں انبیاء کرام کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اسلامی تاریخ میں ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العین فی تفضیل الشیخین فارسی زبان میں خلافت کے منصب، خلفائے راشدین کی خلافت اور ان کے خصائص کی تفصیلات پر مبنی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شاہ صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے امت کی علمی و فکری رہنمائی کی۔

1.3 تجدیدی واصلاحی خدمات

1.3.1 تجدیدی کارنامے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک ایسے مجدد ہیں جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ جب ہندوستان میں مسلمان دینی، سیاسی، سماجی اور علمی و فکری اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے۔ اور اسلامی تعلیمات سے دور شرک و بدعت اور خرافات میں مبتلا تھے۔ اس وقت شاہ صاحب نے دین کی تجدید، امت کی اصلاح اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ آپ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور مختلف میدانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت میں لکھا ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کو الگ الگ بیان کیا جائے تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہو سکتے ہیں:

1. عقائد کی اصلاح اور دعوت قرآن۔
2. حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی۔
3. شریعت اسلامی کی مربوط اور مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث و سنت کی وضاحت۔
4. اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات۔
5. سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور انحطاط میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔
6. امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو اصلاح و تبدیلی کی دعوت۔
7. علماء، راسخین اور مردان کار کی تعلیم و تربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

شاہ صاحب کی ان جملہ مساعی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تجدیدی ہے یعنی دین کے مختلف شعبوں میں امت کی صحیح رہنمائی اور دسرا حصہ اصلاحی ہے یعنی مسلمانوں کے مختلف طبقات کی دینی، سماجی اور سیاسی اصلاح۔ ذیل میں ان دونوں میدانوں میں آپ کی خدمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

1. علوم القرآن

شاہ ولی اللہ دہلوی کہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو مختلف طریقوں سے رسولؐ پر نازل ہوا اور آپؐ نے الٰہی ہدایت کے مطابق آیتوں اور سورتوں کو ترتیب دیا۔ تمام آیتیں اور سورتیں آپس میں مربوط ہیں اور ان کے درمیان ایک نظم ہے۔ شاہ صاحب مزید کہتے کہ قرآن کے الفاظ اور معنی دونوں الہامی ہیں جو جدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی ان آیتوں کا معنی و مفہوم عربی جاننے والے باسانی سے سمجھ لیتے تھے مثلاً جب نازل شدہ آیات نبیؐ صحابہ کرام کے سامنے تلاوت کرتے تھے تو وہ اس کے معنی، شان نزول اور مقصد کو سمجھ جاتے تھے حتی کہ کفار مکہ بھی اہل ایمان کی طرح اس معنی و مفہوم کو سمجھتے تھے وہ محض اپنی ضد میں اس سے روگردانی کرتے تھے۔ آپ کا یہ بھی کہنا ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد انسان کی ذہنی اور روحانی تربیت کرکے اسے انسان کے لیے مفید بنانا ہے اور قرآن کا انداز بیان اور فصاحت

وبلاغت بے مثال ہے جس نے عربوں کو بے حد متاثر کیا۔ قرآن مجید دائمی ہے اس میں ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ صرف پانچ آیات نزول قرآن کے وقت منسوخ ہوئیں۔ قرآن اپنے نزول کے وقت جس طرح تمام علم کا منبع اور ہدایت کا مرکز تھا اسی طرح قیامت تک رہے گا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی اشاعت اور دعوت قرآن کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے دائمی سرچشمہ قرآن کریم سے امت کے رشتہ کو مضبوط کیا اور اسے ایک مخصوص علمی حلقہ سے نکال کر عام لوگوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ کیونکہ عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ تھا کہ قرآن کو سمجھنا اور اس پر غور و فکر کرنا صرف علماء کا کام ہے اور عوام کے لئے محض اس کی تلاوت کافی ہے۔ حتی کہ علمی حلقوں میں بھی قرآن فہمی کا تصور مفقود تھا۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے اس وقت کی رائج عوامی زبان فارسی میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے قرآن مجید کا سلیس ترجمہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کی لوگ براہ راست قرآن مجید سے فائدہ اٹھائیں اور جو عربی نہ جانتے ہوں وہ بھی ترجمہ کی مدد سے قرآن کو سمجھ کر اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی بھلائی کا تقاضہ ہے کہ قرآن مجید کا روزمرہ کی سلیس فارسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ جو تکلف و تصنع سے آزاد اور متعلقہ قصوں اور مختلف النوع توجیہات سے مبرا ہو۔ تاکہ خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں اور چھوٹے بڑے سب اس سے یکساں طور پر مستفید ہوں۔"

شاہ صاحب کے بعد آپ کے لائق فرزندوں میں شاہ عبد العزیز نے فتح العزیز کے نام سے فارسی میں قرآن مجید کے چند پاروں کی تفسیر لکھی۔ اس کے بعد دوسرے فرزند شاہ عبد القادر نے موضع القرآن کے نام سے مکمل قرآن کی تفسیر تحریر کی اور تیسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کا اردو زبان میں لفظی ترجمہ کیا۔ گویا کہ شاہ صاحب کا ترجمۂ قرآن برصغیر ہند میں فہم قرآن کی تحریک کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ آپ کے فرزندوں کے علاوہ بعد کے ادوار میں علماء کرام نے مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی بے شمار خدمات انجام دیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

2. علم حدیث

شاہ ولی اللہ محدث کا کہنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کتابت حدیث کا کام نہیں ہوا بلکہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا جو دوسری صدی ہجری میں پائے تکمیل کو پہونچا اور حدیث کی پہلی بنیادی کتاب موطا امام مالک بن انس ہے۔ صحائے ستہ اور دوسری حدیث کی صحیح کتابیں بعد میں اسی کو بنیاد بنا کر ترتیب دی گئیں۔ اس لیے شاہ صاحب کے نزدیک موطا امام مالک دوسری کتب احادیث کے مقابلے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے حدیث کی تمام کتابوں کو صحت کے اعتبار سے پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں موطا کو بنیادی کام بتایا ہے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کو طبقہ اول میں رکھا ہے۔ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کو اس کے بعد کے درجے میں جگہ دی ہے۔ اس طرح شاہ صاحب نے صحیح و ضعیف احادیث کے درمیان بھی فرق کیا ہے اور ان محدثین پر کلام کیا ہے جنہوں نے حدیث کی صحت کو جانچنے کے اصولوں پر عمل نہیں کیا ہے اس تعلق سے آپ نے بخاری شریف کو اہمیت دی ہے کیوں کہ امام بخاری نے

حدیث کی صحت کے ضابطوں پر سختی سے عمل کیا ہے۔

علم حدیث میں شاہ صاحب کا گرانقدر کام حدیث نبوی کی وسیع ترویج واشاعت بھی ہے۔ آپ حدیث کو دین اسلام کی اساس تصور کرتے تھے کیوں کہ قرآن کریم کے بعد شریعت اسلامی کا دوسرا سب سے بڑا ماخذ حدیث نبوی ہے۔ جس طرح شاہ صاحب نے ترجمۂ قرآن کے ذریعہ عام لوگوں کے لئے قرآن مجید سے براہِ راست استفادہ کو آسان بنایا۔ اسی طرح وہ علم حدیث کو بھی صرف علماء تک محدود رکھنے کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ عوام الناس کو حدیث کے علم سے واقف کرانے کے لئے موطا امام مالک کی عربی شرح مسویٰ کے علاوہ اس کا فارسی ترجمہ وشرح مصفیٰ کے نام سے بھی تحریر فرمایا۔ ہندوستان خاص کر شمالی ہند میں حدیث اور سنت نبوی کی تبلیغ واشاعت میں عبد الحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب کی جملہ مساعی سب سے نمایاں ہیں۔ آپ کے صاحب زادے شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ "علم حدیث مدینہ منورہ سے والد ماجد لائے"۔ شاہ صاحب نے حرمین میں اپنے قیام کے دوران علم حدیث میں کامل مہارت کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو تدریس و تصنیف کے ذریعہ علم حدیث کے فروغ واشاعت میں اس قدر دلچسپی لی کہ محدث آپ کے نام کا جز بن گیا۔ علم حدیث کی نشر واشاعت کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"علوم یقینیہ میں سے قابل اعتماد اور تمام دینی فنون کی اساس اور اصل علم حدیث ہے۔ جس میں سید المرسلین ﷺ و آلہ و اصحابہ اجمعین کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ احادیث تاریکی میں روشن چراغ، ہدایت کے سنگ میل اور بدر کامل کی طرح ہیں۔ جس نے ان احادیث کا اتباع کیا اور انہیں سیکھا اسے رشد و ہدایت نصیب ہوئی اور اسے خیر کثیر عطا کیا گیا اور جس نے اعراض و روگردانی کی وہ گمراہی و ہلاکت میں پڑا اور اسے نقصان کے سوا کچھ نہ ملا"۔

3. فقہ

فقہ کا بنیادی ماخذ شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن مجید ہے اور چوں کہ حدیث قرآن کا عملی نمونہ ہے اس لیے یہ دوسرا بنیادی ماخذ ہے بعد میں دو مزید ماخذ اجماع اور قیاس کا اضافہ بھی اس لیے ہوا کہ یہ دونوں بھی قرآن سے ثابت ہیں اور قرآن و حدیث کے درمیان آپسی ربط و تعلق کے بغیر فقہ ممکن نہیں ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام کے شروعاتی دور میں فقہی مسائل اور ان کے حل کو باقاعدہ ضبط تحریر میں لانے کا رواج نہیں تھا۔ یہ طریقہ سب سے پہلے مالک بن انس نے موطا میں شروع کیا اور اس طرح انہوں نے فقہی طریقے کی بنیاد رکھی گویا فقہی مسلک کا اصل مصدر موطا ہے جو چاروں فقہی مسالک کی بنیاد ہے۔ اور ان چاروں مسالک کے درمیان جو فروعی اختلافات ہیں اس کی وجہ دراصل فقہاء کا مقصد بہتر سے بہتر متبادل پیش کرنا تھا۔ چاروں فقہی مسلک درست ہیں اور لوگ ان میں سے کسی بھی مسلک کی پیروی کر سکتے ہیں۔

شاہ صاحب کی ایک تعمیری کوشش یہ بھی ہے کہ انہوں نے فقہی اختلافات اور مسلکی تعصب کے درمیان ایک ایسی اتحاد اور اعتدال کی راہ نکالنے کی کوشش کی جو شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ آپ نے فقہی مسائل میں قرآن و سنت کو شریعت کا اصل مصدر قرار دیا۔ ہندوستان میں ترکی اور افغانی مسلم حکمرانوں کے زیر اثر ابتداء ہی سے فقہ حنفی کو غلبہ حاصل رہا۔ اس لیے نہ مذاہب اربعہ کے تقابلی

مطالعہ کا رجحان پیدا ہوا اور نہ ہی باہمی ہم آہنگی کا مزاج پروان چڑھ سکا بلکہ آپسی اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔ شاہ صاحب کو چونکہ حرمین میں شافعی اور مالکی علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا لہٰذا ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی۔ اسلئے گرچہ وہ خود فقہ حنفی کی پیروی کرتے تھے لیکن دوسرے مسالک کو غلط نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابتدائی زمانہ میں جب باقاعدہ فقہی مذاہب کی تشکیل نہیں ہوئی تھی تو لوگ کسی ایک مسلک کے پابند نہیں تھے، بلکہ جس فقیہ سے چاہتے مسئلہ کا حل معلوم کر کے اس پر عمل کرتے تھے۔ لیکن جب بعد میں یہ فقہی مسالک وجود میں آگئے تو لوگ کسی ایک امام کے مسلک کی پیروی کرنے لگے اور دوسرے اماموں کی رائے سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہا بلکہ آپسی اختلافات شروع ہو گئے۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا کہ برصغیر ہند میں چوں کہ حنفی اور شافعی مسلک کے ماننے والے زیادہ ہیں اس لیے علماء کو چاہیے کہ جو مختلف فیہ مسائل ہیں ان کے درمیان اتحاد و اعتدال کی راہ پیدا کریں اور اس کے لیے موطا امام مالک کو بنیاد بنائیں کیوں کہ ان دونوں مسالک کی اصل وہی ہے۔ اور جو چیزیں قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ان میں رائے کا استعمال نہ کریں اور جو دائمی احکامات ہیں انہیں بھی مشروط اور مخصوص نہ کریں۔ آپ نے ہر زمانہ میں پیش آنے والے مسائل کے حل کے لئے بنیادی شرطوں کے ساتھ اجتہاد کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ وہ عوام الناس کو تقلید سے نہیں روکتے لیکن اہل علم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ اجتہاد کرتے رہیں۔

4. تصوف

قرآن اور حدیث میں تزکیہ اور احسان کا ذکر ہے انہیں اختیار کرنے والے صوفی اور سالک کہلاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ احسان، تزکیہ اور عرفان خداوندی کے لیے صوفیا کے یہاں جو طریقے رائج ہیں وہ نبیؐ کی سنت، صحابہ کے عمل اور اسلاف کے یہاں ملتے ہیں۔ اس لیے شریعت اور طریقت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے جسم اور روح کی طرح باہم مربوط ہے۔ البتہ تصوف کی اصطلاحات مثلاً بیعت، خرقہ اور ارشاد وغیرہ یہاں تک کہ لفظ تصوف اور صوفی دوسری صدی ہجری میں استعمال ہوئیں۔ شاہ صاحب کا نظریہ ہے کہ انسان کی اندر اچھائی اور برائی دونوں کیفیات کام کرتی ہیں اور ہر ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفیا کا ماننا ہے کہ انسان کو تین خصوصیات عطا ہوئی ہیں دل، دماغ اور روح شاہ صاحب نے اس میں چوتھی خصوصیت جبلت کو بھی شامل کیا ہے اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ان چاروں کو قابو میں رکھے اور انہیں حیوانی خصلت سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے۔ جنہوں نے انسان کی ان فطری خصلتوں کا تزکیہ کیا اور ان کی تربیت کرنے میں مدد کی۔ لہٰذا انسان کو پیغمبرانہ تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔

شاہ صاحب کے صوفیانہ نظریات میں ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود دونوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاہ صاحب کا ماننا ہے کہ وحدت الشہود دراصل وحدت الوجود کا اگلا مرحلہ ہے کیوں کہ جب ہم وحدت الوجود کا تصور کرتے ہیں تو وحدت الشہود اس میں خود بخود شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ شاہ صاحب کا خاندانی طور پر صوفی سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق تھا حالاں کہ وہ دیگر صوفی سلاسل سے بھی بیعت تھے۔ آپ کا خیال ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ میں توحید کا واضح اور سادہ تصور موجود ہے اور دوسرے سلسلوں کی طرح بعض رسم و رواج مثلاً فاتحہ خوانی، عرس اور زیارت قبور وغیرہ کا رواج کم ہے

حالاں کہ شاہ صاحب ان چیزوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بس ان کا کہنا یہ ہے کہ صوفی طریقے قرآن و سنت اور شریعت کے مطابق ہونے چاہیے اس لیے وہ صوفیا کے لیے قرآن وسنت اور شریعت کا علم لازمی قرار دیتے ہیں۔

5. شرعی حکمتوں کی تفہیم

شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک عظیم الشان علمی کارنامہ شرعی احکامات کی حکمتوں، مصلحتوں اور مقاصد شریعت کی تفہیم ہے۔ حالانکہ آپ سے پہلے بھی شرعی احکامات کے مسالح و مقاصد پر مفکرین اسلام امام غزالی، امام شاطبی اور شیخ عزالدین وغیرہ نے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ شاہ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت ہندوستان میں رائج منطق و فلسفہ کی لایعنی بحثوں میں پڑنے کے بجائے اسلامی عقائد و عبادات، اخلاقیات و سماجیات اور سیاست و معیشت کی حکمتوں اور مصلحتوں پر عقلی اور فلسفیانہ انداز میں گفتگو کر کے فلسفہ حیات کے اسلامی تصور کو پیش کیا۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کی بے مثال تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ اس میں دینی و دنیوی تمام اہم مباحث میں شریعت کے اسرار و رموز پر اس کی کلیات سے جزئیات تک پر نہایت مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ نزہۃ الخواطر کے مصنف حجۃ البالغۃ کے متعلق لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے میں ایسا نور ڈالا جس سے شریعت کے اسرار ان پر کھل گئے۔ پھر ان کا سینہ ان اسرار کے بیان کے لئے کھول دیا چنانچہ آپ نے انہیں بہترین انداز میں حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا۔"

6. سیرت واسلامی تاریخ

شاہ ولی اللہ نے نبوت و رسالت کے بنیادی مقاصد پر منطقی دلائل سے بحث کی ہے۔ اور مختلف تحریروں میں سیرت نبوی کے موضوع کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے سیرت طیبہ کو بیان کرنے کے لیے احادیث کو بنیادی مآخذ بنایا ہے اور مورخین کے طرز پر آپؐ کی سوانح عمری اور اہم واقعات کا محض تذکرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان واقعات کے اسباب و نتائج اور پس منظر پر بھی گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ خلافت راشدہ دراصل مقصد نبوت کی توسیع صورت تھی تاکہ آپؐ کے بعد کار نبوت جاری رہ سکے۔ جیسا کہ بعد میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو وسعت ملی۔ اسی وجہ سے آپؐ نے غزوہ خیبر کے بعد ہی خلافت کا تصور پیش کر دیا تھا۔ شاہ صاحب خلافت پر بات کرتے ہوئے منصب خلافت کی اہمیت وضرورت، اس کی خصوصیات اور خلفائے راشدین کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

1.4 سماجی اور سیاسی نظریات

1.4.1 سماجی نظریات

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں سماج کے اسلامی تصور اور معاشرتی زندگی کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاکہ ایک صحت مند اسلامی معاشرہ وجود میں آسکے اور شریعت اسلامی کے اجتماعی معاشرتی و تمدنی فوائد سے عملی طور پر لوگ مستفید ہو سکیں۔ اس تعلق سے شاہ صاحب نے معاشرہ کے ارتقائی مراحل بیان کئے ہیں جس کے لیے "ارتفاقات" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا معنیٰ ہوتا ہے

فائدہ اٹھانا۔ حالاں کہ سماج کے ارتقاء کا یہ نظریہ اس سے پہلے سماجیات کے بانی ابن خلدون نے پیش کیا تھا جسے مزید بہتر اور منطقی طور پر شاہ صاحب نے بیان کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ بقائے نسل اور تحفظ جان یہ دونوں خصوصیات انسان اور حیوان میں مشترک ہوتی ہیں اور انہیں دونوں ضرورتوں کے پیش نظر انسان حیوانات کے مقابلے میں اجتماعیت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ انسان اشتراک عمل اور آپسی تعاون کے ذریعہ چار تدریجی مراحل سے گزر کر متمدن اور مہذب بنتا ہے۔ ارتفاق اول میں ایک بدویانہ زندگی گزارنے والا سماج تشکیل پاتا ہے۔ ارتفاق دوم میں انسان بدویانہ زندگی سے نکل کر مہذب شہری زندگی کی طرف آگے بڑھتا ہے اور زندگی گزارنے کے آداب اور ضوابط کو اختیار کرتا ہے۔ تیسرا ارتفاق انسانی سماج کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ایک منظم ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ ارتفاق چہارم میں ریاست کے نظام کو چلانے اور اس کے مختلف شعبوں کو باہم متحد رکھنے کے لئے ایک حاکم اعلیٰ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے درمیان باہمی اشتراک کا عمل بحسن وخوبی جاری رہ سکے۔ اسی حاکم اعلیٰ کو شاہ صاحب امام یا خلیفہ کا نام دیتے ہیں۔

1.4.2 سیاسی نظریات

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی تصانیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العین فی تفضیل الشیخین میں خلافت راشدہ کا مقام اور خلفائے راشدین کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ خلیفہ ایک باعزت خاندان سے ہونا چاہیے تاکہ عوام اس کی اتباع کریں۔ اور حکمراں کو اسلام کی اشاعت، دفع اور جہاد کا جذبہ، شریعت و قانون کے نفاذ کی طاقت، احکامات جاری کرنے کی صلاحیت، اولوالعزمی، ذہانت اور دوراندیشی جیسی خوبیوں سے متصف ہونا چاہیے۔ سیاست کے میدان میں آپ کے وہ عملی اقدامات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو آپ نے مغلیہ حکومت کی زوال پزیر سلطنت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے اٹھائے تھے۔ انہوں نے ایک طرف حکمرانوں، وزیروں اور امراء کو خطوط لکھ کر ان کی کوتاہیوں، عیش پسندیوں اور غلط کاریوں کے انجام سے خبردار کیا اور دوسری جانب حکومت کے استحکام کے لئے نہایت مفید سیاسی وانتظامی مشورے دیئے۔

1.4.3 اصلاحی کوششیں

تصوف کی اصلاح

شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک طرف تصوف وسلوک کے فوائد وبرکات سے مستفید ہونے کے لئے لوگوں کو تصوف واحسان کے صحیح تصور اور اس کی روح سے روشناس کرایا۔ دوسری طرف تصوف کے نام پر رائج بدعت وخرافات اور گمراہ صوفیاء کے غیر اسلامی طریقۂ کار پر سخت تنقید کی اور عوام کو ان کی خرابیوں سے دور رہنے کی تلقین کی۔ حالاں کہ شاہ صاحب صحیح تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ خود نقشبندیہ سلسلے سے بیعت تھے اور تصوف کے دیگر جملہ سلاسل سے استفادہ کے قائل تھے۔ البتہ ان کا کہنا تھا کہ صوفیاء کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اہل تصوف کے اقوال واحوال کو شریعت کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یقیناً تزکیہ واحسان شریعت کی اطاعت کا ایک اہم جزء ہیں لیکن تصوف کے مقابلے میں شریعت کو اولیت حاصل ہے۔ اسلئے شعبدہ بازیوں اور کشف وکرامات کے چکر میں پڑنے کے بجائے قرآن وسنت کے مطابق شریعت مطہرہ کا سیدھا اور آسان راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

بدعت و خرافات کا خاتمہ

شاہ صاحب کے عہد میں بدعات اور بری رسموں کا دور دورہ تھا۔ ہر خاص و عام شریعت اسلامی کی اصل تعلیمات سے دور الحاد و بے دینی اور مذہبی گمراہی میں مبتلا تھا۔ علماء نے دنیاوی فائدوں کے حصول کے لئے بدعات و خرافات کی تبلیغ و تشہیر کر کے مسلمانوں کو کتاب و سنت سے دور کر دیا تھا۔ شاہ صاحب نے نہایت جرأت و حوصلہ مندی سے ان گمراہیوں پر تنقید کی اور ان کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں تفہیمات الالٰہیہ میں فرماتے ہیں:

"میں بخدا یہ کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے گمراہ اور گمراہ کن متصوفین کا گروہ اسلام میں خود رو گروہ ہے۔ اصل اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بدعات ایسے امور ہیں جنہیں لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد تحریف کر ڈالا اور انہیں کار ثواب سمجھ لیا یا ان کے عادی ہو گئے۔"

اسی طرح آپ نے یوم عاشورہ، شب برات، قبر پرستی اور معاشرہ میں رائج دوسری بری رسموں سے مسلمانوں کو بچنے کی تلقین کی۔

مختلف طبقات کی اصلاح

شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلمانوں کے انحطاط، حکومت کے زوال اور معاشرہ کے بگاڑ کے لئے سلاطین، امراء، فوجیوں، علماء، مشائخ، صوفیاء، واعظوں، صنعت کاروں اور عام مسلمانوں یعنی سبھی طبقوں کو ذمہ دار ٹھرایا اور ان میں سے ہر ایک سے علٰحیدہ علٰحیدہ خطاب کر کے انہیں ان کی کوتاہیوں اور برائیوں سے آگاہ کیا اور ان سے باز آنے کی نصیحت کی۔ سلاطین سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا:

"اے بادشاہو! اس زمانے میں ملاء اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کی تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو۔ اس کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔"

امراء و ارکان سلطنت کے نام ان کا پیغام تھا:

"اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ تم دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔"

فوجی سپاہیوں سے انہوں نے کہا:

"اے فوجیوں اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہو گی اور خدا کا حکم بلند ہو گا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے۔ لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے۔"

اہل صنعت و حرفت کو انہوں نے ہدایت کی:

"ارباب پیشہ !دیکھو!امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ حالاں کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لے قسم قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور حصول رزق کی غلط راہ اختیار کی۔ کیا تم جہنم کی عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا برا بچھونا ہے۔"

غلط کار علماء کو شاہ صاحب نے ہدایت کی:

"ارے بد عقلو! جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف و معانی و نحو میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے یاد رکھو!علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔"

واعظو اور زاہدوں کو انہوں نے یاد دلایا:

"اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کرو گے۔"

غرض یہ کہ شاہ ساحب نے مسلمانوں کے سبھی طبقات کو خطاب کر کے فرداًفرداًہر ایک کو ان کی کمیوں، کوتاہیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا اوران کے امراض کی تخصیص کر کے علاج کا نسخہ تجویز کیا۔ اس طرح آپ نے بحیثیت مجدد و مصلح اصلاح معاشرہ کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔

1.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بر صغیر ہند میں علوم کی ترویج و اشاعت اور مختلف میدانوں میں تجدیدی اور اصلاحی خدمات انجام دیں اس وجہ سے انہیں مجدد شمار کیا جاتا ہے۔
- آپ نے قرآن مجید کے تعلق سے بنیادی چیزوں کی وضاحت کی اور امت کو رجوع الی القرآن کی دعوت دی اور اس مقصد سے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ تاکہ لوگوں کے اندر قرآن فہمی کا شعور پیدا ہو اور عوام و خواص سب یکساں طور پر کتاب اللہ سے مستفید ہو سکیں۔
- شاہ صاحب نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں اس قدر گراں قدر خدمات انجام دیں کہ محدث ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اس سلسلے میں تعلیم و تدریس کے علاوہ قیمتی علمی سرمایہ تصنیف کیا۔ اور آپ نے حدیث کی جمع و تدوین کی تاریخ بتاتے ہوئے احادیث کی کتابوں کی صحت کے اعتبار سے درجہ بندی بھی کی۔ اس میں موطا امام مالک بن انس کو اول درجہ میں رکھا ہے۔

- آپ نے فقہ کی وضاحت کی اور فقہی مسائل میں آپسی اختلافات اور تعصب کے درمیان ایک اعتدال کی راہ نکالی اور اس میں ایسی تطبیق پیدا کی جو شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ انہوں نے عام لوگوں کے لیے تقلید کو ضروری قرار دیتے ہوئے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ اجتہاد کو جاری رکھنے پر زور دیا۔
- شاہ صاحب نے شریعت کے اسرار و رموز اور شرعی احکامات کی حکمتوں اور مصلحتوں کی وضاحت کی۔ اس تعلق سے انہوں نے اسلامی عقائد، عبادات اور اخلاقیات وغیرہ کی حکمت و مصلحت مدلل انداز میں بیان کی ہے۔
- آپ نے اسلام کے سیاسی و معاشرتی نظام کی تشریح و تعبیر کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سماجی اور سیاسی مسائل کا حل پیش کیا۔
- آپ نے ہندوستان میں زوال یافتہ مغلیہ سلطنت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لئے مسلم حکمرانوں کو سیاسی و انتظامی مشورے بھی دئے اور عملی اقدامات بھی کئے جس میں شاہ صاحب کا قائدانہ کردار نمایاں ہے۔
- آپ نے امت کے مختلف طبقات بادشاہ، حکمراں، فوجی سپاہیوں، مشائخ، علماء، صوفیاء، واعظوں، زاہدوں اور اہل صنعت و حرفت وغیرہ کو مخاطب بنا کر ان کو اپنا محاسبہ کرنے اور اصلاح و تبدیلی کی دعوت دی۔
- شاہ صاحب کے افکار و خیالات کی جتنی اہمیت اور ضرورت ان کے عہد میں تھی آج کے دور میں بھی ان کی اتنی ہی معنویت ہے۔

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں ارتفاقات کے کتنے مراحل بیان کئے ہیں؟

2.(a) 4.(b) 6.(c) 8.(d)

2. شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ماجد کا نام بتائے؟

(a). شیخ وجیہ الدین (b). مفتی شمس الدین (c). شاہ عبد الرحیم (d). شاہ عبد العزیز

3. شاہ ولی اللہ دہلوی کس مشہور مدرسہ میں درس دیتے تھے؟

(a). دارالعلوم دیوبند (b). جامعۃ الفلاح (c). ندوۃ العلماء (d). مدرسہ رحیمیہ

4. ان میں سے کون شاہ ولی اللہ کے فرزند نہیں ہیں؟

(a). شاہ عبد السلام (b). شاہ عبد العزیز (c). شاہ رفیع الدین (d). شاہ عبد القادر

5. شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کا ترجمہ کس زبان میں کیا؟

(a).ہندی (b).اردو (c).انگریزی (d).فارسی

6. شاہ ولی اللہ دہلوی کہاں پیدا ہوئے؟

(a).دہلی (b).لکھنو (c).مظفر نگر (d).حیدرآباد

7. شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان میں سے کس حدیث کی کتاب کی شرح لکھیں؟

(a).مشکوٰۃ المصابیح (b).موطا امام مالک (c).ترمذی شریف (d).ریاض الصالحین

8. "التفہیمات الٰہیہ" کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a).شبلی نعمانی (b).امام غزالی (c).شاہ ولی اللہ (d).ابوالکلام آزاد

9. شاہ ولی اللہ دہلوی کا تعلق کس فقہی مسلک سے تھا؟

(a).مالکی (b).حنفی (c).شافعی (d).حنبلی

10. شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب الفوز الکبیر کس موضوع سے متعلق ہے؟

(a).قرآن (b).حدیث (c).فقہ (d).تصوف

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. قرآن مجید کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی خدمات بیان کیجیے۔
2. فقہ اور فقہی مسالک میں تطبیق کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔
3. شاہ ولی اللہ کے سماجی نظریات کی وضاحت کیجیے۔
4. شاہ ولی اللہ کی حیات کا تعارف پیش کیجیے۔
5. تصوف کے تعلق سے شاہ ولی اللہ کے خیالات پر روشنی ڈالیے۔

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شاہ ولی اللہ دہلوی کی تدریسی، علمی اور تصنیفی خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. علم حدیث میں شاہ ولی اللہ کی خدمات بیان کیجیے۔
3. امت مسلمہ کے مختلف طبقات کی اصلاح میں شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔

1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	تاریخ دعوت وعزیمت	:	مولانا ابوالحسن علی ندوی
.2	تذکرہ شاہ ولی اللہ	:	مولانا سید مناظر احسن گیلانی
.3	شاہ ولی اللہ دہلوی	:	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
.4	شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اقتصادی نظریات	:	ڈاکٹر محمد دین
.5	شاہ ولی اللہ حیات وافکار	:	پروفیسر ظفر احمد نظامی

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 2: مشہور مفکرین: شبلی نعمانی، محمد اقبال

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 شبلی نعمانی

2.2.1 تعلیم و تربیت

2.2.2 علامہ شبلی کی علمی خدمات

2.2.3 علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات

2.2.4 علامہ شبلی کے سیاسی افکار

2.3 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

2.3.1 پیدائش اور ابتدائی تعلیم

2.3.2 علامہ محمد اقبال کی اعلیٰ تعلیم

2.3.3 یورپ سے واپسی اور ذمہ داریاں

2.3.4 علامہ اقبال اور اسلامی فکر

2.3.5 علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

2.0 تمہید

ہندوستان میں مسلم مفکرین کا امت مسلمہ کی رہنمائی میں ہمیشہ سے اہم کردار رہا ہے، چاہے وہ سیاسی نقطۂ نظر کے حامل ہو یا پھر دینی و سماجی۔ دینی رجحانات کو عوام میں عام کرنے میں صوفیاء کا نمایا کردار ہے، علماء دین و مفکرین میں شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خان، مولانا اشرف علی تھانوی، احمد رضا خان، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابو الکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ کے نام شامل ہیں، جنہوں نے اپنی دینی و سماجی اور سیاسی بصیرت کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کی ہر میدان میں رہنمائی کی اور انہیں ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کرایا اور مستقبل کے لئے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان شخصیات میں سے علامہ شبلی نعمانی اور ڈاکٹر محمد اقبال کی سوانح و ان کی علمی خدمات اور افکار و نظریات پر گفتگو ہو گی۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہندوستانی مفکرین و مصلحین کی علمی، سماجی، سیاسی اور دینی خدمات سے طلبہ کو متعارف کرانا نیز ان کے افکار و نظریات نے ان کے ہم عصروں اور عوام پر کیا اثرات مرتب کئے اس کی نشاندہی ہو جائے۔ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ کو اس اکائی میں لکھی گئی مایہ ناز شخصیات علامہ شبلی نعمانی اور علامہ محمد اقبال کی علمی کاوشوں، تعلیمی نظریات، سماجی نظریات، سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ ان کے اہم و غیر معمولی افکار سے واقفیت ہو گی۔

2.2 شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی ہندوستان کی مایہ ناز علمی شخصیات میں سے ایک ہیں، آپ اردو ادب میں ناقد، شارح، مورخ، سوانح نگار، سیرت نگار اور انشاپرداز کی حیثیت سے مسلم اور لاثانی ہے، اس کے علاوہ آپ اپنے وقت کے بڑے مفکر شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی اسلامی فکر نے 19 ویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر ایک انقلاب بپا کر دیا، آپ نے عوام کے اندر اسلام کی صحیح فکر پیدا کی اور انہیں اپنے نصب العین کو پہچاننے میں مدد کی، نیز مغربی فلسفیانہ نظریات کے شکنجہ سے نہ صرف عوام بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ کو بے نیاز ہونے میں مدد کی۔

2.2.1 تعلیم و تربیت

علامہ شبلی نعمانی 1857ء کو موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے نامور وکیل تھے۔ لوگوں کی فلاح و بہبود میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے، تصوف سے بھی خاصہ لگاؤ تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنے بچوں کے نام شبلی و جنید رکھے اور انہیں دینی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ دستور زمانہ کے مطابق علامہ شبلی نے قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم

گاؤں ہی میں حاصل کی، پھر مولوی عبداللہ جیراج پوری سے علمی استفادہ کیا، اسی زمانہ میں اعظم گڈھ شہر میں مدرسہ عربیہ قائم ہوا تو آپ اس میں داخل ہوئے، جہاں مولانا فاروق چریاکوٹی جیسے جید عالم طلباء کو درس دیتے تھے۔ چنانچہ اسی مدرسہ سے علامہ شبلی نے اپنی دینی تعلیم مکمل کی، پھر مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کی، مثلاً فقہ، ادب اور حدیث کا علم بتدریج مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے حاصل کیا۔(حیات شبلی، ص:22تا23 / دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی)

آپ کے والد شیخ حبیب اللہ علی گڈھ تحریک کے ابتدائی ہم نوالوگوں میں سے تھے۔ سرسید نے جب اعظم گڈھ کا سفر کیا تو آپ ان کے ساتھ رہے، کالج کی مالی معاونت کی، بعض عمارتوں کی تعمیر میں بھی آپ نے حصہ لیا، سرسید نے پٹریاٹک سوسائٹی قائم کی تو آپ کو اعظم گڈھ کا کرس پانڈنگ رکن مقرر کیا گیا۔ اسی تعلق کی بناپر شیخ حبیب اللہ نے اپنے تمام بچوں، بھتیجوں اور قرب وجوار کے طلبہ کو علی گڈھ میں داخلہ دلایا، 1882ء میں شیخ حبیب اللہ بچوں سے ملنے علی گڈھ گئے تو شبلی کو بھی ساتھ لے گئے، جب شبلی علی گڈھ آئے تو سرسید کے لئے عربی میں قصیدہ پیش کیا، جسے سرسید نے بہت پسند کیا، اس قصیدہ میں شبلی نے سرسید کے لئے جن تاثرات کا اظہار کیا وہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

2.2.2 علامہ شبلی کی علمی خدمات

جب 1883ء میں علی گڈھ کالج میں فارسی کی جگہ نکلی تو شبلی نعمانی اپنے استاذ مولانا فیض الحسن سہارن پوری کی سفارش پر اس عہدے پر مقرر ہوئے۔ قیام علی گڈھ کے دوران سرسید کے کتب خانہ، سرسید کی صحبت اور پروفیسر آرنلڈ سے تبادلۂ خیالات نے آپ کے ذوق ونظر کی دنیاہی بدل دی، اس وقت کالج نئے علوم وافکار بلکہ جدید دنیا کا ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں آکر شبلی کے خیالات اور فکر میں تبدیلی رونماہوئی اور انہیں اسلام اور شعائر اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا علم ہوا، نیز انہیں اسلام کی صحیح سمت میں خدمت کرنے کا موقع ملا، چنانچہ انہوں نے ایک رسالہ "کتب خانہ اسکندریہ" لکھا جس میں انہوں نے کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی وبربادی اور مسلمانوں کی علم دشمنی جیسے بڑے الزامات کا بہت ہی مدلل اور محققانہ جواب دیا اور ثابت کیا کہ یہ محض الزام تراشی ہے، کتب خانہ اسکندریہ خود عیسائیوں نے جلایا اور اس کے جلانے میں ان کے مذہبی رہنما شریک تھے۔ اس مقالہ نے پڑھے لکھے طبقے کو بے حد متاثر کیا اور اس نے مغربی اہل قلم کو اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دیا، اس کے بعد "الجزیہ" اور "حقوق الذمیین" کے عنوان سے دو مقالے لکھے جو اسی نوع کی تحقیقات کے نمونے ہیں، سرسید نے "الجزیہ" کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کرایا۔

علی گڈھ کے دوران قیام میں آپ نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک اور مقالہ لکھا جس میں آپ نے مسلمانوں کے علمی تمدن اور علوم وفنون میں ان کی خدمات کا بھرپور تعارف کرایا۔ اس کے بعد 1887ء میں خلیفہ مامون کی سوانح حیات پر "تاریخ المامون" لکھی، آپ کی یہ تصنیف بھی بے حد مقبول ہوئی 1889ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سرسید کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے بعد شبلی نے "سیرۃ النعمان" لکھی، آپ کی یہ تحقیقات جہاں صحبت سرسید کے زیر اثر پیدا ہونے والے نئے نظریات وافکار کا پتہ دیتی ہیں تو وہیں

آپ کے گہرے مطالعہ اور روایتی مذہبی تحقیقات کے گہرے مشاہدہ سے بھی واقف کراتی ہیں۔

سیرت النعمان کے بعد آپ نے حضرت عمر فاروق کی حیات و خدمات پر "الفاروق" کے عنوان سے کتاب لکھنی شروع کر دی، لیکن سر سید شیعہ سنی تفرقہ کے خوف سے الفاروق کے حق میں نہ تھے، باوجود اس کے شبلی نے اسے لکھا لیکن اس کتاب کو سر سید کی وفات کے بعد 1899ء میں شائع کرایا، دراصل یہ کتاب تاریخ کے فن کی بہترین کتاب ہے۔ تاریخ کے فن میں مسلم مورخین نے جو جدت پیدا کی اور اس کی جتنی افزائش کی اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت ڈاکٹر اسپرنگ کی تحریر "اصابہ" کے دیباچہ میں ملتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ (سیرۃ النبی (فٹ نوٹ) ص:28

شبلی نعمانی نے تحقیق و تاریخ نگاری کی اعلیٰ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے الفاروق جیسی بیش قیمتی کتاب لکھ کر علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ علامہ شبلی نے جب 1894ء میں مصر و شام، لبنا و فلسطین، روم اور ترکی کا سفر کیا تو اس سفر کے کئی مقاصد تھے (1) اسلامی تاریخ کی آثار قدیمہ کا مطالعہ و مشاہدہ (2) اسلامی ممالک کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کا مطالعہ (3) الفاروق جس کی تصنیف کے لئے ہندوستان کے کتب خانے ناکافی تھے، مواد حاصل کرنا وغیرہ۔ چنانچہ شبلی نے اس سفر میں ان تمام امور کا گہرائی سے مطالعہ کیا، قسطنطنیہ، بیروت، فلسطین اور خاص طور پر مصر کے مدارس اور کالجوں کا معائنہ کیا، جامع ازہر کو قریب سے پرکھا، قدیم و جدید تعلیم کے تقریباً تمام اداروں کے معائنہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ وہاں بھی تعلیم کے طریقۂ اور نہج میں فقدان ہے۔ اس سفر میں انہوں نے خاص طور پر کتب خانوں کی سیر کی، کتابوں کا مطالعہ کیا، نوٹ لیے اور نقل نویسوں سے کتابیں نقل کرائیں، قسطنطنیہ میں شاید ہی کوئی کتب خانہ ہو جسکی آپ نے سیر نہ کی ہو۔

اس سفر میں آپ کو متعدد نامور شخصیات سے بھی ملنے کا موقع ملا جیسے جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور غازی عثمان پاشا وغیرہ۔ ان ملاقاتوں نے علامہ شبلی کو ان مفکرین کے افکار و نظریات کو سمجھنے اور اسلامی مبادیات میں غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کیا نیز خلیفہ سلطان عبدالحمید سے بھی ملاقات کی اور انہوں نے علامہ شبلی کو تمغہ مجیدیہ سے سرفراز کیا۔

علامہ شبلی جب تک علی گڈھ میں رہے انہیں مستقل خرابی صحت کی شکایت رہتی تھی، اس لئے آپ نے سر سید سے خواہش ظاہر کی کہ انہیں چھ ماہ کی رُخصت دی جائے، تاکہ وہ چھ ماہ کالج میں رہ کر تعلیم و تدریس کا کام کریں اور چھ ماہ کہیں اور قیام کر کے تصنیف و تالیف کا کام کریں سر سید نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی۔ مگر ابھی اس پر عمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سر سید نے 27/مارچ 1898ء کو سفر آخرت اختیار کیا، شبلی کو اس کا بڑا صدمہ پہونچا اور انہوں نے علی گڈھ کی ملازمت سے اسی سال استعفیٰ دے دیا۔

استعفیٰ کے بعد شبلی علی گڈھ سے اعظم گڈھ آئے، اسی زمانہ میں ان کے والد شیخ حبیب اللہ بیمار ہوئے اور 12/اگست 1900ء کو وفات پائی، والد کی بچی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے حیدرآباد کا رُخ کیا اور 1901ء میں ناظم سررشتہ علوم وفنون

حیدرآباد کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ نے یہاں الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم اور الغزالی جیسی تحقیقی کتابیں تصنیف کیں، چند ماہ قیام کے بعد حیدرآباد کے اندرونی سیاسی حالات نے آپ کو دل برداشتہ کر دیا لہٰذا آپ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور وظیفہ جاری کرنے کی درخواست کی، دونوں منظور ہوئے اور اب آپ نے بقیہ زندگی ندوۃ العلماء کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ آگئے اور بقیہ زندگی وہیں گزار دی۔

ندوۃ العلماء اور علامہ شبلی

علامہ شبلی تحریک ندوہ کے ابتدائی فعال لوگوں میں سے ایک تھے، آپ اکثر اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے، قرار دادیں پیش کرتے، تعلیم، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم پر بحث کرتے، سچ تو یہ ہے کہ قدیم علوم پر آپ کی جتنی گہری نظر تھی، شاید ہی تحریک ندوہ میں کسی اور کی رہی ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ندوہ کا دستور بنایا اور اس کے اغراض و مقاصد طے کئے۔ دارالعلوم کا نصاب تعلیم بھی آپ ہی نے تیار کیا تھا، اسی سے متاثر ہو کر آپ کو 1904ء میں ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم مقرر کیا گیا، چنانچہ آپ نے اپنی تمام صلاحیتیں اس پر صرف کر دیں۔

علامہ شبلی تقریباً نو سالوں تک ندوۃ العلماء سے وابستہ رہے، آپ نے تحریک وقف علی الاولاد اسی زمانہ میں شروع کی، ندوہ کے اجلاس میں اس کو منظور کرایا، ملک کے تمام وکلاء اور قانون دانوں سے رابطہ کیا، جن میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی ہے۔ بالآخر وہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی دستخطی مہم چلائی، نتیجتاً پارلیمنٹ میں اسے بل کی شکل میں پیش کیا، اور حکومت نے قانون بنانا منظور کیا۔ اسی زمانہ میں شدھی تحریک نے زور پکڑا اور ارتداد کی لہر اٹھی تو آپ نے جی توڑ کوششیں کی، خود شاہ جہاں پور کا دورہ کیا، راجپوتانہ اس تحریک کا مرکز تھا جہاں آپ نے اپنی فراست سے محافظین اسلام کی ایک جماعت ارسال کی اور اس تحریک کے انسداد کے لئے اصول وضوابط بنائے۔ ان تمام مصروفیات کے ساتھ ماہنامہ "الندوہ" کی ادارت کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ آپ طلبائے ندوہ کی تربیت اور تحریری صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اسی رسالہ کا انتخاب کیا، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، عبداللہ عمادی وغیرہ اسی رسالہ کے ذریعہ آسمان علم وادب پر اہل قلم کی حیثیت سے چمکے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی چند ماہ "الندوہ" کے نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اور شبلی کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

آپ نے قیام ندوۃ العلماء کے دوران پہلے موازنہ انیس و دبیر پھر شعر العجم کی چار جلدیں تحریر کیں، شعر العجم ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ کے علمی ذوق نے دربار رسالت ﷺ میں دستک دی اور آپ نے نبی کریم ﷺ کی سیرت لکھنے کو ہر کام پر فوقیت دیتے ہوئے فرمایا کہ "اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی" کے مصداق کام کا آغاز کیا اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے نام ایک ایسی کتاب کا تحفہ دنیاء کو دیا جس کا محققانہ طرز، زبان و بیان کی ندرت، بنیادی مآخذ کا بر محل استعمال یہ وہ خصوصیات ہیں جس نے اس کتاب کو لازوال شہرت عطاء کی اور اردو زبان میں سیرت پر لکھی گئی تمام کتب میں امہات کتب کی حیثیت سے مسلم ہے، نیز اسی کتاب پر آپ کے قلم کی سیاہی خشک ہوئی،

آپ کی صحت پہلے سے خراب تھی، نیز اسی زمانہ میں آپ کے بھائی محمد ایڈوکیٹ نے یکایک جوانی میں انتقال فرمایا جس سے آپ بہت دل برداشتہ ہوئے۔

شبلی اعظم گڈھ میں

آپ 1913ء میں ندوۃ العلماء سے مستعفی ہو کر اعظم گڈھ آئے تو یہاں بھی زیادہ دل نہ لگا چنانچہ آپ نے شہر اعظم گڈھ کے قلب میں واقع اپنے باغ اور بنگلے کی زمین پر دار المصنفین کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھنے کا خاکہ پیش کیا، جس میں علماء و اسکالرز کی ایک جماعت اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی عالمی تاریخ سے لیکر ہندوستانی تاریخ کے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کریں۔ چنانچہ آپ نے اس امر کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے مہمان خانہ تعمیر کرایا تاکہ باہر سے آنے والے مہمانوں کو پریشانیوں سے دوشار نہ ہونا پڑے، پھر طلبہ کو بلایا، اور ابھی اس کے مالی انتظامات کی فکر میں ہی تھے کہ اس دار فانی سے کوچ کرنے کا وقت آپہنچا اور سیرت النبیؐ سیرت النبیؐ کہتے اس دار فانی سے 18/ نومبر 1914ء کو کوچ کر گئے، پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی، بیگم سلطان جہاں فرماں روائے بھوپال نے ایک فقرہ کہا کہ **"فقیر بے نوا چل بسا اور اب سلطان کی باری ہے"۔**

علامہ شبلی کی تصنیفات

علامہ شبلی نے علوم اسلامی و اردو ادب میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سیرت النبیؐ، سیرت النعمان، الفاروق، المامون، الغزالی، امام ابن تیمیہ، سوانح مولانا روم، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، الکلام، علم الکلام، سفر نامہ روم مصر و شام، مقالات شبلی، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر وغیرہ شامل ہیں۔

2.2.3 علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات

علامہ شبلی دینی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عالم، مایہ ناز محقق، بے مثل مؤدب، اور تجربہ کار مفکر تھے۔ اسی لئے آپ مسلمانوں کی علمی اور فنی صلاحیتوں میں ترقی کے لیے فکر مند رہتے تھے، آپ مسلمانوں کے لئے دینی و دنیوی دونوں طرز تعلیم کو حد سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے کیوں کہ آپ کے نزدیک تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت و رفعت کا بہترین ذریعہ بن سکتا تھا۔ نیز یہی وہ واحد راستہ تھا جس سے لوگوں کے عادات و خصائل میں تبدیلی لائی جاسکتی تھی اور ان کے مراتب میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ علامہ شبلی اپنے ہم عصر مسلمانوں کے تعلیمی فقدان پر افسوس و ملال کرتے تھے، انہوں نے اپنے ایک مضمون، "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے کارناموں کی یاد دہانی کرائی کہ انہوں نے علم کی ترقی اور اشاعت علم کا کیسا عظیم کارنامہ انجام دیا، کیا کیا علوم ایجاد کیے اور ان کو کہاں تک پہنچایا۔

علامہ شبلی قدیم تعلیمی انداز کو پسند کرتے تھے اور اسی انداز کو عربی مدارس میں رواج دینا چاہتے تھے، ان کو ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ طلبہ مدارس میں تجدیدی صلاحیت پیدا ہو، مگر ساتھ ہی وہ جدید طرز تعلیم کے علمبردار بھی تھے، انہوں نے "تعلیم قدیم و جدید" کے

عنوان سے ایک مقالہ مرتب کیا، اس مقالہ میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کے اس نظریہ کی تردید کی کہ قدیم طرز تعلیم مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی تعلیم کی ایک شاخ قائم ہوئی اور الہ آباد یونیورسٹی میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولنے کا ارادہ تھا مگر اس بناپر اس کی مخالفت کی جانے لگی کہ اس سے مسلمانوں کے لیے مغربی تعلیم کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خان نے بھی کئی پرزور اخباری مضامین لکھے اور واضح کیا کہ مشرقی تعلیم مغربی تعلیم کی ترقی کو روک دے گی، جو ملک اور مسلمانوں کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف علامہ شبلی نے کہا"اگر ہم کو یہ یقین ہو کہ مشرقی تعلیم سے مغربی تعلیم میں ذرہ برابر بھی کمی ہوگی، تو اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار ہمارا فرض ہے"۔ اپنے اس نظریہ کو مدلل بناتے ہوئے وہ ترقی یافتہ قوموں کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یوروپ سب کچھ کر رہا ہے تاہم ان میں ایک وسیع گروہ موجود ہے، جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے۔ آریہ انگریزی تعلیم میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں اور گروکل بھی قائم کر رہے ہیں۔ کیا اس ادارے نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے"؟(مقالات شبلی، ج3، ص:146-147)

علامہ شبلی قدیم تعلیم کی اہمیت وضرورت کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قائل تھے کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان و انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یوروپ کے مصنفین مذہب پر جو حملہ بول رہے ہیں، اگر اس سے واقفیت نہ ہوئی، تو انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کی اشاعت رک نہیں سکتی ان کا جواب دینا علماء کا فرض ہے۔ علمائے سلف نے بھی تو یونانیوں کا فلسفہ سیکھ کر ان کے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔(ایضا، ج3 ص:142)

علامہ شبلی جدید تعلیم کی تحصیل مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیتے تھے، مگر اس میں ایسا انہماک پسند نہیں کرتے تھے، جو مسلمانوں کو دینی تعلیم سے غافل اور اپنی تاریخ وتہذیب سے بے گانہ کر دے، اس لیے انہوں نے اسکول اور کالجز کے کلاسوں کا ایک نصاب مرتب کیا تھا جن میں تین طرح کی کتابیں ہوں(1) عقائد، فقہ، تاریخ اسلام، (2) اسکول میں صرف، فقہ، تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو۔(3) کالج میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کی چیدہ تصنیفات خود عربی زبان میں پڑھائی جائیں اور سب کی ضخامت 100-200 سے زیادہ صفحات نہ ہو، نیز ان کی رائے یہ بھی تھی کہ دینیات کے نتائج امتحانات کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے اور دو چار طلبہ کو گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلی درجہ کی تعلیم دلائی جائے۔

نصاب سے متعلق علامہ شبلی کی جن اصلاحوں کو مدارس کے ذمہ داران نے اس وقت ماننے سے انکار کر دیا تھا ایک صدی بعد ان کے جانشین انہیں چیزوں کو دوبارہ نصاب میں شامل کرنے پر مجبور ہیں۔ علامہ شبلی کے علمی کمالات کا ایک اور روشن پہلو ندوۃ العلماء میں ان کی تعلیمی سرگرمیاں اور نصاب تعلیم میں کی گئیں وہ اصلاحات ہیں کہ جن کو اگر ندوۃ العلماء کے نصاب میں شامل رہنے دیا جاتا تو مدارس اسلامیہ اس علمی کمی کے احساس سے دوچار نہیں ہوتے جن کا ذکر اب ہر طرف کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے ندوۃ کے نصاب میں انگریزی زبان، بھاکا اور جدید سائنس کا اضافہ کیا تھا، نیز علامہ شبلی نے کتاب کے بجائے فن کی تعلیم پر زور دیا تھا۔ علامہ شبلی کی یہ ساری کوششیں جب ہی بارآور ہوئیں جب آپ 1905ء سے 1913ء تک ندوۃ کے معتمد تعلیم رہے تاریخ میں یہ زمانہ ندوہ کی تعلیمی ترقی اور

شبلی کے علمی کمالات کا نہایت روشن باب قرار دیا جاتا ہے۔

برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں اور مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں سے شبلی نعمانی سے زیادہ کون واقف ہو سکتا تھا۔ ان گمراہیوں کے تدارک اور مستقبل کی پیش بندی کے لیے ہی انہوں نے انگریزی زبان کی تعلیم پر زیادہ زور دیا۔ سنسکرت اور بھاکا کی تعلیم اس لیے ضروری تھی کہ ہم اپنے برادران وطن کو سمجھ سکیں، ان کے مذہب اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے واقف ہو سکیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے سنسکرت جاننا ضروری تھا۔ داعیان اسلام کے لیے تو یہ اور ضروری تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر شبلی مدارس کو حفاظت واشاعت اسلام کا مرکز سمجھتے تھے۔

شبلی کے سامنے آریائی سماج کے مناظرے تھے۔ شبلی سے پہلے کے اکابرین ملت اور خود شبلی نے جس طرح ان مناظروں میں سرگرم حصہ لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہیں مناظروں کی بدولت شبلی نے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی کہ برادران وطن کے مذاہب اور ان کے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کو سمجھا جائے، جس کے لیے ان کی زبان جاننا ضروری تھا۔ اگر شبلی کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب ہو جاتی تو عین ممکن تھا کہ ہندستان جیسے کثیر مذہبی اور لسانی ملک میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔ مناظرے، مکالمے کی شکل اختیار کر لیتے اور قرین قیاس تھا کہ اخوت و یگانگت کی ایک فضا قائم ہوتی۔ یہی وہ عوامل تھے جس کی وجہ سے شبلی نے بھاکا اور سنسکرت کی تعلیم پر زیادہ اصرار کیا۔

علامہ شبلی کے سوانح نگار سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی فکر کو "انقلابی فکر" سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شبلی کے معاصر علما غور و فکر اور مجتہدانہ فکر و بصیرت کے اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ شبلی کی انقلابی فکر اور عملی کوششوں نے انہیں ہم عصر علماء سے ممتاز رکھا۔ جدید و قدیم دونوں تعلیمی سلسلوں کے نزدیک شبلی روشن خیال مولوی قرار پائے۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ شبلی نئے طرز تعلیم کو پسند کرتے تھے مگر قدیم تعلیم کے سخت حامی تھے، ان کے نزدیک جدید و قدیم دونوں کی اہمیت مسلم تھی۔ آپ نہ تو تنگ نظر تھے کہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثوں کو بھول جائیں اور نہ اتنے قدامت پسند کہ علم و ادب کے تازہ جھونکوں کا استقبال نہ کر سکیں۔ کیوں کہ ان کا یہ ماننا تھا کہ دور جدید میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل نکل سکتا تھا ہے اور نہ صرف جدید تعلیم ہی ان کے دکھ اور درد کی دوا بن سکتی تھی، بلکہ آپ کو ان دونوں کے مجموعے اور آمیزش ہی میں مسلمانوں کے مسائل اور پریشانیوں کا علاج دکھتا تھا، جیسا کہ آپنے فرمایا:

"ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی؛ ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے"۔ (ایضا، ج3، ص:157)

2.2.4 علامہ شبلی کے سیاسی افکار

علامہ شبلی کا شمار جدید ہندوستان کی ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے۔ علامہ کی علمی و فکری خدمات پر متعدد تحقیقی کام ملتے ہیں، لیکن علامہ شبلی کی مسلمانوں کے تئیں سیاسی بیداری اور مسلم لیگ کی بنیادی خاکہ کی تشکیل نو میں ان کے غیر معمولی کردار کو محققین نے زیادہ

توجہ نہیں دی اور ان کے سیاسی افکار پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اگرچہ علامہ شبلی کبھی کسی سیاسی تنظیم سے نہیں جڑے لیکن ان کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی نظریات نے مسلم دانشوروں، سیاسی لیڈروں اور عوام کی ہر میدان میں رہنمائی کی۔ اس سلسلہ میں 1886ء میں علامہ شبلی نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اپنی مشہور اردو نظم "صبح امید" پیش کی جس میں مسلمانوں کو آنے والے سیاسی حالات سے آگاہ کرانے کے ساتھ مسلم لیگ کی غلط پالیسیوں پر تنقید اور قوم پرست نظریات کی حمایت کو پیش کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انڈین نیشنل کانگریس منصہ شہود پر آئی اور شبلی اس کے ملی اور قوم پرست نظریات کی حامی رہے۔ باوجود اس کے کہ شبلی کبھی کانگریس کے اجلاسوں میں شامل نہیں ہوئے، ہاں وہ بس اس کے مقاصد کے حامی تھے۔ علامہ شبلی نے اپنی اس بات کی وضاحت شاکر میر ٹھی کو لکھے ایک خط میں اس طرح کی ہے: "میں اپنی رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، میں نے سرسید کے ساتھ سولہ سال گزارے لیکن سیاسی معاملات میں میں نے مسلسل ان سے اختلاف کیا اور کانگریس کی حمایت جاری رکھی"۔ (حیات شبلی، سلیمان ندوی، 1999، ص 297، 610) یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے قوم پرستانہ نظریہ کی بنیاد کانگریس کے قیام سے پہلے ہی رکھی تھی۔ لیکن وہ مسلم لیگ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے نقطہ نظر اور کانگریس کے تئیں ان کی سرد مہری پر افسوس کا اظہار کرتے تھے۔ قیام لکھنؤ کے دوران علامہ شبلی نے مسلمانوں اور ہندوستان کی سیاسی اتھل پتھل پر بے باک انداز میں اپنی رائے دی، اس مقصد کے لئے انہوں نے 1912ء میں سید میر جان کو مسلم گزٹ نامی اخبار شائع کرنے پر آمادہ کرلیا، جس میں مسلمانوں کی ملی مسائل اور ہندوستان کی سیاست میں ان کی بسات کو قبول کرنے کی طرف اشارے کیے گیے۔ علامہ موصوف نے گمنام رہ کر بے شمار مضامین اور کالم لکھے، جن میں تقسیم بنگال، جنگ بلقان، مسلم یونیورسٹی کا مطالبہ، کانپور مسجد کا سانحہ اور مسلم لیگ کی اصلاح وغیرہ اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا۔

اسی اخبار میں علامہ شبلی نے "ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست" کے عنوان سے ایک اہم مضمون لکھا جس سے مسلم لیگ کے کارکنان میں بھگدڑ مچ گئی اور جس مضمون نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ دیپوٹیشن سے موڑ کر امت مسلمہ کی سیاست کی طرف کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ کہا جانے لگا کہ اگر سارے مسلمان کانگریس میں شامل ہو جائیں تو مسلم لیگ کا کیا ہو گا وہ اپنی شناخت کھو بیٹھیں گی، علامہ شبلی نے اس رائے کو بلکلیہ مسترد کرتے ہوئے فرمایا کہ 19 ملین ہندوؤں اور 05 ملین مسلمانوں کے درمیان ایک لاکھ پارسی اپنی شناخت کیسے باقی رکھ سکتے ہیں؟ ویسے ہی ہم بھی رہیں گے۔ اسی ضمن کے ایک دوسرے مضمون "مسلمانوں کی سیاسی کروٹ" میں مسلم لیگ پر سخت تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "ایک ہزار سال بعد بھی مسلم لیگ ایک حقیقی سیاسی جماعت نہیں بن سکتی"۔ علامہ شبلی مسلمانوں کے علیحدہ مطالبات کے حق میں نہ تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر حکومت ہند کے لئے کوشش کریں۔ کیونکہ علامہ شبلی قومی مفاد پر مبنی سیاست کے خوگر تھے، اس لئے انہیں قربانی اور بے غرضی کے سواء کچھ نہیں چاہیے تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اس کا موازنہ مذہب سے کرتے ہیں۔ علامہ شبلی جیسی شخصیت کا سیاست کا مذہب سے موازنہ کرنا بڑی اہمیت کی حامل بات ہے، شبلی کی نظر میں سیاست بھی مذہب کی طرح خالص ہونی چاہیے۔

ان تمام نکتہ چینی کے باوجود علامہ شبلی حقیقت پسند شخصیت کے مالک تھے۔ مسلم لیگ سے اختلاف کے باوجود وہ اس کی بقاء اور

اصلاح کی کوشش کرتے رہے کیونکہ وہ اس کو سیاسی زندگی کی ایک مکمل حقیقت سمجھتے تھے کہ کانگریس کی طرح ایک اور سیاسی جماعت عوام کے لئے فلاح و بہبود اور اصلاح کا کام کرتی رہے۔ انہوں نے لیگ کے ارکان سے سفارش کی کہ انہیں کانگریس کی تمام تجاویز کو اپنے پروگراموں میں شامل کرنا چاہیئے اور ہندو اعتدال پسند گروپ کی طرح قانونی طور پر ان کے لئے لڑنا چاہیے۔

شبلی کی جانب سے لیگ کی پالیسیوں کی مذمت کا مسلم لیگ پر مثبت اثر پڑا۔ شبلی کی تحریروں کے دو اثرات تھے ایک یہ کہ مسلم لیگ کو برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ شبلی کی تنقید کے بوجھ تلے اپنی سیاسی تبدیلی کے بعد مسلم لیگ مسلم عوام کے ساتھ بہتر تعلق قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ عام مسلم عوام کے علاوہ شبلی کی پرجوش تنقید اور درخواستوں نے بہت سے دانشوران کو متاثر کیا۔ ان کی رہنمائی میں مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی اور ظفر علی خان جیسے بہت سے تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں نے ہندوستانی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ شبلی کے جانشین سید سلیمان ندوی کا ہندوستان کی مسلم سیاست پر کافی اثر و رسوخ رہا۔ فطری طور پر شبلی جرات مند، جمہوری، سامراج مخالف اور اسلام پسند تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں یہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ تاریخ، خلافت اور عباسیوں کے عہد میں مسلمانوں کی علمی وساست اور مسلمانوں کی عظمت کا تصور رکھتے تھے۔

2.3 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

علامہ محمد اقبال (ولادت: 9 نومبر 1877ء–وفات: 21 اپریل 1938ء) بیسویں صدی کے ایک عظیم فلاسفر، مفکر، قانون داں، سیاست داں، مصلح اور ایک عظیم شاعر گزرے ہیں۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے اور یہی ان کی بنیادی وجہ شہرت ہے۔ شاعری میں بنیادی رجحان تصوف اور احیائے امت اسلام کی طرف تھا۔

علامہ محمد اقبال کی پیدائش سے پہلے ان کے والد شیخ نور محمد نے ایک خواب دیکھا تھا جس نے اقبال کی زندگی اور امت مسلمہ کے مستقبل کے لیے ان کے نظریات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ نور محمد نے خواب میں دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں روشنی چمک رہی ہے۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک سفید فاختہ آسمان پر اڑ رہا تھا، کبھی وہ اتنا نیچے اترتا اور کبھی اس قدر بلندی پر چڑھ جاتا ہے کہ آسمان میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ستارے میں تبدیل ہو جاتا ہے، کچھ دیر بعد وہ پرندہ اچانک غوطہ لگا کر میری گود میں آگرا اور قوس قزح بنی اور آسمان سے زمین تک پھیل گئی۔ یہ خواب دیکھ کر جب شیخ نور محمد بیدار ہوئے تو ان کا دل اس یقین سے بھر گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایک فرزند عطا کرے گا جو دین اسلام کو بہت عزت بخشے گا۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری، فلسفیانہ تحریروں اور فعالیت کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی نیند سے بیدار کرنا، انہیں دنیاوی مشاغل سے اوپر اٹھ کر روحانی بلندی اور فکری سربلندی کے لیے جدوجہد کرنے پر زور دیا۔ خودشناسی، ایمان اور اتحاد کا ان کا نظریہ ان کے والد کے خواب کی سچی تعبیر تھی، جس نے مسلم کمیونٹی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اقبال کے مشن کو تقویت دی۔ انہوں نے خدائی تقدیر

پر اس کے یقین اور اس کو عطا کردہ مشن کو پورا کرنے کے عزم کو تقویت دی۔ یہ خواب اقبال کے سفر کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا، جس نے ان کے افکار، عمل اور اسلام کے مقصد اور امت مسلمہ کے احیاء کے لیے لگن کو تشکیل دیا۔

اقبال کے والد شیخ نور محمد کشمیر کے برہمن خاندان سے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں اقبال کے آباؤ اجداد میں سے ایک نے اسلام قبول کیا۔ اقبال کے آباؤ اجداد نے اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے سیالکوٹ ہجرت کی اور کھیتیاں کے محلے کو اپنی قیام گاہ بنائی، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنے وطن کشمیر سے گہری محبت رکھتے تھے لیکن سیالکوٹ ان کا نیا گھر بن گیا۔

2.3.1 پیدائش اور ابتدائی تعلیم

علامہ اقبال برطانوی ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر 9 نومبر 1877 (مطابق 3 ذوالقعدہ 1294ھ) پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد ایک مذہبی شخص تھے جو دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ ملا غلام حسن کی نگرانی میں ناظرہ قرآن سے آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔

ابھی آپ کا تعلیمی سفر جاری ہی تھا کہ اسی دوران شہر کے معروف عالم مولانا سید میر حسن سیالکوٹ پہنچے اور یہیں سے علامہ اقبال کی زندگی کے نئے رخ کا آغاز ہوتا ہے۔ میر حسن نے شیخ نور محمد کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم کو روایتی مدرسہ کی تعلیم تک محدود نہ رکھیں بلکہ جدید تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیں۔ بالآخر کچھ غور و فکر کے بعد اقبال میر حسن سرپرستی میں داخل کر دیے گئے اور آپ کو عصری تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیالکوٹ کے ایک اسکول اسکوٹس مشن کالج میں داخل کر دیا گیا جہاں سے آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میر حسن کی سرپرستی بھی حاصل رہی انہوں نے علامہ اقبال کے اندر شعور، فلسفہ کی سمجھ، ادب، منطق، لسانیات اور ریاضی کے لیے فہم و ادراک کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ انہوں نے عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ہزاروں اشعار اقبال کی ذہنی گرہ کھولنے کے لئے پڑھے، جس نے محمد اقبال کے اندر شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا کر دی اور انہیں فکری نظریات میں بھی سلامتی بخشی۔ سیالکوٹ کی اس ابتدائی زندگی نے علامہ اقبال میں ایک شاعر، فلسفی اور سیاسی مفکر کی بنیاد رکھی۔

2.3.2 علامہ محمد اقبال کی اعلیٰ تعلیم

مئی 1893 میں، محمد اقبال نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، دو سال بعد 1895ء میں انہوں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد اقبال نے مزید تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور لاہور کا رخت سفر باندھا۔ لاہور آنے کے بعد علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں انہوں نے بیچلر آف آرٹس (بی اے) میں انگریزی، فلسفہ اور عربی پڑھی۔

گورنمنٹ کالج میں اقبال نے انگریزی اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ تاہم عربی کی تعلیم کے لیے انہوں نے اورینٹل کالج میں داخلہ لیا جو اس وقت گورنمنٹ کالج کے ایک حصے میں قائم تھا۔ 1898 میں علامہ اقبال نے کامیابی کے ساتھ بی اے کی ڈگری حاصل کی

اور ماسٹر آف آرٹس (ایم اے) میں داخلہ لیا۔ علامہ کو فلسفہ کے مضمون سے خاصی دلچسپی تھی لہٰذا انہوں نے اپنی مزید تعلیم اسی مضمون میں حاصل کی۔ اس وقت گورنمنٹ کالج میں ٹی ڈبلیو آرنلڈ فلسفہ کے پروفیسر تھے انہوں نے علامہ اقبال کی لگن اور محنت دیکھ کر اپنی خاص توجہ عنایت کی اور اقبال کی فکری نشو ونما میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مارچ 1899 میں علامہ اقبال نے ایم اے میں پورے پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا، مگر آپ مشاعروں میں نہ جاتے تھے۔ لیکن ایک بار نومبر 1899ء کی ایک شام بے تکلف ہم جماعت طلبہ آپ کو حکیم امین الدین کے مکان پر لے گئے جہاں مشاعرہ کی محفل جمی ہوئی تھی اور بڑے بڑے سنگہ بند استاذ و شاگردوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ سننے والوں کا بھی اچھا ہجوم تھا۔ علامہ اقبال چونکہ بالکل نئے تھے، اس لیے ان کا نام مبتدیوں کے ساتھ پکارا گیا۔ غزل پڑھنی شروع کی، جب اس شعر پر پہنچے کہ:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو اچھے اچھے استاد اچھل پڑے۔ بے اختیار ہو کر داد دینے لگے اور یہی وہ وقت ہے جب سے اقبال کی بحیثیت شاعر شہرت کا آغاز ہوا۔ مشاعروں میں باصرار بلائے جانے لگے۔ اسی زمانے میں انجمن حمایت اسلام سے تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا۔ اس کے ملی اور رفاہی جلسوں میں اپنا کلام سناتے اور لوگوں میں ایک سماں باندھ دیتے۔ اقبال کی مقبولیت نے انجمن کے بہت سارے کاموں کو آسان کر دیا۔ کم از کم پنجاب کے مسلمانوں میں سماجی سطح پر دینی وحدت کا شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا جس میں اقبال کی شاعری نے بنیادی کردار ادا کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے تین سال تک تقریباً 1900 سے 1903 تک درس و تدریس کی خدمات انجام دی۔ علامہ اقبال تعلیمی سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کے خواہاں تھے لہٰذا انہوں نے تین سال کی خدمات کے بعد لیکچرر شپ سے استعفیٰ دے دیا اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ابتدا میں علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ وہ کینیڈا یا امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، لیکن پروفیسر آرنلڈ کے مشورے پر، انگلینڈ اور جرمنی کو اپنے تعلیمی مقامات کے طور پر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔

علامہ اقبال کا سفر یورپ

دسمبر 1905 میں علامہ اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ کا سفر کیا اور کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینیٹی کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ آپ نے وہاں سر پیٹر سٹریٹ اور پروفیسر براؤن جیسے نامور پروفیسروں سے رہنمائی حاصل کی۔ اس وقت، وائٹ ہیڈ، منگ ٹائیگر، وارڈ براؤن، اور نکلسن جیسی قابل ذکر شخصیات کیمبرج کے معزز فیکلٹی ممبران میں شامل تھیں۔ اقبال کی منگ ٹائیگر اور نکلسن کے ساتھ گہرے مراسم تھے، منگ ٹائیگر ٹرینیٹی کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور انگلستان کے ممتاز فلسفیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ براؤن اور نکلسن بالترتیب عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ انگلینڈ سے فراغت کے بعد علامہ اقبال نے جرمنی کا سفر کیا جہاں انہوں نے میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں تحقیقی مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کی ترقی" لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

4نومبر 1907 کو میونخ یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے فوراًبعد اقبال بیرسٹریٹ لاء کے آخری امتحانات کی تیاری کے لیے لندن واپس آگئے۔ چند مہینوں میں آپ نے تمام امتحانات مکمل کر لیے اور جولائی 1908 میں انہیں کامیاب قرار دیتے ہوئے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ لندن میں قیام کے دوران اقبال نے مختلف موضوعات پر لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا، جیسے کہ اسلامی تصوف، یورپی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات، اسلامی جمہوریہ، اسلام اور انسانی اقدار وغیرہ۔ بدقسمتی سے ان لیکچرز کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

2.3.3 یورپ سے واپسی اور ذمہ داریاں

یورپ میں قیام کے دوران علامہ اقبال کو مغربی تہذیب میں رائج مختلف تصورات کا براہ راست مشاہدہ اور تنقیدی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ ان تجربات نے ان کے نظریاتی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے یورپی معاشرے پر مغربی فلسفہ، سیاست اور سماجی نظام کے اثرات کا براہ راست مطالعہ کیا جس سے مغربی افکار کی بنیادوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ مغربی تعلیم کا حصول اور فلسفیانہ نشو نما نے ان کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا کر دی نیز ان کی سوچ کو بھی متاثر کیا۔ انہوں نے کانٹ اور ہیگل جیسے نامور فلسفیوں کے نظریات کا مطالعہ کیا، مابعد الطبیعات پر ان کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق نے اقبال کے فکری سفر کی تشکیل کی اور ان کے منفرد فلسفیانہ اور روحانی نقطہ نظر کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔

اگست 1908 میں اقبال لاہور پہنچے اور ایک ماہ بعد پنجاب چیف کورٹ میں اپنی قانونی پریکٹس شروع کی۔ ساتھ ہی وہ M.A.O میں فلسفے کے پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ علی گڑھ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ پڑھانے کے لیے انہیں مدعو کیا گیا تھا لیکن انہوں نے وکالت کے پیشے کو زیادہ موزوں سمجھا اور دونوں اداروں کو اپنی خدمات دینے سے منع کر دیا۔ تاہم، پنجاب حکومت کے اصرار پر، انہوں نے اپنی قانونی پریکٹس کو جاری رکھتے ہوئے 10 مئی 1910 سے گورنمنٹ کالج لاہور میں عارضی طور پر فلسفہ پڑھانا شروع کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریوں اور مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ وہ مختلف اداروں سے وابستہ ہوتے گئے۔ جب علامہ اقبال کو درس و تدریس اور قانونی عمل میں توازن پیدا کرنا مشکل ہو گیا تو آخر کار 31 دسمبر 1910 کو اقبال نے گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ دے دیا لیکن انہوں نے کسی حد تک ادارے سے اپنی وابستگی برقرار رکھی۔ گورنمنٹ کالج کے علاوہ، انہوں نے پنجاب، علی گڑھ، الٰہ آباد، ناگپور، اور دہلی کی کئی دیگر یونیورسٹیوں کے ساتھ روابط قائم کیے، مختلف مضامین کے ممتحن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

مارچ 1910 میں اقبال کو پنجاب یونیورسٹی میں فیلو کے عہدے کے لیے نامزد کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کے پروفیسر لالہ رام پرشاد کے ساتھ، انہوں نے 1913 میں "تاریخ ہند" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی اور شائع کی۔ 1923 میں آپ ایجوکیشنل کونسل کے رکن بنے۔ اپنے وسیع وابستگیوں کی وجہ سے، آپ نے بالآخر تعلیمی کونسل سے استعفیٰ دے دیا لیکن وائس چانسلر، سر جیمز مینیز نے اپنا استعفیٰ واپس لینے پر آپ کو راضی کر لیا۔

علامہ محمد اقبال کی پوری زندگی میں ان کی تعلیم، قانونی مشق اور سماجی خدمات نے ان کی کثیر جہتی شخصیت کی تشکیل اور معاشرے کی بہتری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ فارسی اور اردو ادب میں اقبال نے تاحیات کام کیا۔ انہوں نے تقریباً بارہ ہزار اشعار اردو اور فارسی میں قلمبند کیے۔ جس میں سے سات ہزار اشعار فارسی زبان میں قلمبند کیے اور تقریباً 5000 سے زائد اشعار اردو میں لکھے۔ 1912 میں شمع اور شاعر کے نام سے آپ نے ایک کتاب لکھی۔ آپ نے ایک کتاب علم الاقتصاد' کے نام سے قلم بند کی۔ ساتھ ہی شکوہ، اور جواب شکوہ، تاریخ ہند، اسرار خودی، بانگ درا، پیام مشرق، آئینہ عجم، بال جبریل، کلیات اقبال، رموز بخودی، ضرب کلیم، ارمغان حجاز، اور فارسی میں زبور عجم جیسی بے مثال کتابیں لکھیں۔

2.3.4 علامہ اقبال اور اسلامی فکر

علامہ اقبالؒ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے عصر حاضر کے مسائل، جدید فلسفہ حیات اور سائنسی رجحانات کا بخوبی احاطہ کرتے ہوئے ان نظریات و مسائل کا معقول جواب دیا ہے۔ علامہ کے عہد تک مغربی تہذیب اور علوم و فلسفہ سے پیدا شدہ مسائل، الحادی نظریات، تعلیم جدید میں روحانیت کا فقدان، امت کے نوجوانوں میں مغربی تہذیب کا زور و اثر اور اسلام کے علمی ورثہ یعنی قرآن و سنت سے انحراف، مذہب میں رسم و رواج کا چلن، مسلمانوں میں اجتہادی بصیرت کا مفقود ہونا، اسلام کے تصور تحریک سے منھ موڑنا، اور اندھی تقلید اور شخصیت پرستی جیسے نازک مسائل نا صرف بر صغیر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں گھن گرج رہے تھے۔ ان حالات میں اقبال نے ان مسائل کا حل پیش کر کے امت میں پھیلی ہوئی ان تباہ کن فکری اور عملی برائیوں کا ازالہ کیا۔ چونکہ اقبال متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید علوم سے مسلّح تھے اس لئے ان چیلنجز کا بخوبی مقابلہ کر سکے۔

علامہ اقبال ان ممتاز مفکرین و مصلحین میں سے ہیں جنہوں نے بیسوی صدی میں مشرق و مغرب کو اپنے نظریات و خیالات سے متزلزل کر کے رکھ دیا وہ نہ صرف ایک انقلابی و فکری شاعر تھے بلکہ وہ ایک جید اسلامی مفکر اور اسکالر تھے انہیں اسلامی و مغربی علوم و نظریات پر درک تھا۔ فقہی مسائل سے لے کر سیاسی مسائل تک پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ آپ نے مغربی علوم، قرآن و حدیث، فقہ اور تاریخ کا براہ راست مطالعہ کر کے اپنی فکری جہت کو وسعت دی تھی۔

اقبال نے جب اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کا رخ کیا تو وہاں کی آزاد خیالی، تہذیبی چمک دمک اور متنوع افکار و نظریات اقبال کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کر سکے۔ بلکہ ان برگ و بار سے بچتے ہوئے انہوں نے مغرب و یورپی طرز تحقیق و تعلیم اور سائنسی رجحان سے بھرپور استفادہ کیا اور دوسروں کو بھی اس سے مستفید ہونے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کی نظر میں مغربی علوم سے استفادہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ان کے مزاج میں اس کے تئیں لچک کا مظاہرہ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبالؒ نے متعدد مقامات پر مغربی علوم، خدمت خلق، محنت اور پابندی وقت وغیرہ کا بھی اعتراف کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے مغربی علوم و فنون، الحادی نظریات، مذہبی بے زاری، حیا و پاک دامنی سے محروم تہذیب اور ان کی جملہ خرابیوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ علامہ اقبال نے یوروپی و مغربی فکر و تہذیب کی تہہ میں جا کر ان کے علوم و فنون کو پڑھا، سمجھا، پرکھا، جانچا اور پھر تحقیق پر مبنی غیر جانب دارانہ تبصرہ و تنقید کی۔ اس سے بھی

بڑھ کر دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے مغرب اور اس کی تہذیب و معاشرت اور تاریخ کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے باوجود مغربی فکر و نظریات سے اپنے دامن کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید مودودیؒ ان کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"مغربی تعلیم اور تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ پایا گیا اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا، اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا تھا۔ اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا وہ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا"۔

بقول ڈاکٹر علی شریعتی: "اقبال نے سب سے پہلے مشرق و مغرب دونوں کا فکری تحلیل و تجزیہ کیا اور دونوں کے طرز زندگی اور تہذیب و تمدن کا موازنہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے کہ مشرق نے حق کو تو دیکھا مگر دنیا کو نہیں دیکھا مغرب نے، دنیا کو دیکھا مگر حق سے گریزاں رہا اس کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ذلت کا بھی فعل ہے اور مغرب کی غلامی کا بھی"۔ (اقبال مصلح قرن آخر از ڈاکٹر علی شریعتی)

دین وسیاست

علامہ اقبال سیاست اور اسلام کو ایک اکائی کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے اور دونوں کی ایک دوسرے سے جدائی کو چنگیزیت سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اقبال نے سیاسی نظام کے رہنما اصول کی نشاندہی کی ہے اور قانون سازی کے لئے قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع کو بنیادی ماخذ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے قدیم علماء کی روش کو برقرار رکھا ہے۔ اسلام ایک ناقابل تقسیم حقیقت ہے جسے دنیوی اور اخروی خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا ہے۔ چنانچہ "ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" میں واضح طور پر لکھتے ہیں۔ "اسلام میں روحانی اور مادی دو الگ الگ خطے نہیں ہیں۔ قرآن کی رو سے حقیقت مطلقہ روحانی ہے اور اس کی زندگی زمانی فعالیت سے عبارت ہے روح کو فطرت مادیت اور دنیوی امور میں ہی اظہار کیلئے مواقع ملتے ہیں اس طرح یہ دنیاء بھی اپنی ہستی کی اساس کے طور پر روحانی ٹھہرتی ہیں"۔

دین وسیاست کو مختلف فیہ پہلوؤں سے دیکھنے کا نظریہ بیسویں صدی کے نصف تک عروج پر پہنچ گیا تھا، اس نظریہ کو پروان چڑھانے میں جن دو اشخاص نے نمایاں رول ادا کیا ان میں مارٹن لوتھر کنگ اور لارڈ میکالے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے روح و مادہ اور دین وسیاست کے درمیان فرق کی بناء ڈالی اور انہی سے متاثر ہو کر مسلم دانشوروں اور علماء نے تقلید کی راہ اختیار کی اور ان حالات میں اقبال نے بادشاہت وملوکیت وجمہوریت اور دین وسیاست کی علیحدگی کے اس فتنہ پر کاری ضرب لگائی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ "جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو" اس کے ساتھ ساتھ اقبال دین وسرمایہ، دین وملک اور جسم و تہذیب کے درمیان علیحدگی کو بھی رد کر

دیتے ہیں۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہو اس کی امیری ہو اس کی وزیری

دین ایک اکائی ہے اس حوالے سے اقبال اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

Islam does not bifurcate unity of man into an irreconcilable duality of sprit and matter. In Islam God and the universe sprit and the matter, church and the state are organic to each other.

اسلامی فکر کے لئے لائحہ عمل

اقبال نے فکر اسلامی کی تشہیر و تکمیل کے لئے ایک ایسے ادارے کا خاکہ پیش کیا تھا جس میں نوجوان اسکالرز اسلامی ماحول میں رہ کر مختلف علوم میں مہارت حاصل کر کے مختلف علمی میدان میں تحقیقی کام کو انجام دے سکیں، انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار سید مودودیؒ سے خط میں کیا تھا۔ جس میں انہوں نے سید مودودیؒ کو حیدرآباد سے دار الاسلام آنے کی دعوت دی تھی۔ سید مودودیؒ نے بھی اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے ہاں کر دی اور دار الاسلام آنے کے لئے تیاری کرنے لگے اسی دوران سید نذیر نیازی کا خط مولانا کو ملا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جس قدر ممکن ہو، لاہور آیئے کیونکہ اقبال کی صحت اچھی نہیں ہے"۔ لیکن بد قسمتی سے اس خط کے تیسرے روز اقبال خالق حقیقی سے جاملے اس طرح سے اسلامی اکیڈمی جو اقبال کے خوابوں کا مرکز تھا شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ (خطوط مودودی)

اقبال کو قرآن مجید سے بے پناہ لگاؤ اور قلبی وابستگی تھی انہوں نے قرآن حکیم کی فکر کو مطمح نظر بنالیا تھا۔ وہ قرآن حکیم سے براہ راست استفادہ کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس بات کا واضح الفاظ میں اعلان کرتے ہیں۔

تیرے ضمیر پے جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے رازی نہ صاحب کشاف

اقبال کے نزدیک قرآن مجید کی اصل غایت آدمی اور کائنات کے متنوع تعلقات کا شعور پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "قرآن خدا اور کائنات کے ساتھ انسان کے تعلق کا اعلیٰ شعور پیدا کرتا ہے"۔ خدا اور بندے کے درمیان تعلق اسی وقت استوار ہو سکتا ہے جب وہ قرآن میں غوطہ زن ہو کر اس کے اسرار و معارف کے خزانے حاصل کرے اسی لئے وہ دعا گو بھی ہیں کہ:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں اللہ کرے تجھ کو ہو عطا جدت کردار

اقبال بندوں کو بندوں سے جوڑنے کی تلقین کرتے ہیں پھر بندوں کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ نا صرف سیاسی غلامی، مغربی فکر و تہذیب کی غلامی، رنگ و نسل کی غلامی، وطن کی غلامی، باطل افکار و نظریات کی غلامی اور تقلید محض کی غلامی سے بلکہ اپنے جیسے انسانوں کی بھی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی بہت تاکید کرتے ہیں کیونکہ ان کو اس بات پر یقین محکم تھا کہ غلامی ہی ایک ایسی لعنت ہے جس میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے اور ضمیر فروشی کا کار بد انجام دے کر کوئی بھی قوم یا ملت تخلیقی

صلاحیتوں اوراجتہادی بصیرت اورزمانہ شناسی، ستاروں پر کمند ڈالنے اور مستقبل کی تعمیر کرنے سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ اس لئے اقبال ملت اسلامیہ کوجملہ غلامیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے پر بار بار ابھارتے ہیں اور صرف اور صرف خدائے لاشریک کی غلامی اور فرمابرداری کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی غلامی وبندگی سے انسان کو نجات مل سکتی ہے۔

غلامانہ ذہنیت اور غلاموں کو غلامی کے خلاف اس طرح سے ابھارتے ہیں:

گرماؤں غلاموں کالہو سوز یقین سے　　کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

اٹھ کہ اب بزم میں جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

2.3.5 علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم

اقبال ایک بہترین ماہر تعلیم بھی تھے ان کا تعلیمی نظریہ بہت واضح اور صاف تھا۔ انہوں نے جدید اور مغربی نظام تعلیم کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیاجو رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے غیر اسلامی نظام تعلیم سے سخت بے زاری ظاہر کی کیونکہ اس نظام تعلیم سے ترقی کے ساتھ ساتھ ساتھ نوجوانوں میں دہریت اور غیر اسلامی افکار و نظریات بھی رواج پارہے تھے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

خوش توہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے　　مگر لب خنداں سے نکل جاتی ہیں زیاں بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے لائے گی فراغت تعلیم　　کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

مغرب سے بر آمد شدہ نظام تعلیم ہمارے نوجوانوں کو شیخی، تکبر اور خود پسندی کے سوا کچھ نہیں دیتی چنانچہ فرماتے ہیں:

تعلیم مغرب ہے بہت جرأت آفریں　　پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج ماڈرینگ

رائج نظام تعلیم میں اقبال کے نزدیک ایک اور خرابی یہ بھی تھی کہ یہ نوجوانوں اور طلبہ کو فکر معاش میں مبتلا کر دیتی ہے اور اسی فکر معاش میں وہ مال وزر کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش

جب یہ نظام تعلیم ایک طالب علم کو جدائی کا سامان بہم پہنچاتا ہے تو اس کے فتنہ بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی:

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ　　اولاد بھی املاک بھی جاگیر بھی فتنہ

غرض اقبال کی فکر عصر حاضر میں کافی اہمیت وافادیت کی حامل ہے ان کی فکر سمجھنے کے لئے ہمیں ان کے افکار و نظریات کا بھر پور مطالعہ کرنا چاہیے۔

علامہ اقبال کی تصانیف:

علامہ اقبال نے علمی دنیا کے لئے متعدد علوم میں بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں فلسفہ، علم و حکمت، طبیعیات، مادیت، اسلامی افکار وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ درج ذیل ان کتابوں کے نام دئے جاتے ہیں:

کلیات اقبال، علم الاقتصاد–1903، اسرار خودی–1915ء، رموز بے خودی–1917ء، پیام مشرق–1923ء، زبور عجم–1927ء، جاوید نامہ–1932ء، مسافر–1936ء، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق–1931ء، بانگ درا–1924، بال جبریل–1934، ضرب کلیم–1936، ارمغان حجاز–1938، فارس میں ماوراء الطبیعیات کا ارتقاء–1908، اسلام میں مذہبی افکار کی تعمیر نو–1930ء۔

علامہ محمد اقبال 21 اپریل 1938ء بمطابق 20، صفر المصفر 1357ھ کو فجر کے وقت اپنے گھر جاوید منزل میں طویل علالت کے باعث خالق حقیقی سے جاملے۔ علامہ اقبال کو لاہور میں بادشاہی مسجد کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علامہ شبلی نے علمی خدمات کا بیش قیمتی ذخیرہ آنے والی نسلوں کو دیا اور انہوں نے اپنی صحیح آراء اور اسلامی افکار سے مسلم معاشرے کی نئی نسلوں کو متاثر کیا نیز ان کی رہنمائی کی۔ آپ نے بہت ساری تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا جس میں سیرت النبی بہت مقبول ہے۔
- علامہ اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ کا سفر طے کیا جہاں سے ان کی فکر میں نیا انقلاب دیکھنے کو ملا اور انہوں مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں اسلام کی تازہ روح پھونکنے کا کام کیا۔
- علامہ اقبال نے اپنی شاعری اور نثری مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کو یورپ کی چکاچوندھ سے بچنے اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنے اسلاف کے طریقہ کو اختیار کرنے پر بہت زور دیا ہے۔

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "الفاروق" کس سن عیسوی میں شائع ہوئی؟

1901.(a) 1897.(b) 1899.(c) 1898.(d)

2. درج ذیل میں سے علامہ اقبال کی کتاب کا نام بتایئے۔

(a). ارمغان حجاز (b). المامون (c). شعر العجم (d). سحر البیان

3. علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

1876.(a) 1884.(b) 1877.(c) 1888.(d)

4. اسکوٹس مشن کالج کہاں واقع ہے؟

(a). لاہور (b). کراچی (c). برطانیہ (d). سیال کوٹ

5. حیات شبلی کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a). علامہ شبلی (b). صباح الدین عبد الرحمٰن (c). شاہ معین الدین (d). سید سلیمان ندوی

6. ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی کس عہدے پر فائز تھے؟

(a). ناظم تعلیم (b). صدر مدرس (c). ناظم کتب خانہ (d). مہتمم

7. تمغہ مجیدیہ کس مسلم مفکر کو اس کی علمی خدمات کے لئے دیا گیا؟

(a). ابو الکلام آزاد (b). علامہ اقبال (c). علامہ شبلی (d). محمد علی جوہر

8. شمس العلماء کا خطاب کس کو ملا؟

(a). الطاف حسین حالی (b). سر سید احمد (c). ڈپٹی نذیر احمد (d). علامہ شبلی

9. علامہ شبلی کہاں پیدا ہوئے؟

(a). بندول (b). مکہ (c). سیال کوٹ (d). لکھنؤ

10. شعر العجم کس کی تصنیف ہے؟

(a). علامہ محمد اقبال (b). مولانا ابو الکلام آزاد (c). مولانا الطاف حسین حالی (d). علامہ شبلی نعمانی

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی نعمانی کی مصروفیات کا مختصر تعارف کرایے۔
2. علامہ اقبال کے سفر یورپ پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
4. علامہ شبلی نعمانی کا مختصر سوانحی خاکہ لکھیے۔
5. علامہ شبلی نعمانی کی دو مشہور کتابوں کا تعارف کرایئے۔

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ شبلی نعمانی کی علمی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. علامہ محمد اقبال کے افکار و نظریات پر مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. علامہ شبلی نعمانی پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مقالات شبلی، از علامہ شبلی نعمانی، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2008
2. سفر نامہ مصر و روم و شام، شبلی نعمانی، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2008
3. حیات شبلی مولانا سید سلیمان ندوی شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2008
4. مضامین الندوہ، مولانا ابوالکلام آزاد۔ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری (ترتیب و تدوین) پورب اکادمی، اسلام آبادی، پاکستان 2008
5. مکاتیب شبلی حصہ اول، دوم سید سلیمان ندوی (مرتب) شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔1971-2010
6. علامہ اقبال: حیات فکر و فن، مرتب ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 3: مشہور مفکرین: اشرف علی تھانوی، ابوالکلام آزاد

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 اشرف علی تھانوی

3.2.1 سوانح حیات

3.2.2 تصوف میں آپ کا مقام

3.2.3 تصانیف

3.3 مولانا تھانوی کا نظریہ تعلیم

3.3.1 مولانا تھانویؒ اور تعلیم نسواں

3.3.2 مولانا تھانوی بحیثیت مذہبی مصلح

3.3.3 مولانا تھانوی کا سیاسی نقطہ نظر

3.4 ابوالکلام آزاد

3.4.1 تعلیم وتربیت

3.4.2 مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات

3.4.3 مولانا آزاد کے سماجی نظریات

3.5 مولانا آزاد کے سیاسی نظریات

3.5.1 مولانا آزادؒ کا تصور خلافت

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

ہمارا ملک ہندوستان ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں کی سرزمین پر جید اہل علم و ادب پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ملک وملت دین و ایمان اور ادبی ورثہ کی آبیاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی، بلکہ اپنی جان مال اور وقت سب کچھ قربان کر کے بھی ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ابھی بھی حق ادا نہ ہوا۔ ایسے دانشورانوں کی ایک بڑی تعداد کا تذکرہ تاریخی کتب میں جابجا دیکھا یا پڑھا جا سکتا ہے، جن کی علمی خدمات نے ہندوستان کو نہ صرف عالمی شہرت یافتہ بنایا بلکہ علمی میدان میں ہندوستان کی اہمیت کا لوہا منوایا۔ ان اہم شخصیات میں ایک ممتاز نام ہے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا کہ جن کے علوم و افکار سے آج بھی دنیا نفع اندوز ہو رہی ہے۔ اور دوسرا نام مولانا ابو الکلام آزاد کا ہے جنہوں نے اپنی علمی بصیرت اور نقطہ نظر سے ایسا لائحہ عمل تیار کیا کہ موجودہ زمانہ میں بھی اس کی نظیریں بہت مشکل سے ملتی ہیں۔

3.1 مقاصد

اس یونٹ کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو ہندوستانی مسلم مفکرین کی خدمات کا علم ہو جائے، اور مولانا اشرف علی تھانوی کی حیات و خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے افکار و نظریات کا علم ہو، نیز مولانا کے تعلیمی نظریات اور خاص کر عورتوں کے بارے میں آپ کی رائے اور معاشرے میں ان کی حیثیت کو بہتر بنانے میں آپ کی خدمات کیا ہیں اس سے طلبہ متعارف ہو جائیں۔ نیز ابو الکلام آزاد کے مذہبی و تعلیمی نظریات کا علم ہو کہ انہوں نے کس طرح مسلمانوں کو ذبوحالی سے نکالنے اور علمی استفادہ میں اہم کوششیں کیں، نیز سیاسی امتیاز دلانے میں کیا خدمات انجام دیں، ساتھ ہی انکا نظریہ و تصور خلافت و سیاست کس عزائم کے ساتھ قائم و دائم رہا۔

3.2 اشرف علی تھانوی

ہندوستان اپنی مردم خیزی اور علماء و صلحاء کی آبیاری کے لئے برصغیر میں بلکہ یو کہیں کہ جنوب ایشیاء میں اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔ یہاں خواجہ معین الدین چشتی جیسی شخصیت نظر آتی ہے تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی بھی۔ اس خطہ میں معتدد انقلاب افروز شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔ جن میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، نظام الدین اولیاء، شاہ اسماعیل شہید، سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ انہیں انقلاب افروز شخصیات میں سے ایک نام حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ہے جنہوں نے اپنی جامع شخصیت سے پوری ہندوستانی نسل میں ایمان و یقین کی تازگی فراہم کی۔ آپ کی جامع کمالات شخصیت انواع فضائل سے بھری ہے آپ حافظ،

قاری مدرس، مفسر، محدث، فقیہ، واعظ، صوفی متکلم، مناظر، ناظم، ناشر اور خانقاہ نشیں یہ سب کچھ تھے جس کی زندہ جاوید مثالیں آپ کے آثار علمیہ سے ملتی ہیں، لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اپنے تمام فضائل و کمالات کو فن تصوف کی اصلاح و تکمیل میں صرف فرمایا۔ آپ کی تعلیم و تربیت تصنیف و تالیف وعظ و تبلیغ کی بدولت ہندوستان میں صحیح عقیدہ کی تبلیغ ہوئی نیز مسائل صحیحہ کی اشاعت عمل میں آئی اور ہندوستانی غیر اسلامی رسم و رواج اور بدعات کا قلع قمع ہوا، سنت نبوی ﷺ کا احیاء ہوا اور اللہ سے تعلق کی فضاء قائم ہوئی، یہ وہ شان تجدید تھی جو اس صدی میں مجدد وقت مولانا اشرف علی تھانوی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمائی۔ آپ کے ان ہی تجدیدی کارنامے اور اصلاحی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

3.2.1 سوانح حیات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل راجہ بھیم نے مظفر نگر ضلع میں ایک قصبہ اپنے نام "تھانہ بھیم" سے بسایا تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد وہ محمد پور کے نام سے موسوم ہوا لیکن یہ نام زیادہ مشہور نہیں ہو سکا اور وہی پرانا نام "تھانہ بھیم" عوام کے درمیان معروف رہا۔ البتہ اس میں اتنا فرق ضرور ہوا کہ "تھانہ بھیم" کی اصل شکل بدل کر "تھانہ بھون" ہو گئی اور یہی نام اس جگہ کی شہرت کی وجہ بنا جو صدیوں سے ایسے ہی چلا آرہا ہے۔ یہ قصبہ ہمیشہ سے مردم خیز رہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت و قوت نیز صاحب فضل و کمال رہے ہیں۔ انہیں خاندانوں میں سے ایک خاندان مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ہے جن کے دادیہالی اجداد تھانسیر اور نانیہالی جھنجھانہ سے تھانہ بھون منتقل ہوئے تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ صوبہ اتر پردیش، ضلع مظفر نگر کے قصبہ "تھانہ بھون" میں سنہ 1280ھ / 1863ء کو اسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کی طرف کے رشتہ داروں نے آپ کا نام عبد الغنی رکھا، لیکن حضرت غلام مرتضی مجذوب پانی پتیؒ نے آپ کا نام اشرف علی رکھا اور آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ خاندانی نسب اعلی تھا اور آپ "تھانہ بھون" کے فاروقی شیوخ میں سے شمار ہوتے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس کے بعد آپ کے والد محترم جناب شیخ عبد الحق نے تربیت کی ذمہ داری سنبھالی آپ کے والد جناب عبد الحق ایک امیر شخص، ایک عقیدت مند مسلمان، معزز شہری تھے اور "تھانہ بھون" میں عزت و احترام کے حامل تھے۔ آپ فارسی کے بہترین استاد اور صاحب ثروت تھے چنانچہ آپ نے یہ فریضہ بحسن و خوبی ادا کیا اور اشرف علی تھانوی کی عمدہ تربیت کی جس سے آپ میں دینی مزاج پیدا ہوا۔

تعلیم و تربیت

والد محترم نے اشرف علی کے اندر دینی مزاج اور دلچسپی دیکھ کر حفظ قرآن کے لئے حافظ حسین علی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، جہاں آپ نے حفظ قرآن پاک سے اپنی تعلیمی سفر کا آغاز کیا، اور پھر فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھی اور فارسی کی اعلی کتابیں اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد اسلامی علوم کی تکمیل کے لیے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور 1296ھ / 1878ء میں داخلہ لیا اور مسلسل پانچ سال دارالعلوم سے استفادہ کے بعد 1301ھ / 1883ء میں فراغت حاصل

کی۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر المدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ سے خوب استفادہ کیا لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے کچھ تفسیری درسوں کے علاوہ زیادہ کسب فیض نہ کر سکے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ داخلہ کے سال ہی حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوا اس لیے استفادہ کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ آپ نے حضرت شیخ الہند حضرت محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا عبدالعلیؒ، مولانا سید احمد صاحبؒ اور ملا محمودؒ جیسے بزرگوں سے کسب فیض کیا اور مختلف عناوین پر مشتمل کئی کتابیں پڑھیں۔ تجوید کا علم مکہ مکرمہ میں قاری محمد عبداللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کیا۔

میدان عمل

دیوبند میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کی عملی زندگی کا آغاز مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس کی حیثیت سے 1883 سے ہوا، جہاں انہوں 14 سالوں تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ آپ نے اعلیٰ سطح کی کتابیں پڑھائیں، فتاویٰ لکھے اور اسلام سے جڑے مختلف موضوعات یعنی حدیث، تفسیر فقہ، منطق، فلسفہ اور تصوف پر درس دئے۔ آپ اپنی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرتے۔ آپ کے علم تقوی اور مختلف خوبیوں کو دیکھتے ہوئے مدرسہ جامع العلوم کانپور کی انتظامیہ نے آپکو مدرسہ کا صدر منتخب کیا۔ آپ نے بہت کم وقت میں عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ آپ کے تدریسی انداز نے بہت سے طالب علموں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بعد میں برصغیر پاک و ہند میں آپ کی شخصیت کو اسلامی تعلیمات کے مشعل راہ کی حیثیت سے متعارف کرایا نیز آپ کے تحقیقی مزاج اور مختلف موضوعات پر شائع کتابوں نے اسلامی تعلیمات کے باب میں بیش بہا اضافہ کیا۔

آپ نے بہت سے شہروں، قصبوں اور گاؤں کا سفر کیا اور لوگوں کی اصلاح کے لئے خطابات دئے، ان اسفار میں دئے گئے خطابات کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ تاریخ اسلام میں بہت کم علماء ایسے ہیں جن کے خطبات ان کی زندگی میں وسیع پیمانے پر شائع ہوئے ہوں۔ کانپور میں قیام کے دوران آپ کے دل میں عوام کی اصلاح کی اور ان کو اللہ سے جوڑنے کے لئے تڑپ موجزن تھی۔ آپ نے اسے انجام تک پہنچانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور رفتہ رفتہ آپؒ کے درس قراں و حدیث کی شہرت اطراف واکناف کی حدود سے نکل کر دور دور تک پہنچی اور ہر طرف سے تشنگان علوم نبوی پہنچے اور سیر اب ہو کر واپس ہوئے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی میں

ہر انسان کی زندگی میں ایک شیخ تربیت ضرور ہونا چاہیے کیوں کہ کتابوں سے حاصل ہونے والے علم کے ذریعے انسان ظاہری اصلاح تو کر سکتا ہے لیکن شیخ کی صحبت سے اس کی باطنی دنیا بدل جاتی ہے اور وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کو بھی اپنی باطنی و روحانی ذات پر توجہ مرکوز کرنے کی فکر تھی۔ چنانچہ آپ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو اپنا شیخ طریقت تسلیم کیا اور انہوں نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اس وقت مولانا اشرف علی تھانوی کی عمر 19 سال تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے 1884ء (1301ھ)

میں اپنے پہلے حج کے دوران حاجی امداد اللہ صاحب سے ملاقات کی۔ حاجی امداد اللہ نے انہیں چھ ماہ تک اپنے ساتھ رہنے کا کہا لیکن مولانا تھانوی ان کی صحبت میں نہ رہ سکے کیونکہ ان کے والد جلدی واپس آنا چاہتے تھے۔ 1893ء 1310ھ میں ان کا دوسرا حج ہوا۔ مولانا تھانوی چھ ماہ تک اپنے شیخ کے ساتھ رہے۔ حاجی امداد اللہ نے انہیں تھانہ بھون جانے اور خانقاہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانپور کے مدرسہ عربیہ فیض عام میں درس و تدریس کی خدمات سے مستعفیٰ ہو کر اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مشورے پر / 1897ء میں تھانہ بھون تشریف لائیں اور حضرت حاجیؒ امداد اللہ کی خانقاہ "امدادیہ" میں قیام فرمایا نیز مدرسہ اشرفیہ قائم فرمایا اور 47 سال تک خانقاہ میں رہ کر تبلیغ دین، تزکیہ نفس، اور تصنیف و تالیف میں زندگی گزاری اور زندگی کی آخری سانس تک وہیں قیام پذیر رہے، اسطرح اس راہ وفا میں بے مثال خدمات انجام دیں۔

3.2.2 تصوف میں آپ کا مقام

ہمارا ملک ہندوستان ہمیشہ سے ولیوں اور صوفیوں کا گہوارہ رہا ہے، بہت سے اللہ کے نیک بندے اس سرزمین پر تشریف لائے اور ایمان و یقین کے نور سے اس زمین کو منور کیا، محبت و وفا کے نغمے گنگنائے، دعاء سحر گاہی سے اس خطہ ارضی کو آباد کیا، ان اعلی درجہ کے بزرگوں میں حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام بھی شامل ہے۔

حضرت تھانویؒ کے نزدیک تصوف اللہ رب العزت کو راضی کرنے کا نام ہے، اس کا ذریعہ شرعی احکام پر مکمل طور سے چلنا، اب ان احکام میں بعض کا تعلق ظاہر سے ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰت، نکاح و طلاق، حقوق زوجین، قسم کفارہ، وصیت، ترکہ، سونا جاگنا اور قیام و قعود وغیرہ، یہ ظاہری اور فقہی احکام کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، جب کہ کچھ احکام کا تعلق باطنی ہوتا ہے جیسے خدا سے محبت کرنا، اللہ سے ڈرنا، مخلوق خدا سے محبت کرنا، مشیت الہی پر راضی ہونا، حرص سے بچنا، عبادت میں دماغ کو حاضر رکھنا، دینی کام اخلاص سے کرنا، کسی چیز کو حقیر نہ جاننا، غصہ کو پی جانا اور خود پسندی وغیرہ نہ ہونا سلوک کہا جاتا ہے۔

حضرت تھانویؒ تصوف اور تزکیہ کی راہ میں بھی بہت مشہور ہوئے، ظاہری باطنی طہارت و صفائی نے عوام و خواص کی ایک بڑی تعداد کو آپؒ کی طرف متوجہ کیا، طالبان فیض قطار در قطار آپ کی خانقاہ امدادیہ کی طرف آتے اور خوب استفادہ کرتے، آپ نے نہ صرف تھانہ بھون اور مدسہ و خانقاہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر اسلام کی تبلیغ کی خدمت انجام دی بلکہ ملک کے مختلف خطوں اور قریوں کے سفر کئے اور عوم کے درمیان تقریریں کی، اپنے خطابات سے انہیں اسلام کی صحیح تصویر دیکھائی، یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں شدھی تحریک پر زور انداز میں اپنا کام کر رہی تھی اور میوات وغیرہ کے مسلمانوں کا ایمان کفر و الحاد کی حد تک پہنچ گیا تھا، آپ نے وہاں کا دورا کیا لوگوں کو اس امر سے باز رہنے کا عہد لیا اور اس وبا سے بچنے کے لئے ایک عمدہ کتاب "الانسداد" کے نام سے لکھی، جس نے عوام و خواص میں بہت شہرت حاصل کی۔ آپ کی تقاریر و خطابات قرآن و حدیث کی روشنی میں ہوا کرتے تھے اور عوم پر گہرا اثر مرتب کرتے تھے، آپ نے مسلمانوں میں سرایت کر چکے بہت سے غیر اسلامی رسم و رواج کو ختم کرنے کے لئے "اغلاط العوم" کے نام سے بہت ہی عمدہ کتاب تحریر کی جس نے لوگوں میں رائج تمام غیر اسلامی رسومات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی مخلصانہ کوشش کو شرمندہ تعبیر کر دیا۔ اس کتاب میں عقیدے، عبادات اور لین

دین میں بدعت کی مذمت کی گئی ہے۔ آپ نے شریعت وطریقت کے درمیان حائل بدعات کا خاتمہ کر کے تصوفانہ وروحانی تعلیمات کو از سر نو زندہ وجاوید کر دیا۔

آپ کی ایک نظر التفات نے ہزاروں لوگوں کو ولی کامل بنادیا، کچھ کلمات خیر نے بہت لوگوں کو رات کی تنہائی میں رب کے سامنے سجدہ ریز بنادیا، بہت سے لوگ آپ کے چشم فیض سے بدعات وخرافات سے تائب ہو گئے، اس بیعت وارشاد کی راہ میں جتنا زیادہ لوگوں نے آپؒ سے استفادہ کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے، آپؒ کے مقام بلند کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بر صغیر کے جلیل القدر علماء وفضلاء کی ایک بڑی تعداد آپؒ کے خلفاء ومنتسبین میں شامل ہے، ان بزرگوں کا شمار بہت مشکل ہے کچھ نام درج ذیل ہیں:

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ مفتی پاکستان و بانی دارالعلوم کراچی، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ مرتب اعلاء السنن، حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ، حضرت مولانا محمد عیسی الہ آبادیؒ، حضرت مولانا وصی اللہ الہ آبادیؒ، حضرت مولانا مسیح اللہ جلال آبادیؒ، حضرت مولانا عبد الغنی پھول پوریؒ، حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ وغیرہم۔

وفات

آپ کی زندگی کا بہترین حصہ خالق اور اس کی خلقت کی خدمت انجام دیتے ہوئے گزرے، آپ کی سادگی سادہ لوہی کا ہر شخص قائل تھا اور اسی طرز زندگی کے ساتھ 80 سال کی عمر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا انتقال 16 اور 17 رجب 1362ھ یا 19 اور 20 جولائی 1943ء کی درمیانی شب اپنے آبائی شہر تھانہ بھون میں ہوا۔ ان کی نماز جنازہ مولانا ظفر احمد عثمانی (ان کے بھتیجے) نے پڑھائی۔

آپ کے انتقال کے موقع پر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا:

"اب اس دور کا خاتمہ ہو گیا جو حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا قاسم نانوتوی،، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمہم اللہ کی یادگار تھا، اور جس ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد شہید کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین رہا، جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے نصف صدی تک اللہ تعالی کے فضل وکرم وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور جس نے اپنی تحریر وتقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کی برملا فاش کیا تھا۔ اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا" (یادرفتگاں، مولانا سید سلیمان ندویؒ، کراچی جنوری 1955ء بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند)۔

3.2.3 تصانیف

حضرت تھانویؒ ایک باکمال مصنف بھی تھے، آپؒ کا علم بہت ہی وسیع اور عمیق تھا، آپ کا شمار تاریخ اسلامی کے کثیر التالیف

بزرگوں میں ہوتا ہے، علماء دیوبند میں بھی تصنیفی خدمات کے معاملے میں اعلی مقام رکھتے ہیں، آپ کی تصانیف تبحر علمی پر منھ بولتا ثبوت ہیں، ہندوستانی مصنفین میں کوئی بھی تالیف کے میدان میں آپ کے قریب بھی نہ پہنچ سکا، چھوٹی بڑی مؤلفات کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو (350) ہے، ان کے علاوہ تین سو سے زائد اُپ کے مطبوعہ مواعظ ہیں، انہیں بنیاد پر آپ کو "حکیم الامت" کا خطاب ملا، شائد ہی کوئی ایسا علمی میدان ہو جس میں آپ کی تصنیفات نہ ہوں آپ نے تمام موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں اور خاص کر تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، اسلامی اخلاقیات، تصوف، اسلامی فلسفہ، عقائد وغیرہ موضوعات شامل ہیں، مجموعی طور پر حضرت تھانویؒ کے رسائل و مؤلفات کی تعداد آٹھ سو ہے، ان تمام کتابوں کا احاطہ خاصا دشوار امر ہے اسلئے کچھ کتابوں کا تذکرہ درج ذیل ہے:

1. **بیان القرآن:** قرآن کریم کا 12 جلدوں میں ترجمہ اور تفسیر ہے جو سادہ، آسان، درست، غلطیوں سے پاک، صحیح زبان کا استعمال، تفسیر میں دیئے گئے وضاحتی الفاظ، اس کی کچھ منفرد خصوصیات ہیں اور نہ صرف علماء کے لئے بلکہ عام انسان کے لئے بھی اسلام کی ایک عظیم خدمت سمجھی جاتی ہے۔

کتاب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس کا جو متن انہوں نے لکھا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ تفسیر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے متاثر ہونے والی چیزوں پر مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت اس کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے تقریباً 20 دیگر تفاسیر پڑھی ہوں، مشکل جگہوں پر جہاں مختلف آراء موجود تھیں، اس مسئلے کو حل کیا گیا ہے یا اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ اللہ کی نعمت ہے۔

2. **بہشتی زیور:** مولانا اشرف علی تھانوی نے بچوں اور عورتوں کے لیے سادہ زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ سب سے مشہور کتاب "بہشتی زیور" ہے جس میں مولانا تھانوی نے قرآن اور حدیث کی تعلیم کا خلاصہ کیا ہے۔ یہ اسلام اور اسلامی قانون پر بہترین درسی اور حوالہ جاتی کتاب ہے، جو مکمل طور پر فقہ حنفی پر مبنی ہے۔ یہ کتاب قرآن کے بعد اردو، گجراتی، بنگالی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی زبان اتنی آسان اور سادہ ہے کہ ہج کوئی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اس کا اور بہت سی دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بہشتی زیور واحد کتاب ہے جو شریعت اور اسلام کی تمام پانچ بنیادی ارکان کے لازمی اصول (1) عقائد (2) عبادت (3) لین دین اور کاروبار معالات (4) طرز زندگی (5) آداب و اخلاقی تصوف پر محیط ہے۔

3. **اصلاح الرسوم:** یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور یہ وقت کی ضرورت تھی۔ اس کتاب میں اس وقت کے معاشرے میں رائج مختلف رسم و رواج اور روایات کو درج کیا گیا ہے، چاہے وہ مذہبی ہو یا معاشرتی۔ اس کتاب میں جن موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے ان میں گانا اور رقص، آتش بازی، داڑھی منڈوانا، بالوں کو رنگنا، دوسرے مذہب کے لوگوں کے لباس کی نقل کرنا شامل ہیں۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش، ختنہ، تعلیم کے سلسلے میں مختلف رسم و رواج اور اس کے بعد شادیوں میں اپنائے جانے والے رسم و رواج کی پیروی کی جاتی ہے۔ کتاب کا ایک اور حصہ معاشرے کے دیگر متفرق رسم و رواج جیسے عرس اور فاتحہ، شب برات اور اس کی مٹھائی (حلوہ)، موت کے وقت کی روایات اور رسم و رواج اور بہت سے دیگر متعلقہ امور سے متعلق ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ہر عمل کو درج کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے اور اس طرح کے اعمال کے خلاف مستند احکام دیئے ہیں اور یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس طرح کے اعمال کی اسلام میں کوئی حرمت نہیں ہے اور عوام اسلام کی تعلیمات کے خلاف عمل پیرا ہیں اور اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

4. **آداب المعاشرت:** مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریر کردہ آداب المعاشرت (سماجی زندگی کے آداب)۔ یہ کتاب سادہ شکل میں پیش کی گئی ہے اور ہر مسلمان کے لئے تیار کی گئی ہے، چاہے وہ کسی بھی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ اس وقت کی مسلم کمیونٹی میں، جہاں کہیں بھی اس کا غلبہ ہے، معاشرت کا فقدان ہے۔ اسلام سے مکمل لاعلمی کی وجہ سے مغربیت کے حملے کے اثرات کے تحت، مسلمان اسلامی معاشرتی طرز عمل سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ یہ کتاب سادہ زبان میں مسلمانوں کو سماجی زندگی کے میدان میں اسلامی تقاضوں کی یاد دلاتی ہے۔ صحیح معاشرت کے بغیر ایک صحت مند اسلامی معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔ اس میں موجود تمام نصیحتیں قرآن و سنت پر مبنی ہیں۔ کتاب میں سب کچھ عملی اظہار کے لئے ہے، اسلامی معاشرت کو عملی طور پر اپنائے بغیر قرآن و سنت کی ثقافت ممکن نہیں ہے۔

5. **اشرف الجواب:** یہ ایک اہم کتاب ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مولانا اشرف علی تھانوی کے جوابات کو جمع کیا گیا ہے جو لوگوں کے ذہنوں کو پریشان کرنے والے مختلف سوالات اور مسائل کے متلاشیوں کو دیئے گئے ہیں۔ کچھ لوگ، اگرچہ وہ صحیح عقائد کے حامل ہیں، پھر بھی ان کے لئے کچھ سوالات کا جواب نہیں دیا گیا۔ اس کتاب میں جن موضوعات کو جمع کیا گیا ہے وہ یہ ہیں کہ اللہ بغیر زبان کے کیسے بولتا ہے؟ لوگ کالے پتھر کو بوسہ کیوں دیتے ہیں؟ حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں اعتقاد: حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے موقع پر ریلی نکالنا۔ مختلف مذہبی سوالات کے علاوہ خاندانوں اور معاشرے کے مسائل سمیت کچھ سماجی سوالات بھی شامل ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں مشترکہ سماجی اور مذہبی دلچسپی کے کئی سو ایسے سوالات شامل ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری اور کرار حسین نے "جدیدیت کا جواب" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کتاب میں کچھ عمومی اور بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں جو چیزوں کو دیکھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ اصول اتنے اہم ہیں کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہبی روایت کی تفہیم کے لیے ایک ناگزیر رہنما کا کام کر سکتے ہیں۔

6. **تعلیم الدین:** یہ کتاب اسلامی شریعت اور 'طریقت' کا مکمل جائزہ ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد عبداللہ نے "اسلام کی تعلیم" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ کتاب بذات خود اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کی ایک آسان وضاحت ہے جسے ہر عام شخص پڑھ سکتا ہے۔

7. **مسلم طرز زندگی:** اس کتاب کا ترجمہ اقبال حسین انصاری نے کیا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل چار کتابوں کا مجموعہ ہے جو مختصر لیکن جامع، مفید اور سمجھنے میں آسان ہیں۔ اسلام کے حقوق، 2۔ والدین کے حقوق، 3۔ سماجی زندگی کے آداب اور، 4۔ عام غلطیاں.

یہ پمفلٹس کا مجموعہ ہے جو خاص طور پر ان لوگوں کے لئے لکھے گئے ہیں جو اسلام کے آداب کو سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب عام مسلمان کی رہنمائی کے لیے بھی ہے۔ یہ ہر مسلمان گھرانے کے لئے ہے کہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

8. **فروغ الایمان:** انگریزی میں ترجمہ، جس کا عنوان ڈاکٹر رفیق احمد نے فروع الایمان (ایمان کی شاخیں) رکھا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی معلومات کے لیے ایمان کی تمام شاخوں پر آسان زبان میں وسیع پیمانے پر کتاب لکھی تاکہ وہ حقیقی ایمان کو جان سکیں۔ مولانا تھانوی بھی ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو انہیں اس وقت کے مسلمانوں کے ایمان کے سلسلہ میں معلوم ہوئے اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے کامل ایمان ہونے کا دعویٰ کرنے میں بھی شرمندگی محسوس کرتے ہیں لہٰذا آپ نے ان کی اصلاح کے لئے یہ کتاب تصنیف کی اور اسے عام انسانوں کے لئے مشعل راہ قرار دیا۔

9. **حیات المؤمنین:** مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کتاب کے بارے میں کہا ہے کہ یہ میری زندگی کا کام بھی ہے اور زندگی کا کارنامہ بھی۔ حیات المسلمین یا "مسلمانوں کی زندگی" میں رائج متعدد بیماریوں کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا علاج فراہم کرتے ہیں، جس سے انسان کی جہالت، غربت اور پریشانیوں کا علاج ممکن ہو۔ دنیا کا ہر جسم زندگی میں غلطیاں کرتا ہے۔ مسلم قوم روحانی، اخلاقی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی طور پر کمزور ہو چکی ہے۔ حیات المسلمین میں جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ پوری امت کے لیے ہے۔ درحقیقت یہ حقیقی اور واحد آفاقی علاج ہے اور عام مسلمانوں کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

ان کے علاوہ اشرف علی تھانوی کی قرآن حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم الکلام ادب جیسے شعبوں میں دیگر کتب درج ذیل ہیں۔

1۔ ترجمان دہلویہ ، 2۔ اصلاح ترجمہ ہیرات، 3۔ التفسیر فی التفسیر ، 4۔ الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان ، 5۔ التکشف التصوف، 6۔ الانتباہات المفیدہ، 7۔ الاستبصار فحل الاستغفار، 8۔ الاقتصاد التقلید والاجتہاد، 9۔ حسن الموعظت، 10۔ اشرف المواعظ، 11۔ دعوت عبدیت، 12۔ اشرف البیان لی مافی علوم الحدیث القرآن، 13۔ دنیا و آخرت، 14۔ حیات المسلمین، 15۔ تسنیم مقتر امداد الفتاویٰ، 16۔ مسائل الاسلوک، 17۔ تعلیم الدین، 18 اصلاح انقلاب امت، 19۔ اصلاح الرسوم، 20۔ جمال اطہر، 21۔ فتاویٰ اشرفیہ، 22۔ بہشتی گوہر، 23۔ اسلام اور زندگی، 24۔ اسلامی شادی، 25۔ خطبات حکیم الامت، 26۔ جزاء الاعمال، 27۔ ملفوظات حکیم الامت۔ 28۔ ، اعلاء السنن، 29۔ التعرف الی التصوف، 30۔ اور مثنوی مولانا روم۔

حضرت تھانویؒ کی کتابیں علمی تحقیقات کا خزانہ اور نکات ظاہری و باطنی سے لبریز ہیں، تحریریں اثر انگیز ہیں ان تحریروں میں آیات کریمہ کی تفسیر، احادیث شریفہ کی شرح اور فقہ کے باریک اور مشکل مسائل کے جواب، سلوک و طریقت کے نکتے، اخلاقی فضائل و رذائل کی حکیمانہ تحقیق اور ان کے حصول و ازالہ کی تدابیر اور زمانہ حال کے شکوک و شبہات کے جوابات سب موجود ہیں، آپؒ کی کتابوں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ کے سامنے سارے مسائل، دلائل اور مواد رکھ دئے گئے ہیں اور آپ اسے قرینہ اور سلیقہ سے رکھتے جارہے ہیں، بہت ہی عمدہ طریقہ سے کتابوں کو ترتیب دیا اور نقلی، عقلی دلائل اور اخلاص کی خوشبو سے سنوارا ہے، مزید براں یہ کہ تقریر اور تحریر کو احتیاط کے وسیع دامن میں پناہ دی اور اسے غلو کے مرض سے بچا کر رکھا جو آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت تھانویؒ کو اللہ رب العزت نے استغناء کے جوہر سے بڑا حصہ عطا کیا تھا، اتنی کثیر اور مفید کتابیں لکھنے کے باوجود ان سے مالی نفع حاصل نہ کیا، اپنی تمام کتابوں کے طباعت کے حقوق اپنے لئے خاص نہ کئے اور ہر خاص و عام کو عام اجازت دی کہ جو بندہ چاہے آپؒ کی کوئی بھی کتاب چھاپ سکتا ہے۔ اب اس سے زیادہ اخلاص، للّٰہیت، فیاضی، اور استغناء کی مثالیں کیا ہو سکتی ہے حالانکہ اگر آپ چاہتے تو صرف کتابوں کی طباعت سے لاکھوں کی آمدنی کر سکتے تھے۔

خود ایک بوریہ نشیں اور تنہائی پسند درویش تھے مگر بڑے بڑے دولت مند اور اصحاب علم و فضل آپ کی خانقاہ امدادیہ پر ہمہ وقت کسب فیض کے لئے نیاز مندانہ موجود ہوتے، یہ خانقاہ علم و معرفت اور روحانیت کی منبع تھی اور آپ کی زندگی اتباع سنت کا زندہ و اعلی نمونہ تھی، آپ کی گفتگو علم و معرفت کا سمندر، آپ اپنے مواعظ کے ذریعہ عقائد بد کی اصلاح کا بہت ہی اہتمام فرماتے۔ آپ کا اخلاص، تقوی، تفقہ فی الدین، بے لوث خدمات، شرعی علوم میں مہارت و بصیرت، راست بازی اور بے لوث رشد و ہدایت اپنوں اور غیروں کے یہاں مساوی طور پر مسلم ہے جس کی نظیر بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔

3.3 مولانا تھانوی کا نظریہ تعلیم

تعلیم کے سلسلے میں حضرت تھانویؒ کا فلسفہ یہ تھا کہ قوم اچھے انسان پیدا کرے اس لئے کہ اچھا شہری اور عمدہ انسان ہی ایک اچھے معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے اور یہ کام ایک سچے، پکے مسلمان سے ہی ہو سکتا ہے، اور اس کے لئے انسانوں کی عام طور پر اور مسلمانوں کی خاص طور پر تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے چنانچہ آپ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "بزرگ بننا بہت آسان ہے مگر انسان بننا بہت مشکل ہے"۔ آپؒ تعلیم کے ساتھ اصلاح معاشرے کا بہت اہتمام فرماتے، اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ آپ کے خطبات کا مجموعہ 27 جلدوں میں ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان نے شائع کیا اور آپ کے اصلاح معاشرت کے منتشر مضامین کو مفتی تقی عثمانی نے "اصلاح انقلاب امت" کے نام سے المعارف کراچی سے شائع کیا ہے اور اشرف السوانح، میں مرتبین نے سترہویں باب کو اصلاح معاشرت کا نام دیا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی کتابیں، ملفوظات اور خطبات کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ آپؒ دینی علوم کے ساتھ ساتھ دور جدید میں عصری علوم کے بھی قائل تھے، اور اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ طلبہ انگریزی، سائنس، طب اور دوسرے علوم بھی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن آپ کی کوشش ہوتی کہ کوئی بھی طالب علم بے دین نہ ہو، اور مغربی تہذیب و تمدن اختیار کرنے سے بچے تاکہ نسل اسلامی انگریزی و استعماری عریانیت، فحاشی، دہریت اور دوسرے موذی کردار سے محفوظ رہے، آپ نے کبھی بھی مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے سے نہیں روکا، ہاں البتہ اس راستہ کو اختیار کرنے سے منع کیا ہے جس پر چل کر لوگ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منحرف ہو جاتے ہیں۔

3.3.1 مولانا تھانویؒ اور تعلیم نسواں

قرآن کریم کا آغاز تعلیم کی اہمیت سے ہوتا ہے، قرآن کی پہلی آیت **اقراء بسم ربک الذی خلق**۔۔۔ میں اللہ رب العزت

نے تعلیم کی اہمیت کو بیان کیا اور جا بجا تعلیم کی تلقین کی ہے چنانچہ ارشاد باری ہے: **قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون** (اے نبی ﷺ آپ کہ دیجئے کہ کیا اہل علم اور ان پڑھ برابر ہو سکتے ہیں ؟)، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں سیکڑوں مقامات پر عالم کی برتری کو بیان کیا گیا ہے، ان کی سیادت اور امارت کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مسلمان مرد، عورت، جوان، بوڑھا، صحت مند، بیمار، شہری اور دیہاتی سب پر تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے، سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں، اگر ہم معاشرہ کو ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں تو کسی بھی فرد یا جماعت کو حصول تعلیم سے روکنے ک بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ عورتوں کی تعلیم وتربیت کے قائل تھے، بلکہ اس کے لئے بہت فکر مند رہتے تھے، اس فکر کا نتیجہ تھا کہ "بہشتی زیور" نامی کتاب تحریر فرمائی تاکہ خواتین بھی دینی علوم سے بہرہ آور ہو سکیں اور اپنے بچوں کی تربیت بھی بحسن و خوبی کر سکیں، اور معاشرہ خیر القرون کے طرز پر پھر سے چلنے لگے اور امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے، اس مقصد کے لئے حضرت تھانویؒ نے اس کتاب میں اسلامی تاریخ، تدبیر خانہ داری اور علم حفظان صحت وغیرہ کو بطور نصاب شامل کیا ہے، روزہ، نماز، حج، شرک وبدعت، کفر وغیرہ عنوان دینی علوم کے طور پر شامل ہیں۔

عورتوں کے لئے تعلیم کا مقصد عقائد، اخلاقیات، معاملات، معاشرت اور معیشت کو درست کرنا ہے تاکہ ان کی گود میں پرورش پانے والی نسل نو مکمل طور پر حسن سیرت اور عمدہ تعلیم سے آراستہ ہو کر امن عالم کے لئے ضمانت اور سسکتی انسانیت کے لئے دادرس منہج مبوت کے مطابق ہوں، اور وہ عالمی طور پر اسلام کے مبلغ ثابت ہوں۔

رہا مسئلہ دور جدید میں عورتوں کی عصری علوم وفنون کی تعلیم کا، اس سلسلے میں حضرت تھانوی سے کئی روایتیں ملتی ہیں، 1-عورتوں کو صرف قرآن کی تعلیم اور امور خانہ داری سے آراستہ کیا جائے (جیسا کہ بہشتی زیور کے لکھنے میں ان کا مقصد دکھائی دیتا ہے)، 2-اس تعلیم کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے جس کی وجہ سے ادب کے نام پر گندے ناول گھروں میں جگہ بنالیں۔ 3-اس مغربی تعلیم کی اجازت نہیں دی جاسکتی جس کے سبب بچے یہودی، نصرانی اور عیسائی بن جائیں اور جس کی وجہ سے بے حیائی عام ہو جائے۔ 4۔ میں جدید تعلیم کی مخالفت نہیں کر سکتا اگر مناسب انتظام ہو، یعنی پردہ وغیرہ کا نظم ہو۔

اس طرح کے خیالات کا اظہار حضرت تھانویؒ نے اپنی متعدد کتابوں ورسالوں میں کیا ہے، ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی نے حصول تعلیم سے بچیوں کو بالکل نہیں روکا، اگر قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ نے عام طور پر تعلیم حاصل کرنے پر ابھارا ہے، البتہ قرآن کریم نے پردہ کا حکم دیا ہے، اور بے راہ روی سے روکا ہے نیز ایسی تعلیمات سے بھی منع کیا ہے جو مسلمانیت سے نکال کر یہودیت، عیسائیت اور باطل کے راستوں پر لے جائے یا اسلام کے صاف ستھرے رستہ چھوڑ کر بے راہ روی کے مغربی طرز پر چل پڑے، حضرت تھانویؒ نے بعینہ اسلامی طریقہ پر چل کر تعلیم حاصل کرنے کی طرف رغبت دلائی ہے۔

3.3.2 مولانا تھانوی بحیثیت مذہبی مصلح

بیس ویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں مغربی فلسفے وتہذیب نیز مغربی طرز زندگی کے اثرات مسلمانوں میں تیزی سے پھیل

رہے تھے جس کے نتیجہ میں ان میں مذہبی تعلیم کا فقدان نظر آتا ہے۔ مغرب کی ترقی، تہذیب و ثقافت نے انہیں متاثر کر رکھا تھا اور جہالت کے قریب لے آئی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کی معاشی حالات بھی خستہ تھے اور مغربی طرز تجارت میں بینکاری اور سودی نظام نے مسلمانوں کو اور بھی زدوکوب کر رکھا تھا نیز ان طریقہ کار کی وجہ سے وہ اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے جارہے تھے یہ ایسے حالات تھے جنہوں نے مولانا تھانوی کے لئے پریشانی پیدا کر دی تھی، مولانا تھانوی اصلاح پسند تاجر تھے اور مغربی تہذیب مسلمانوں کو اس طریقہ عمل سے الگ تھلگ کر رہی تھی۔ قرآن و حدیث اور مسلمانوں کو غیر اسلامی طریقوں کی طرف راغب کر رہی تھی۔ لہٰذا مولانا تھانوی نے ایک طرف معاصر مسلمانوں کے مذہبی نظریات کی اصلاح کی مہم شروع کی اور دوسری طرف ان کی زندگیوں سے بدعنوانیوں اور غیر اسلامی رسوم ورواج کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

مولانا تھانوی نے غیر اسلامی نظریات کو ختم کرنے کے لئے درس و تدریس، تبلیغ نیز اپنی تحریروں اور لیکچرز کو ذریعہ بنایا۔ عوام کے سامنے مختلف مسائل اپنا پر مذہبی نقطہ نظر پیش کیا جس سے فکر اسلامی کی حقیقی عکاسی ہوئی اور عام مسلمانوں نے آپ کی ذہانت، تربیت اور تدریس کے انقلابی طریقے سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا گر سیکھا، جس سے ان میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے محبت پیدا ہوئی۔ آپ نے ان مسلمانوں کے ذہنوں کو صاف کیا جو مغربی نو آبادیاتی طاقتوں سے فکری طور پر جڑے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی تقاریر اور تحریروں کی شکل میں انہیں تعلیم دی۔ روحانی تربیت اور جدید دور کے تمام مذہبی اثرات، اسلامی تعلیمات کے تمام میدانوں میں آپ کی خدمات آپ کو اسلام کا صحیح العقیدہ استاذ بناتے ہیں۔

مولانا تھانوی نے دین میں ہر برائی اور بدعت کے خلاف جنگ لڑی اور اسلامی تعلیمات کو قرآن و حدیث کی صحیح روشنی میں پیش کیا۔ آپ مسلمانوں کی جہالت سے بہت فکر مند تھے، کیوں کہ وہ غیر اسلامی اعمال پر عمل پیرا تھے انتہا یہ تھی کہ وہ اسے نیک عمل سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس امر کو ختم کرنے کے لئے بہت سے لیکچر دیے اور بہت سی اصلاحی کتابیں لکھیں۔ ان کی کتاب حفظ الایمان میں خاص طور پر اس طرح کے غیر اسلامی اعمال اور رسومات کی مذمت کی گئی ہے جیسے کہ قبر کی عبادت کرنا، اللہ کے سوا کسی اور سے دعا مانگنا، نبی اکرمؐ اور نیک لوگوں کی موجودگی پر یقین رکھنا وغیرہ۔ ایک اور کتاب جس کا عنوان "اغلاط العوام" ہے، لوگوں میں تمام غیر اسلامی عبادات کے عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ایک پرجوش اور مخلصانہ کوشش ہے۔ اس کتاب میں ایمان، بدعت اور عقیدے میں شفاعت، اور لین دین کے تصور کی خاص طور پر مذمت کی گئی ہے۔ مولانا تھانوی کی متوازن سوچ تمام دینی احکام کو ان کی مناسب جگہ پر بغیر کسی تفضیل کے برتنے کا حکم دیتی ہے۔

دین اور دینی علوم کے میدان میں اشرف علی تھانوی نے تقریباً ان تمام امور پر توجہ مرکوز کی جن میں ایک مسلمان اپنے علم کی کمی کی وجہ سے غلطیاں کرتا ہے، اسلام اور ایمان، اسلامی تعلیم، قرآن کی تعلیم اور اس کی تلاوت، اللہ پر تقدیر اور توکل پر ایمان، وقت کی پابندی اور نماز کی باقاعدگی، زکوٰۃ کی ادائیگی، صدقہ و خیرات، انسانی امداد، روزہ، حج، اللہ کے لیے قربانی، مسلمانوں کے حقوق وغیرہ۔

3.3.3 مولانا تھانوی کا سیاسی نقطہ نظر

مولانا اشرف علی تھانوی سیاست دان نہیں تھے اور نہ ہی انہیں فعال سیاست میں دلچسپی تھی۔ لیکن ہاں انہوں نے سیاست دانوں کو ان کے مذہبی نقطہ نظر سے جانچنے اور اس کے مطابق ان کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی اور وہ ملک کی سیاست سے بخوبی واقف تھے۔ اس وقت ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ علماء دیوبند نے جمعیۃ العلماء کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی لیکن مولانا تھانوی نے اس کی مخالفت کی، اس کے برعکس جمعیت العلماء اسلام کے نام سے مولانا شبیر احمد عثمانی نے علماء کی ایک اور جماعت کی بنیاد رکھی تھی جس کی آپ نے حمایت کی۔ مارچ 1940ء کی تاریخی قرارداد لاہور کی منظوری سے قبل بہت سے نامور علماء نے ہندوستانی مسلمانوں کے، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وجود کے تحفظ کے لیے علیحدہ مسلم وطن کے نظریہ کو پیش کیا تھا۔ مولانا تھانوی بھی ان علماء میں شامل تھے جو چاہتے تھے کہ مسلمان خود کو جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے الگ کریں اور ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کریں جس میں مسلمان اقتدار کا استعمال کر سکیں اور آزادانہ طور پر اپنے عقیدے اور ثقافت کی تشہیر کر سکیں۔

جہاں تک سیاسی نظریات کا تعلق ہے تو مولانا تھانوی مسلم لیگ کے پرزور حامی تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ایک آزاد علیحدہ ریاست ملنی چاہیے جہاں مسلمان اپنا حق خودارادیت استعمال کر سکیں اور اسلامی روایات اور تعلیمات پر بغیر کسی رکاوٹ کے آزادانہ ماحول میں صحیح روح کے ساتھ عمل کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم ثقافت اور معاشرے، معیشت و تجارت، دستکاری اور صنعت کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست ضروری اور ناگزیر ہے۔

3.4 ابوالکلام آزاد

جنت نشان ہمارے ملک ہندوستان نے کئی طرح کے نشیب و فراز دیکھے ہیں، چاہے انگریزوں کا جور و ستم ہو یا کسی اور کا جبر و استبداد ہر بار یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کو اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی ہے، ہر مشکل وقت میں ملک و ملت کے ساتھ رہے اور اس کی ترقی کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی، اس راہ محبت میں اپنی ساری توانائی صرف کر دی، اس میدان عمل میں سرخرو ہونے والے جیالوں کی تعداد کا شمار بہت ہی مشکل کام ہے، ان ممتاز شخصیات میں ایک سنہرا نام ہے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا، آپ نے ہندوستانی قوم کے لئے ایثار و محبت کی سنہری تاریخ رقم کی ہے۔ آپ ہندوستان کے عظیم المرتبت قائد، مدبر سیاستداں، صاحب طرز منفرد انشاء پرداز، اپنے وقت کے مُفسّر، مفکّر، مؤرخ، مُحقّق، خطیب، مُجاھد، صحافی، شاعر، ادیب، کانگریس کے مایہ ناز لیڈر، جنگِ آزادی کے عظیم قومی رہنما و عَلَم بردار اور عبقری شخصیت کے مالک تھے۔

3.4.1 تعلیم و تربیت

مولانا آزادؒ مکہ مکرمہ میں باب السلام کے قریب "خودوہ" نامی مقام پر بتاریخ 11/ نومبر 1888ء کو پیدا ہوئے، والد محترم نے آپ کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا، مولانا آزادؒ نے پوری زندگی یہ نام کہیں بھی استعمال نہیں کیا، سنہ 1900ء میں عبدالرزاق کانپوری کے نام ایک

خط میں اپنا نام "غلام محی الدین آزاد" اور مجلہ مخزن 1902ء میں "ابو الکلام آزاد دہلوی" لکھا، اور 1912ء کے الہلال میں بحیثیت مدیر آپ کا نام "احمد المکنی بابل آزاد دہلوی" تحریر تھا، اور آپ کی دوسری کتابوں میں ابو الکلام ملتا ہے اور اسی نام کو شہرت تمام حاصل ہے، والد محترم کا نام خیر الدین تھا۔

مولانا آزاد نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کبھی بھی باقاعدہ مدرسہ یا اسکول کا رخ نہ کیا بلکہ گھر رہ کر تعلیم حاصل کی، ان کی سب سے پہلی معلمہ خالہ محترمہ تھیں، بچپن میں ہی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے ماں کی ممتا آپؒ کی خالہ محترمہ سے ملی، مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران آپ ناظرہ قرآن کریم مکمل کر چکے تھے، اور استاذ محترم شیخ حسن سے علم قرآت بھی حاصل کر چکے تھے، آپ کا خاندان 1895ء میں ہندوستان منتقل ہو گیا اور کلکتہ شہر میں آباد ہوا، والد محترم نے پرانے طرز تعلیم (پرانے طرز تعلیم میں طالب علم کو پہلے زبان فارسی سے آراستہ کیا جاتا تھا، اس کے بعد عربی زبان سکھائی جاتی، ان دونوں زبانوں میں قدرے مہارت کے بعد فلسفہ، جیومیٹری، ریاضیات، الجبرا، اور عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔) کو اپنے بیٹے کے لئے اختیار کیا اور جدید طریقہ تعلیم سے احتراز کیا تا کہ بچہ خراب نہ ہو۔

عصر جدید کے مضامین کو گھر پر پڑھانے کا انتظام کیا گیا اور گھر پر پہلے استاد ان کے والد صاحب تھے، اور علوم جدیدہ کو گھر پر پڑھانے کے لئے اس وقت کے ماہر علم و فن اساتذہ کا انتخاب کیا گیا، ان ادب کے شہ پاروں میں محمد یعقوب، شمس العلماء مولانا سعادت حسین، مولوی نذیر حسین، مولوی محمد ابراہیم اور مولوی محمد عمران وغیرہم کے نام شامل ہیں۔ آپؒ نے سولہ سال کی عمر میں ہی نصاب تعلیم جامعہ نظامیہ مکمل کر لیا، آپ کو احادیث سے بہت لگاؤ تھا چنانچہ حدیث کے مطالعہ نے ایک اہم رول ادا کیا، حدیث پاک کی مشہور کتاب ترمذی شریف اور نصاب جامعہ حضرت مولانا محمد شاہؒ سے پڑھا، حکیم سید باقر حسین لکھنوی جب شہر کلکتہ تشریف لائے تو حضرت مولانا آزادؒ کچھ مہینوں کے لئے ان کی شاگردی میں داخل ہوئے اور یونانی طبی نظام کا مطالعہ کیا اور اس سلسلہ علم و فن میں مزید کامیابی حاصل کی۔

مولانا آزاد میدان صحافت میں

آپ بچپن ہی سے نہایت زیرک و ذہین تھے اور کم عمری ہی سے عقل و شعور کی پختگی نمایاں تھی، آپ نے دورانِ تعلیم ہی سے اخبار و جرائد کی اشاعت کا عمل شروع کر دیا تھا، چنانچہ 1899ء میں گیارہ سال کی عمر میں آپ نے کلکتہ سے ماہنامہ "نیرنگ خیال" جاری کیا، اسی طرح 1901ء میں ہفتہ وار "المصباح" جاری کیا اور 1902ء میں ہفتہ وار "احسن الاخبار" جاری فرمایا۔ اسی طرح "لِسان الصّدق، النّدوہ، وکیل، دارالسّلطنت، الہلال، البلاغ، پیغام" وغیرہ جاری فرمایا۔ ان اخبارات و رسائل میں سب سے زیادہ شہرت ہفتہ وار "الہلال" سے ملی، جو 13/ جولائی 1912ء میں شائع ہوا۔ اس اخبار کی سحر بیانیوں نے ہزاروں، لاکھوں سینوں میں آزادی وطن کی آگ جلادی، لوگ صبح سے ہی اخبار کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس کی تعداد اشاعت 52 ہزار کاپی تھی۔ بالآخر برطانوی حکومت نے 1914ء میں اس اخبار پر پابندی عائد کر دی اور انہوں نے 18/ نومبر 1914ء میں اس کی ضمانت بھی ضبط کر لی۔ اس کے بعد آپ نے "البلاغ" اخبار جاری کیا، جن میں ہندو مسلم بھائی چارگی کا جوش پیدا کر دیا گیا، مگر انگریزی حکومت کی آنکھ میں وہ بھی چبھنے لگا اور انہوں نے اس اخبار پر بھی پابندی عائد کر دی۔ الغرض آپ بہت سے اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ مولانا آزادؒ کو اس مقام تک

پہنچانے میں ان کے والد صاحب کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔

مولانا آزاد کی تصانیف

مولانا آزاد ایک کامیاب سیاست داں کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ ادیب، باکمال صحافی، بلند پایہ مفسر قرآن کریم اور کہنہ مشق خطیب بھی تھے۔ بوقت ضرورت شاعری میں کمال پیدا کیا، اصلاحی مضامین لکھے، تفسیر قرآن پاک لکھی، ادبی اور تحقیقی مقالات سے دنیائے علم و ادب کو سیراب کیا، آپ کی اہم تصانیف میں ترجمان القرآن، غبار خاطر، تذکرہ، قرآن کا قانون عروج و زوال، شہید آعظم، انڈیا ونس فریڈم وغیرہ شامل ہیں۔ سیاست کی ہنگامہ خیزیوں میں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر جیسا عظیم کام یقیناً مشکل کام ہے، پھر بھی آپ نے قرآن پاک کے ترجمہ کی پہلی جلد 1931ء میں تیار کی، دوسری جلد کا دیباچہ فروری 1945ء میں ضلع احمد نگر کے قید خانہ میں لکھا گیا، پہلی جلد "سورۃ فاتحہ" سے "سورۃ انعام" تک پر مشتمل، جبکہ دوسری جلد "سورۃ اعراف" سے "سورۃ مومنون" (18 واں پارہ) تک پر مشتمل ہے، تیسری جلد فرصت نہ ملنے سے مکمل نہ ہو سکی۔ آپ کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت نے "ترجمان القرآن" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا، اور سابق وزیر آعظم ہند اٹل بہاری واجپائی صاحب کے دور میں اسے ہندی میں بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔

"غبار خاطر" مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام خطوط نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے۔ یہ خطوط قلعہ احمد نگر میں 1942ء تا 1945ء کے درمیان میں زمانہ اسیری میں لکھے گئے۔ مولانا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید و بند میں گذرا مگر اس بار قلعہ احمد نگر کی اسیری ہر بار سے سخت تھی کیونکہ اس بار نہ کسی سے ملاقات کی اجازت تھی اور نہ کسی سے خط کتابت کرنے کی۔ اس لیے مولانا نے دل کا غبار نکالنے کا ایک راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اور خطوط لکھ کر اپنے پاس محفوظ کرنا شروع کر دیے۔ مولانا نے خود اسی مناسبت سے ان خطوط کو غبار خاطر کا نام دیا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں 1۔ البیرونی اور جغرافیہ عالم، 2۔ قول فیصل، 3۔ انسانیت موت کے دروازے پر، 4۔ آزاد کی کہانی (خود نوشت) مرتبہ ملیح آبادی، 5۔ India Wins Freedom، 6۔ قرآن کا قانون عروج و زوال، 7۔ اصحاب کہف اور یاجوج و ماجوج، 8۔ مسلمان عورت، 9۔ حقیقت صلوۃ، 10۔ صدائے حق، 11۔ مقام دعوت، 12۔ اسلام میں آزادی کا تصور، 13۔ افسانہ ہجر و وصال، 14۔ آزادی ہند، 15۔ مسئلہ خلافت، 16۔ ولادت نبوی، 17۔ ارکان اسلام، 18۔ خطبات آزاد، 19۔ رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات وغیرہ اہم تصانیف شامل ہیں۔

3.4.2 مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات

قوم کی انتھک کوششوں کے بعد ملک 15 اگست 1947ء کو استعمار کے ظلم ستم اور غلامی سے آزاد ہوا اور ملک کو چلانے کے لئے حکومت کا قیام اور وزارتوں کی تشکیل ہوئی تو مولانا آزادؒ کو آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، اس عظیم عہدے پر 15 اگست 1947ء کو فائز ہوئے اور 22 فروری 1958ء تک مسلسل بر قرار رہے۔

اس عہدہ کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے آپ نے تعلیم کے میدان میں انقلاب برپا کر دیا، شعبہ تعلیم کو نئی جہت عطا کی، آپؒ کی دور رس نگاہوں نے بہت پہلے ٹکنالوجی کی اہمیت و افادیت کو محسوس کر لیا تھا آپ نے اپنی رہنمائی و قیادت میں وزارت تعلیم کے تحت سب سے پہلا کام "انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی" کا قیام عمل میں لایا، یہ سنہ 1951ء میں سرزمین کلکتہ میں قائم کیا گیا، اور اعلی تعلیم (ہائر ایجوکیشن) میں شفافیت اور انتظامی خدمات کے لئے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) کو 1956ء میں قائم کیا اور اس کی افادیت کو طلباء اور اسکالر آج بھی محسوس کرتے ہیں، اس کے علاوہ آپ نے للت کلا اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی جیسے ادارے بھی دئے ہیں ملک کے اس عظیم و بے مثل سپوت کی خدمات کا حکوت ہند نے اعتراف کیا اور آپؒ کی یوم پیدائش 11 نومبر 1888ء کو یوم تعلیم منانے کا اعلان کیا۔

اگر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ انکے نظریات کی بنیاد چار امور پر استوار ہے۔ ایک ذہنی بیداری، دوسرے اتحاد و ترقی، تیسرے مذہبی رواداری اور چوتھے عالمی اخوت، مولانا کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا ہونا چاہئے، مولانا آزاد کہا کرتے تھے کہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے سمجھا ہے کہ ہمارے لئے ہر حال میں سب سے ضروری کام عوام کی تعلیم ہے یہی کام سب سے زیادہ اہم ہے اور اسی کام سے ہمیں دور رکھا گیا۔ مولانا آزاد نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام میں بحیثیت وزیر تعلیم اس زمانے میں ملکی و ریاستی سطح پر تعلیمی سرگرمیوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے مرکزی، ریاستی سطح پر ملک میں تعلیم کو عام کرنے کیلئے کئی اہم اقدام اٹھائے۔ نئے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے تعلیم و تحقیق کے جو مراکز قائم کئے ان میں سنگیت اکیڈمی، ساہتہ اکیڈمی اور للت اکیڈمی قابل تعریف ہیں۔

انہوں نے تعلیم نسواں، پروفیشنل تعلیم اور تعلیم صنعت و حرفت کو بھی اہل وطن کیلئے ضروری قرار دیا۔ ان کی کوششوں سے 1948ء میں یونیورسٹی آف ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ملک میں اعلیٰ تعلیم کی سہولیات مہیا کرانا تھا جو اس زمانے میں نہیں تھی۔1956ء میں انہوں نے UGC کو قائم کر کے اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل عطا کئے۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کے اس قول سے متفق تھے کہ اگر ہندوستانی یونیورسٹیاں اپنے کام کو بخوبی انجام دیں تو یہ ملک کی ترقی میں ایک اہم قدم ہو گا۔ آزاد نے دیگر علوم فنون کے ساتھ فنی تعلیم کی ضرورت بھی محسوس کی اور اس کیلئے آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا اور ملک بھر میں ٹیکنیکی تعلیم کے نئے شعبہ قائم کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ مولانا آزاد کے ان کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابو سلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

"تعلیمی معاملات میں انھوں نے نہایت ہی دانش مندانہ اقدام کئے۔ ان کا خیال تھا کہ مشرق اور مغرب کی مشترکہ آگہی سے ہی صحیح علم حاصل ہوتا ہے، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کمیشن بٹھائے اور ان کمیشنوں کی سفارشات پر عمل کر کے ملک میں تعلیم کا معیار بلند کیا، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کیا، اور اس کے ذریعے ملک میں یونی ورسٹیوں کا جال بچھایا۔ مولانا آزاد نے عورتوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی کیوں کہ تعلیم یافتہ نسل بلا تعلیم یافتہ ماؤں کے پیدا نہیں ہو سکتی، بچے کی تعلیم و تربیت میں ماں کا اہم رول ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ماں تعلیم یافتہ ہے تو اولاد بھی تعلیم یافتہ ہو گی"۔

ارمغان آزاد میں ہے:

"تعلیم کے زیور سے عورتوں کو آراستہ کرو، اور ان میں اس کی استعداد پیدا کرو کہ وہ اپنی اولاد کی خود عمدہ تربیت کر سکیں۔ بچپن ہی سے ان میں عمدہ اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کے بعد ہندوستان میں جو نسل نظر آئے گی وہ بے شک تعلیم یافتہ قوم کے لئے باعث فخر اور ملک کے لئے باعث شرف ہوگی"۔

انہوں نے 1951 میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کو قائم کیا جو بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور کے نام سے مشہور ہوئی۔ مولانا آزاد پہلے شخص تھے جنہوں نے ہندوستان میں تعلیم بالغان سے لوگوں کو متعارف کروایا۔ ملک کے ادبی اور تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھنے کیلئے انہوں نے شہروں میں ایجوکیشنل لائبریریاں قائم کیں جہاں بیٹھ کر لوگ اخبارات پڑھتے اور رسالوں کا مطالعہ کرتے کلکتہ کی نیشنل لائبریری مولانا آزاد کی کوششوں کا ثمرہ ہے جو قابل دید ہے۔ مولانا کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی و توازن پر مشتمل تھی تاکہ نئی نسل میں جہاں سائنس کا صحیح استعمال آجائے، وہیں اس کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول بھی ممکن ہو جو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبردار ہونے کے باوجود مولانا نے سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی کی تعلیم کو ملک کی ترقی کیلئے ناگزیر سمجھا، ان کے خیال میں جو اچھا ہے، جہاں سے ملے لو اور جو خراب ہے، جہاں بھی ہو اسے چھوڑ دو، یہی مولانا آزاد کا لائحہ عمل تھا اور زندگی بھر وہ اس پر کاربند رہے۔

3.4.3 مولانا آزاد کے سماجی نظریات

مولانا آزاد کے سماجی نظریات اسلامی شریعت کے عین مطابق تھے۔ وہ فطری طور پر معاشرتی اجتماعیت کو پسند کرتے تھے، آپ انسانی معاشرہ میں بغیر کسی تمیز و تفریق کے خوش گوار ہم آہنگی و تعلق کے قائل تھے۔ آپ کی اکثر تحریریں اور تمام تر سماجی خطبات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ ایک ماہر سماجیات کی حیثیت سے خارجی اور داخلی دنوں طرح کے فوائد کو پیش نظر رکھ کر متحد اور متفق معاشرتی زندگی کے حق میں تھے۔

سماج کے تعلق سے مولانا کا تصور دراصل قرآن کے سماجی تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ باہم میل جول کی زندگی کو سب سے بہتر زندگی تصور کرتے تھے۔ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک میں ایک ایسے معاشرے کی تخلیق پر وہ زور دیتے تھے جس میں تمام لوگ آپسی اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کریں اور ان کی معاشرتی اجتماعیت کو زیادہ سے زیادہ پختگی حاصل ہو۔ چنانچہ مولانا آزاد کا تصور سماجیات انسانی زندگی کی بہتری اور خوش گوار زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط سے متعلق ایسے نکات پیش کرتا ہے جس میں درج ذیل خصوصیات موجود ہوں۔

1. وحدت نسل انسانی اور فرقہ وارانہ اتحاد و یگانگت ہو، رنگ و نسل، وطن و علاقہ، زمان و مکان اور دیگر کسی پر انسانوں کے مابین کسی طرح کی تفریق بہر حال نہ ہو، کیوں کہ سبھی انسانوں کی پیدائش آدم و حوا سے عمل میں آئی ہے۔
2. خیر کی بالادستی اور شر کی پسپائی ہو۔ سماج کے تمام افراد باہمی محبت، اخوت، مودت، معاونت اور ایک دوسرے کے تئیں حسن ظن

کی نعمت سے لیس اور باہم بدگمانی، تجسس، بغض وحسد اور غیبت وبہتان تراشی کی لعنتوں سے محفوظ ہوں، نیز وہ آپس میں خوش دلی سے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہوں۔

3. جس کا ہر فرد بشر دوسرے فرد بشر کے لیے آئینہ کی طرح ہو اور اس کی پاکیزگی کو تر و تازہ رکھنے کے لیے اس میں کچھ افراد ہوں جو دوسروں کو اچھائی کا حکم کریں اور برائیوں سے روکیں، تاکہ عذاب سے محفوظ اور دعا کی قبولیت کی نعمت سے اس کا ہر فرد سرفراز ہو سکے۔

4. حقیقی سماجی زندگی کا تیقن اس صفت انسانی پر منحصر ہے کہ اس کے تمام افراد باہم شیر وشکر اور مخلص وبے غرض ہوں۔ ہمدرد و غم خوار ہوں۔ زبان وہاتھ کے شر کے حوالے سے سب ایک دوسرے سے محفوظ ومامون ہوں۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہوں وہی دوسرے بھائی کے لیے پسند کرتے ہوں۔ منافقت کا اس میں دور دور تک گزر نہ ہو۔ بیوہ اور مسکین کی ہمہ جہت ضروریات کا بے لوث انتظام ہو۔

پڑوسی کے حقوق کا بہر حال لحاظ رکھا جاتا ہو، مسلک و منہج، دین ودھرم اور نظریہ ورجحان کی تمیز کے بغیر ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے حقوق کو بہتر طریقے پر ادا کرتے ہوں اور سارے انسان آپس میں بھائی بھائی کی تصویر بن کر زندگی گزار رہے ہوں۔

3.5 مولانا آزاد کے سیاسی نظریات

مولانا آزادؒ نے وطن عزیز ہندوستان کی فلاح وبہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کی، ہر محاذ پر قوم کی رہبری کے لئے آپ صف اول میں نظر آتے ہیں، چنانچہ جب دیکھا کہ انگریز حکومت اور اس کے کارندوں نے اپنی حکومت کو دوام دینے کے لئے ہندوستانی قوم میں تفرقہ اور نفرت کا بیج بویا ہے اور اس سے ملک کا نقصان ہو رہا ہے تو آپ اس بیماری سے ملت کو بچانے کے لئے آگے بڑھے اور اپنی سیاسی زندگی کی شروعات باضابطہ طور پر 1912ء میں اخبار "الہلال" کے ذریعہ کی۔ الہلال کی یکم جنوری 1913ء کی اشاعت میں آپ لکھتے ہیں کہ "اسلام نے تنگ نظری اور جنسی ومذہبی تعصب کی تعلیم نہیں دی ہے۔ وہ انسانی اوصاف، خصائل کے اعتراف اور انسانی رحم ومحبت کے جذبات کو محض تمیز، مذہب وقوم کے تابع نہیں کر دیتا، اسلام نے ہم کو سکھلایا کہ ہم ہر اچھے انسان کا احترام کریں خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو اور کسی بھی قوم کا فرد ہو" مولانا آزاد کی سانسوں میں احترام آدمیت کا جو جذبہ تھا شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ تحریک آزادی کے دوران وہ ملک کے تمام طبقوں میں آزادی کی لہر دوڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا آزاد کے نزدیک سیاست سے مذہب کو الگ کر دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس لیے جہاں وہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے رہے وہیں انہوں نے مسلمانوں سے کبھی یہ نہیں کہا وہ اپنی مذہبی روایات اور تہذیب سے دستبردار ہو جائیں۔

وہ قرآن کی روشنی میں مذہب اور سیاست میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے تاکہ مسلمان بھی ہندوستانی قومی تحریک کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔ مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو ایک دینی فریضہ مانتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک مضمون "ہندوستان کی آزادی اور مسلمان" میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ "دوسروں کے لیے ملک کی آزادی کی جدوجہد کرنا داخل

حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ" یہ وہ تاریخی جملے ہیں جس کے ذریعہ مولانا آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کا صور پھونکا۔ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے لیے کتنے فکر مند تھے اس کا اندازہ ان کے اس تاریخی خطبہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے کانگریس کے 1933 میں منعقدہ ایک خصوصی اجلاس میں دیا تھا۔ مولانا نے کہا تھا "آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو-مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر ہندو-مسلم اتحاد سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہو گا"۔

آپ پہلی مرتبہ 34 سال کی عمر میں یعنی 1923ء میں دہلی کے ایک اجلاس میں کانگریس کے صدر چنے گئے اور ایک سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ دوسری مرتبہ آپ دوسری جنگ عظیم کے وقت 1939ء میں رام گڑھ میں کانگریس کے اجلاس میں صدر منتخب ہوئے اور سات سال 1939ء سے لیکر 1946ء تک قیادت کی۔ دوسری دفعہ کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے رام گڑھ کے اجلاس میں آپ نے کہا تھا کہ "میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی بناوٹ کا ایک ناگریز جزو ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا"، اس کے بعد آپ نے خود اپنی صدارت کو پنڈت جواہر لال نہرو کو سونپ دیا۔ اور 15، اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ سردار پٹیل نے کانگریس کی طرف سے کہا تھا کہ مولانا آزادؒ کے علاوہ کسی کو بھی یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا ہے کہ جو لگاتار سات سال تک کانگریس کا صدر رہا ہو۔ کانگریس میں آپ کے مشوروں کی بڑی اہمیت تھی۔

3.5.1 مولانا آزادؒ کا تصور خلافت

ملک کی آزادی کے لئے مختلف تحریکات معرض وجود میں آچکی تھیں، اسی غرض کے واسطے کانگریس قائم ہو چکی تھی، لیکن اس میں ہندو عنصر غالب تھا، اس کے آغاز میں صدور بھی ہندو تھے، بلکہ متعصب لوگوں کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور تھی جس کو دیکھ کر مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ نے مولانا آزادؒ کی فکر سے روشنی لیتے ہوئے "تحریک خلافت" کی بنیاد ڈالی، اس تحریک نے بہت ہی مختصر وقت میں پورے ہندوستان میں شہرت حاصل کرلی اور مسلمانوں نے اس کا استقبال کیا، مولانا آزادؒ نے اس تحریک میں مولانا محمد علیؒ اور مولانا شوکت علیؒ کے شانہ بشانہ رہ کر کام کیا اور حق ادا کیا، آپؒ کی تقریر میں اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اس قدر درد ہوتا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خوابیدہ دلوں میں صور پھونکنے کا کام کرتا۔

تحریک خلافت کا بنیادی نقطہ مسلمانوں کو بیدار کر کے جہاد کے لئے تیار کرنا اور ہندوستان میں آزادی کے بعد اسلامی ریاست قائم کرنا تھا۔ کانگریس بھی موجود تھی آزادی مقصد بھی تھا مگر دونوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ کانگریس کے خیال میں تحریک آزادی میں مسلمانوں کی شرکت ضروری نہیں، چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اس لئے آزادی حاصل کرنا اور اپنی مرضی کی حکومت بنانا ہندوں کا حق ہے، یہی بنیادی اختلاف تھا کانگریس اور مسلم رہنماؤں کے درمیان جس کو محسوس کرتے ہوئے تحریک خلافت قائم کی گئی، لیکن دونوں

جماعتیں اس ایک بات پر متفق تھیں کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا ہے اور ملک کو آزاد کرانا ہے۔ مولانا آزادؒ نے دیکھا کہ ہندو اور مسلمان آزادی کی خواہش دونوں طرف برابر جوان ہے تو پھر دونوں کے راستے الگ الگ نہ ہونا چاہیے اور اگر مقصد اصلی کو حاصل کرنے کے لئے متحد ہو جائیں تو منظم انداز میں انگریزوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اس لئے مولانا نے طرفین کے درمیان صلح کا راستہ شروع کیا اور دونوں جماعتوں میں اتحاد کی فضاء قائم ہوئی اور منظر بدلنا شروع ہوا اور پوری قوت اور اثر انداز طریقے کے ساتھ کام شروع ہوا، مولانا زادؒ کانگریس کے پروگراموں میں شرکت فرماتے اور خلافت کمیٹی کے ساتھ بھی موجود ہوتے، مولانا کے اس بصیرت افروز عمل سے جنگ آزادی میں جان پڑ گئی اور وطن کے دشمن انگریزوں کے جسم سے جان نکل گئی، مردنی ان کے چہروں پر چھا گئی، اس کشمکش میں دشمن بھی سخت جان نکلا اس نے ہمارے درمیان نفاق کا بیج ڈالنے کی کوشش کی اور وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا کہ کانگریس اور خلافت کمیٹی میں اختلاف ہو گیا اور اتنا بڑھا کہ خلافت کمیٹی ختم کر دی گئی اور مسلمان مایوس ہو گئے، لیکن مولانا نے کانگریس میں کام کیا اور اپنے اتحادی نظریہ سے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

مولانا آزاد کی مقبولیت کے بے پناہ اسباب اور بے شمار پہلو ہیں جن کو بہت اختصار کے ساتھ عرش ملسیانی نے اپنی کتاب ''جدید ہندوستان کے معمار مولانا ابوالکلام آزادؒ'' میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''وہ مذہب، سیاست، رسم و رواج ہر میدان میں اجتہاد کے قائل تھے، انھوں نے ہمیں نئی راہیں بتائیں، ہمارے لیے اندھیری راہوں میں شمعیں روشن کیں۔ اتنا بڑا عالم، قدیم و جدید کا اتنا بڑا امتزاج، علوم قدیم و جدید کے ماہر، سائنسی نظر سے دنیا کو دیکھنے والا اس عہد میں ان سے بڑا شاید ہی کوئی ہو، لوگ انھیں امام الہند کہتے تھے، مگر حقیقت میں امام انسانیت تھے''۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا مرحوم کی سماجی اور سیاسی بصیرتوں اور اس ضمن میں ان کی مشعل راہ تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ کیوں کہ وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

3.6 اکتسابی نتائج

- اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:
- اشرف علی تھانوی کی معاشرتی اصلاحات کی کوششیں ان کے مضامین و رسائل کے ذریعہ گھر گھر میں پہنچیں، اور آپ نے بہشتی زیور جیسی کتاب کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کا نظم کیا نیز انہیں اپنی اولاد کی عمدہ تربیت کے لئے مہمیز کیا۔
- مولانا آزاد اور اشرف علی تھانوی کے افکار و نظریات نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی سطح پر حوصلہ افزائی کی اور انہیں مذہب کے ساتھ ساتھ سیاست و اصلاح معاشرہ اور عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور خلافت اور مسلمانوں کو اس تحریک سے ہونے والے فوائد کا علم ہوا۔
- انیسویں صدی میں متعدد تحریکات کے آغاز و ان کی اشاعت و تشہیر اور معاشرے پر ان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مثنوی مولانا روم کس کی تصنیف ہے؟

(a).علامہ شبلی نعمانی (b).سید سلیمان ندوی (c).اشرف علی تھانوی (d).الطاف حسین حالی

2. مولانا آزاد کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

(a).کلکتہ (b).دہلی (c).مدینہ منورہ (d).مکہ مکرمہ

3. اشرف علی تھانوی کس کے خلیفہ ہیں؟

(a).امداد اللہ مہاجر مکی (b).حسین احمد مدنی (c).محمود الحسن (d).شاہ وصی اللہ

4. مولانا آزاد ان میں سے کس جرنل کے ایڈیٹر تھے؟

(a).لسان الصدق (b).ہماری زبان (c).معارف (d).تہذیب الاخلاق

5. بیان القرآن کے مصنف کا نام بتایئے؟

(a).امین احسن اصلاحی (b).ابوالکلام آزاد (c).اشرف علی تھانوی (d).سر سید احمد خاں

6. خانقاہ امدادیہ کہاں واقع ہے؟

(a).دہلی (b).کیرالا (c).ممبئی (d).تھانہ بھون

7. مولانا آزاد کے والد کا نام بتایئے؟

(a).خیر الدین (b).معز الدین (c).صلاح الدین (d).فہیم الدین

8. "انڈیا ونس فریڈم" کس کی تصنیف ہے؟

(a).سر سید احمد خاں (b).اشرف علی تھانوی (c).ابوالکلام آزاد (d).علامہ شبلی

9. اشرف علی تھانوی کے خلیفہ کا نام بتایئے؟

(a).علامی شبلی نعمانی (b).مولانا ابوالکلام آزاد (c).سید سلیمان ندوی (d).الطاف حسین حالی

10. ان میں سے کسے حکیم الامت کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

(a).سید سلیمان ندوی (b).مولانا شفیع عثمانی (c).165 اشرف علی تھانوی (d).محمد حسین آزاد

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اشرف علی تھانوی کے ابتدائی حالات کا مختصر تعارف کرایے۔
2. اشرف علی تھانوی کے عملی اقدام پر مضمون قلم بند کیجیے۔
3. ابوالکلام آزاد کی حیات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔
4. ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار پر نوٹ لکھیے۔
5. ابوالکلام آزاد کی عملی زندگی کا جائزہ لیجیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. ابوالکلام آزاد کے تصور خلافت پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
2. اشرف علی تھانوی کے تعلیمی خدمات پر مفصل مضمون تحریر کیجیے۔
3. اشرف علی تھانوی کے نظریہ تصوف پر جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	حیات اشرف	: مولانا ڈاکٹر غلام محمد
2.	نقوش و تاثرات	: مولانا عبد الماجد دریابادی
3.	مولانا اشرف علی تھانوی	: نجم الحسن تھانوی
4.	مولانا آزاد (ایک سیاسی مطالعہ)	: ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری
5.	حضرت حکیم الامت: مولانا اشرف علی تھانوی	: مولانا اختر امام عادل
6.	انڈیا ونس فریڈم: ایک مطالعہ	: ریاض الرحمٰن شیروانی
7.	مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن	: ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
8.	مسئلۂ خلافت	: مولانا ابوالکلام آزاد

اکائی 4: جمعیت العلماء اور امارت شرعیہ

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 جمعیت علماء ہند

4.2.1 جمعیت علماء ہند کے قیام کا پس منظر

4.2.2 جمعیت علماء ہند کے مقاصد

4.2.3 جمعیۃ علماء ہند کا تنظیمی ڈھانچہ

4.3 امارت شرعیہ

4.3.1 ہندوستان میں امارت شرعیہ کی اہمیت اور ضرورت

4.3.2 امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے قیام کا پس منظر

4.3.3 امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے مقاصد

4.4 اکتسابی نتائج

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

عصر حاضر میں امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور ہمہ جہت ترقی و عروج کے لیے کئی ایک تحریکات مختلف ممالک میں بپا کی گئی ہیں۔

ہندوستان میں رونما ہونے والی تحریکات میں تحریک آزادی کے علاوہ تحریک شہیدین، تحریک خلافت، جمیعۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ جیسی اہم اور بنیادی تحریکات شامل ہیں۔ ان تحریکات کے دور رس اور دیرپا نتائج ہندوستانی مسلم سماج اور معاشرہ پر مرتب ہوئے ہیں۔ اول الذکر تینوں تحریکات اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہیں جب کہ مؤخر الذکر دونوں تحریکات آج بھی سرگرم عمل ہیں اور مسلم سماج و معاشرہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں اور سرگرداں ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد دین وشریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونے اور ہر میدان عمل بشمول سیاست، میں امت مسلمہ کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کرنا ہے تاہم آج دونوں تنظیموں نے تقریباً سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی میں ہندوستان کی دو اہم تحریکات- جمیعۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ- کا تعارف کرایا جائے گا، ان کے قیام کا پس منظر اور اسباب کے ساتھ ساتھ ان کے بانیان اور امراء وصدور کا ذکر کیا جائے گا، ان کے تنظیمی ڈھانچوں پر روشنی ڈالی جائے گی اور مختلف شعبہ جات کا تعارف کرایا جائے گا اور ہندوستان کے مسلم سماج ومعاشرہ کے ساتھ ساتھ بلا تفریق مذہب وملت پورے ہندوستانی سماج و معاشرہ کی فلاح وبہبود کے حوالہ سے ان کی ہمہ جہت خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

4.2 جمعیت علماء ہند

بیسویں صدی کے ابتدائی دور قائم ہونے والی جمعیت علماء ہند، ہندوستانی علماء کی سب سے منظم اور مضبوط تنظیم ہے۔ اس تنظیم نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور بلا تفریق مذہب ومسلک سماجی خدمات پیش کی ہیں۔

4.2.1 جمعیت علماء ہند کے قیام کا پس منظر

جمعیت علماء ہند کا قیام جس زمانہ میں ہوا تھا اس وقت ہندوستان اور خاص طور سے ہندوستان کے مسلمان ایک دوراہے سے گذر رہے تھے۔ ایک طرف ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا دوسری طرف ان کی دینی ومذہبی شناخت بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ جنگ آزادی کی لے مسلمانان ہند اور برادران وطن کی قربانیوں کی وجہ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی لہذا ملک کو مکمل آزادی دلانے اور مسلمانوں کو اپنی مذہبی شناخت کے ساتھ زندہ رکھنے کے لیے جمعیت علماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ جمعیت علماء ہند کے قیام کی ضرورت وافادیت کو تحریک خلافت کانفرنس کے پہلے اجلاس پیش کیا گیا اور علماء دوسرے روز ہی سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور حکومت وقت کے سامنے اپنے نقطہ نظر کو مضبوطی کے ساتھ رکھنے کے لیے جمعیۃ علماء ہند کی بنا ڈال دی گئی۔ اس تاسیسی جلسہ میں شریک ہونے والوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سلامت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناءاللہ پانی پتی، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی، مولانا حافظ احمد سعید دہلوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا محمد اکرم خاں اور مولانا منیر الزماں علیہم الرحمہ جیسے اکابر ملک وملت شامل تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا سہ روزہ اجلاس (28 دسمبر 1919ء تا یکم جنوری 1920ء) امرتسر میں منعقد ہوا جہاں جمعیۃ علماء ہند کے حوالہ سے بنیادی امور طے کیے گئے۔ اس جلسہ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی رہائی تک مفتی اعظم محمد کفایت اللہؒ کا انتخاب عارضی اور کارگذار صدر جمعیۃ علماء ہند کے کیا گیا اور مولانا حافظ احمد سعید دہلوی کو عارضی ناظم اعلی بنایا گیا۔ جب شیخ الہند کی رہائی عمل میں آگئی تو جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس (بمقام دہلی) کے انعقاد کے موقعہ پر انہیں جمعیۃ علماء ہند کا باقاعدہ صدر بنایا گیا اور وہ انہیں کی صدارت میں منعقد ہوا لیکن قضائے الٰہی کے مطابق اس جلسہ کے چند دنوں بعد ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور جمعیۃ علماء ہند کو ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہ مل سکا۔

4.2.2 جمعیت علماء ہند کے مقاصد

جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ پر مشتمل کتابوں کی ورق گردانی کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد میں حالات وضرورت کے پیش نظر تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

آج جمعیۃ علماء ہند جن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے اسے "دستور اساسی جمعیۃ علماء ہند" میں حسب ذیل نکات میں بیان کیا گیا ہے جس میں جمعیۃ علماء ہند کے اکثر سابقہ مقاصد بھی سمٹ کر آگئے ہیں۔ تاہم ان مقاصد سے صرف نظر کیا گیا ہے جسکی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی جیسے مکمل آزادی کا مطالبہ وغیرہ۔ جمعیۃ علماء ہند کے موجودہ مقاصد حسب ذیل ہیں:

1. اسلام، شعائر اسلام اور مسلمانوں کے ماثر و معابد کی حفاظت۔
2. مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل و حفاظت۔
3. مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاح۔
4. ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی، اقتصادی، اور معاشرتی (سوشل) زندگی کی ترقی واستحکام کا ذریعہ ہوں۔
5. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اور اس کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا۔
6. علوم عربیہ واسلامیہ کا احیاء اور زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق نظام تعلیم کا اجراء۔
7. تعلیمات اسلامی کی نشر واشاعت۔
8. اسلامی اوقاف کی تنظیم و حفاظت۔

4.2.3 جمعیۃ علماء ہند کا تنظیمی ڈھانچہ

جمعیۃ علماء ہند کا ڈھانچہ بہت منظم، پختہ اور وسیع ہے۔ اس کے تنظیمی ڈھانچہ کو بنیادی طور دو حصوں- مرکزی اور صوبائی تنظیم- میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے بہت ہی زمینی سطح پر اس کی تشکیل و تنظیم کی ہے۔ اس نظام کی وجہ سے غالباً ہندوستان کا کوئی ایسا خطہ یا علاقہ نہیں ہے جہاں جمعیۃ علماء ہند کے کارکنان، ممبران اور عہدیدارن موجود نہ ہوں۔

جمیعۃ علماء ہند کے اساسی دستور کے مطابق جمیعۃ علماء کا تنظیمی ڈھانچہ مقامی، شہری، ضلعی، ریاستی اور مرکزی سطح پر منقسم ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی سطح کے مطابق مصروف عمل رہتا ہے۔ ہر سطح کی جمیعت کی تاسیس کے لیے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جیسے مقامی جمیعت کی تشکیل کے لیے سو ممبران کا ہونا ضروری ہے۔ دیہات یا چند دیہاتوں میں تیس ممبران کی موجودگی میں مقامی جمیعت تشکیل کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح شہری جمیعت کی تاسیس کے لیے اس شہر کی آبادی کا دولاکھ ہونا شرط ہے۔ ضلعی جمیعت وہاں قائم کی جاسکتی ہے جہاں ایک سے زائد مقامی جمیعت پائی جاتی ہو۔

ہر سطح کی جمیعت کی ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے لیکن ہر سطح کی جمیعت کے عہدیداران یکساں نہیں ہوتے ہیں تاہم صدر، ناظم اور خازن جیسے کلیدی عہدے ہر سطح پر پائے جاتے ہیں۔ ریاستی اور مرکزی سطح کی جمیعت مجلس منتظمہ کے ساتھ ساتھ ایک مجلس عاملہ پر بھی مشتمل ہوتی ہے اور ان کے عہدیداران کی تعداد دیگر سطح کی جمیعت کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کا مالی نظام

جمیعۃ علماء ہند کا مالی نظام رکنیت کی فیس، مخصوص عطیات، جمیعۃ علماء ہند کے اجلاس کے حوالہ سے ہونے والی آمدنی، منقولہ وغیر منقولہ جائیداد یا کسی سامان کے فروخت یا کرایہ سے ہونے والی آمدنی، جمیعۃ علماء ہند کے کسی شعبہ سے ہونے والا منافع، وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی، صدقات فطر و دیگر واجب صدقات، زکوۃ اور چرم قربانی کی قیمت سے حاصل شدہ رقم پر قائم ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کا نظام اجلاس

جمیعۃ علماء ہند کے چار قسم کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں:

اجلاس عام: مجلس عاملہ کی صواب دید پر ہر انتخاب عام کے بعد اجلاس عام منعقد ہوگا جس میں مرکزی جمیعت علماء ہند اور ریاستی جمیعتوں کی مجلس منتظمہ کے ارکین شریک ہوں گے۔ اجلاس عام کی ایک سبجیکٹ کمیٹی ہوتی ہے۔ یہ کمیٹی صرف مرکزی جمیعۃ علماء ہند کی مجلس منتظمہ کے اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اجلاس عام میں وہی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں جسے سبجیکٹ کمیٹی نے منظور کیا ہو یا صدر کو تجاویز پیش کرنے کا اختیار ہوگا۔ اجلاس عام کی صدارت مرکزی جمیعۃ علماء ہند کا صدر ہی کرتا ہے تاہم مفتی اعظم محمد کفایت اللہؒ اپنے دور صدارت میں اجلاس عام کی صدارت، خود کی بجائے کسی بڑے اور نامور عالم دین سے کرواتے تھے۔

مجلس منتظمہ کا اجلاس: مجلس منتظمہ کا اجلاس سال میں کم از کم ایک مرتبہ منعقد کیا جائے گا جس میں مرکزی جمیعۃ علماء ہند کے اراکین شامل ہوں گے۔ ناظم عمومی صدر کی اجازت سے مجلس منتظمہ کا اجلاس طلب کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ کے فیصلہ پر مجلس منتظمہ کا غیر معمولی اجلاس طلب کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مرکزی جمیعۃ علماء ہند کے پچاس اراکین کی درخواست پر بھی مجلس منتظمہ کا اجلاس بلایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے اجلاس کو طلب کرنے کے لیے پانچ ریاستی جمیعتوں کے دس دس اراکین کا درخواست پر دستخط کرنا ضروری اور لازمی ہوگا۔

مجلس عاملہ کا اجلاس: صدر یا صدر کی اجازت سے ناظم عمومی جب چاہیں تب مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کرسکتے ہیں۔ اسی طرح

مجلس عاملہ کے پانچ ارکان کی تحریری درخواست پر ناظم عمومی کے لیے اس کا اجلاس بلانا ضروری ہو جائے گا۔

مجالس قائمہ اور سب کمیٹیوں کے اجلاس: ان اجلاس کے انعقاد کے حوالہ سے اساسی دستور میں کسی قسم کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کے شعبہ جات

جمیعۃ علماء ہند ایک ایسی تنظیم ہے جس کے سامنے مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی اور مختلف میدانوں میں ان کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دین واسلام کی اشاعت و تبلیغ وغیرہ بھی شامل ہے۔ اپنے وسیع مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کا ایک نظام عمل ہے جو مختلف شعبوں کے پر محیط ہے۔ مولانا جمیل اختر قاسمی صاحب نے جمیعۃ علماء ہند کے حسب ذیل شعبوں کا ذکر کیا ہے:

مرکز دعوت اسلام: اس شعبہ سے اسلام کی دعوت اور اس کی تعلیمات کی اشاعت کی جاتی ہے۔

جمیعۃ مسلم سیکریٹریٹ: اس کا مقصد مسلمانوں کا اقتصادی و معاشرتی سروے کرنا اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے تناسب کا جائزہ لینا ہے۔

جمیعۃ ٹرسٹ سوسائٹی: بعض قانونی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ ٹرسٹ بنایا گیا ہے۔ جمیعۃ علماء ہند کی نگرانی میں نکلنے والے اخبارات، الجمیعۃ پریس اور الجمیعۃ بک ڈپو اسی ٹرسٹ کی ماتحتی میں کام کر رہے ہیں۔

اصلاح المسلمین: یہ شعبہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کو فروغ دینے اور اشاعت اسلام جیسے کام میں مصروف عمل ہے۔

مباحث فقہیہ: مولانا سید محمد میاںؒ نے اس شعبہ کا قیام مسلمانوں کے فقہی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے قائم کیا تھا لیکن ان کی وفات کے بعد تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مولانا سید محمد اسعد مدنیؒ نے اس شعبہ کو دوبارہ زندہ کیا ہے جہاں سے عصری مسائل کا حل اسلامی احکامات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

اصلاح معاشرہ: اس شعبہ کی خدمات کا اندازہ اس کے نام سے کیا جا سکتا ہے۔ اس شعبہ کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کو ایک تحریک کی شکل دے دی گئی ہے اور ملک کے طول و عرض میں ایک ہزار سے زائد اصلاحی کمیٹیاں قائم ہو چکی ہیں اور اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

دینی تعلیمی بورڈ: آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی میں مذہبی تعلیم کے حصول کا کوئی نظم نہیں کیا گیا ہے لہذا جمیعۃ علماء ہند نے ہندوستانی مسلمانوں کو دینی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے 1954 میں ایک دینی تعلیمی بورڈ کا قائم کیا تھا۔ اس بورڈ کا مرتب کردہ نصاب ملک کے بہت سے مکاتب و مدارس میں پڑھایا جا رہا ہے۔

الجمیعۃ بک ڈپو والجمیعۃ پریس: ان اداروں سے جمیعۃ علماء ہند کی ماتحتی میں نکلنے والے اخبارات اور مرتب کردہ کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔

محمودیہ لائبریری: اس لائبریری اسلامی، تاریخی، سیاسی اور اصلاحی موضوعات وغیرہ پر عربی، فارسی و اردو میں لکھی گئی کتابوں کا

ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہاں مخطوطات اور جمیعۃ علماء ہند کی اہم دستاویزات بھی موجود ہیں۔

امداد بیوگان: اس شعبہ کے تحت ان بیوگان کی مالی مدد کی جاتی ہے جن کی کوئی اولاد دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو۔

تعلیمی وظیفہ: یہ شعبہ ان بے سہارا اور نادار طلبا کو تعلیمی وظائف فراہم کرتا ہے جو ایم بی بی ایس، انجینئرنگ، ایم کام، بی ایڈ اور چارٹیڈ اکاؤنٹینسی جیسے شعبوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔ یہ شعبہ 1974 سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

لیگل سیل / قانون امداد کمیٹی: جمیعۃ علماء ہند کا ایک اہم شعبہ لیگل سیل / قانون امداد کمیٹی ہے۔ کسٹوڈین کے قانون سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس شعبہ کا قیام آزادی کے فوراً بعد کیا گیا تھا تاکہ کسٹوڈین کے قبضہ میں چلی جانے والی جائیداد کو ہندوستان میں رہ جانے والے اس کے حقیقی مالک کو واپس دلایا جاسکے۔ کسٹوڈین کا معاملہ جیسے جیسے ڈھنڈاپڑتا گیا ویسے ویسے اس شعبہ کی کارکردگی بھی کم ہوتی چلی گئی۔

اس شعبہ میں خاص طور سے صوبائی جمیعۃ علماء ہند، مہاراشٹر کے لیگل سیل میں دوبارہ جان اس وقت پڑی جب مسلمان نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا جانے لگا۔ جمیعۃ علماء ہند نے ان گرفتاریوں کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے ان نوجوانوں کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا جن کی زندگیاں کال کوٹھری کا ایک حصہ بن گئی تھیں اور ان کے بے سروساماں اہل خانہ حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا کہ کہیں پرائی آنچ ان کے دامن تک نہ پہنچ جائے۔ ان سخت اور مشکل حالات میں مہاراشٹر کی ریاستی جمیعۃ علماء ہند نے ہمت و جرات سے کام لیتے ہوئے انھیں قانونی امداد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا جس پر مرکزی جمیعۃ علماء ہند نے بھی اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دی۔

جمیعت کے لیگل سیل کے تن مردہ میں جان ڈالنے کا سہرہ جناب گلزار احمد اعظمی مرحوم، سکریٹری قانونی امداد میٹی، جمیعۃ علماء ہند، مہاراشٹر کے سر بندھتا ہے کہ انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ پوری جرات اور دانش مندی کے ساتھ مسلمانوں پر لگنے والے دہشت گردی کے الزامات کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ 281 افراد کو ان الزامات سے بری کرایا اور 114 افراد کو ضمانت پر رہائی دلائی اور دیگر کی رہائی کے لیے تاحیات سرگرم عمل رہے۔ جمیعت کی موجودہ لیگل سیل کی ٹیم بھی مرحوم گلزار احمد کی ڈگر پر چل رہی ہے اور ان کی کوششوں کے اچھے نتائج سامنے آنے کی امید ہے۔ اس وقت مہاراشٹر کی ریاستی جمیعۃ علماء ہند کا لیگل سیل ایڈوکیٹ شاہد ندیم صاحب کی قیادت میں ٹرائل کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک 95 مقدمات کی پیروی کر رہا جن میں 75 افراد کو پھانسی اور 125 افراد کو عمر قید کی سزا مختلف عدالتوں سے سنائی جاچکی ہے۔

مذکورہ لیگل سیل صرف دہشت گردی کے الزام کے علاوہ دیگر الزامات کے تحت قید و بند کی سزا سے دوچار نوجوانوں کی مدد بھی کر رہا ہے لہذا وہ فسادات میں گرفتار کیے جانے والے اور شہریت ترمیمی قانون کے خلاف احتجاج کرنے والوں مسلم نوجوانوں کو قانونی امداد فراہم کر رہا ہے، مسلمانوں کی املاک کی بلڈوزر کے ذریعہ کی جانے والی غیر قانونی انہدامی کاروائی اور متنازعہ لوجہاد قوانین کو بھی سپریم کورٹ میں چیلنج کر رکھا ہے اور گودی میڈیا کے جھوٹے پروپیگنڈہ پر لگام کسنے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کیا ہے جس کی متعدد سماعتیں ہو چکی ہیں۔ لیگل سیل کی متعدد قانونی کاروائیوں کے اچھے اثرات مرتب ہوئے ہیں جیسے بلڈوزر کے ذریعہ کی جانے والی غیر قانونی انہدامی کاروائیوں

پر سپریم کورٹ نے نہ صرف متعدد ریاستوں کو نوٹس جاری کر دیے ہیں بلکہ اس پر اسٹے بھی لگا دیا ہے۔ اسی طرح جمیعۃ علماء ہند نے بابری مسجد، این آر سی، سی اے اے اور قانون طلاق ثلاثہ جیسے معاملات کے حوالہ سے بھی قانونی اقدامات کیے ہیں اور انہیں چیلنج کر رکھا ہے۔ بابری مسجد کا قضیہ تو ختم ہوا لیکن دیگر عبادت گاہوں کے حوالہ سے شر انگیزیوں کا سلسلہ جاری ہے اور جمیعۃ علماء ہند کا لیگل سیل بھی ان معاملات میں سر گرم ہو چکا ہے۔ ماضی میں اس نے ٹاڈا اور پوٹا جیسے قوانین کو بھی چیلنج کیا تھا۔

لیگل سیل کے لیے وکلاء کی ایک ٹیم تیار کرنے کے لیے قانون کے طلباء کو "شہید ایڈوکیٹ شاہد اعظمی" کے نام سے ایک اسکالر شپ بھی دی جاتی ہے جس سے طلبہ کی ایک تعداد مستفیض ہو رہی ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کی خدمات

جمیعۃ علماء ہند ایک منظم سیاسی، دینی اور سماجی تحریک و تنظیم ہے جس نے ملک کی آزادی اور جدید ہندوستان میں مسلم سماج و معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اس کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے جسے قاری محمد فاروق جامعی صاحب کے بقول 32 زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مولانا جمیل احمد قاسمی صاحب کے بقول ''اس کی خدمات کا دائرہ مذہب و سیاست، درس و تدریس، علوم و فنون، تبلیغ و اشاعت، تصنیف و تالیف، اصلاح معاشرت اور تعمیر سیرت و اخلاق سے لے کر انسانی خدمت کے میدانوں تک پھیلا ہوا ہے''۔ درج ذیل سطور میں جمیعت کی نمایاں خدمات کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

جمیعۃ علماء ہند اور جنگ آزادی

جمیعۃ علماء ہند نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس کا منھ بولتا ثبوت اس کا ترک موالات کا ریزولیوشن منظور کرنا، ولائتی مال کا بائیکاٹ کا فیصلہ کرنا، مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کرنا، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنا، تحریک سول نافرمانی، نمک ستیہ گرہ اور بھارت چھوڑو تحریک جیسی دیگر تحریکات میں شریک ہونا اور کانگریس کی قرارداد کامل آزادی کی حمایت کرنا وغیرہ شامل ہے۔ جنگ آزادی کے حوالہ سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جمیعۃ علماء ہند کے قائدین تقسیم ہند کے قائل نہیں تھے اسی وجہ سے اس نے سیکولر دستور وضع کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

آزاد ہندوستان میں جمیعۃ علماء ہند کا کردار

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لینے کے بعد جب ملک تقسیم ہو گیا اور فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تو جمیعۃ علماء ہند نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے سیاست سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی ساری توجہ مذہب، تعلیم اور سماج پر مرکوز کر دی اور مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مصروف عمل ہو گئی۔ جمیعۃ علماء ہند نے قومی و ملی اتحاد کو قائم کرنے میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عملی سیاست سے علاحدگی اختیار کرنے کے باوجود جمیعۃ علماء ہند کے اراکین کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنی پسند کی پارٹی کے جھنڈے تلے سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اسی فیصلہ کی بنیاد پر جمیعۃ علماء ہند کے اکابر آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ہمیشہ موجود رہے اور ملک کی دستور سازی میں حصہ لیتے ہوئے مسلم مسائل کو اٹھاتے رہے ہیں۔

جمیعۃ علماء ہند کی مذہبی، دینی اور تعلیمی خدمات

جنگ آزادی کی لڑائی لڑنے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی، دینی اور تعلیمی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ یہ امور اس کے مقاصد میں شامل تھے اور اس نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدامات کرتی رہے۔ مذہبی و دینی خدمات کے حوالہ سے جمیعۃ علماء ہند کے اہم اور بنیادی خدمات میں فتنہ ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لیے تبلیغ و حفاظت اسلام کا شعبہ قائم کرنا، مساجد واو قاف کی بازآبادی اور ان کی حفاظت کا انتظام کرنا، شریعت بل پیش کرنا، بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ اسلامی و مذہبی حقوق کا مطالبہ کرنا اور ان کے تحفظ کے لیے کوشش کرنا، ائمہ مساجد کی تربیت کرنا، مسلم پرسنل لا کو محفوظ کرنے کے لیے شاردا ایکٹ کی مخالفت کرنا، سول میرج ایکٹ، قاضی بل، اسپیشل میرج بل، نکاح و طلاق کے قانون، قانوان وراثت، قانون فسخ نکاح اور قانون طلاق ثلاثہ وغیرہ کی مخالفت کرنا اور انھیں کورٹ میں چیلنج کرنا شامل ہیں۔ اسی طرح تحفظ ختم نبوت کے حوالہ سے بھی اس نے کئی عملی اقدامات کیے ہیں۔

تعلیمی خدمات کے حوالہ سے جمیعۃ علماء ہند نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خاطر خواہ اقدامات کیے ہیں۔ اس کے مقاصد میں تعلیمی اداروں کا قیام، علوم عربیہ واسلامیہ کا احیا اور زمانہ کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے نظام تعلیم کو مرتب کرنا تھا۔ جمیعۃ علماء ہند کی تعلیمی خدمات کے ضمن میں واردھا تعلیمی اسکیم اور ودیامندر اسکیم کا ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ اس نے ان اسکیموں کی پورے شدومد کے ساتھ مخالفت کی تھی کہ وہ دونوں اسکیمیں مسلمانوں کے عقائد سے ٹکراتی ہیں۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی اور مسلم ریزرویشن کے حصول کے لیے اس کی کوششوں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کی سماجی خدمات

جمیعۃ علماء ہند کی سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے سامنے سماجی خدمات کا ایک بڑا کینوس تھا لہذا وہ روز اول سے ہی سماجی خدمات میں مصروف عمل ہے۔ سماجی خدمات کے تئیں اس کی فکرمندی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا کہ اس کے اساسی قانون کی دفعہ نمبر 8 سماجی خدمات کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے طریقہ کا ذکر کرتی ہے۔ جمیعۃ علماء ہند کے اساسی قانون کے مطابق اس کی سماجی خدمات کا دائرہ مختلف مذہبی فرقوں کا مشترکہ اجتماع کرنا، شرعی پنچایت کے ذریعہ خاندانی تنازعات کو ختم کرنا، شہری ضروریات کی تکمیل کیے لیے کوشش کرنا، مزدوروں، کسانوں اور پسماندہ لوگوں کی خبر گیری کرنا، یتیموں، بیواوں، مجبور لوگوں اور غریب لڑکیوں کی شادی کرانے میں مدد کرنا اور فضول رسم ورواج اور فضول خرچی سے بچنے کے لیے اجتماعی کوشش کرنا۔

دستور اساسی میں مذکور سماجی خدمات کے علاوہ بھی جمیعۃ علماء ہند دیگر سماجی خدمات بھی انجام دیتی ہے جیسے قدرتی آفات اور فسادات کے موقعہ پر بلا تفریق ملت و مذہب انسانیت کی خدمت کرنا اور ان کی بازآبادکاری کے لیے پیش پیش بھی رہنا ہے۔ اس کا ایک بڑا سماجی کارنامہ جھوٹے مقدمات میں ماخوذ ملزمین کی پیروی کرنا اور انھیں رہائی دلانا ہے جس کا ذکر لیگل سیل کے تحت کیا جاچکا ہے۔

جمیعۃ علماء ہند کے صدور

جمیعۃ علماء ہند غالبا واحد تنظیم ہے جس کی ابتدا عارضی صدر سے ہوتی ہے۔ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کو جمیعت کا پہلا صدر (عارضی)

منتخب کیا گیا تھا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (1851 تا1920ء) جیل میں تھے۔ شیخ الہند کی رہائی کے بعد انہیں پہلا مستقل صدر منتخب کیا گیا تھا لیکن ان کا عملی دور صدارت صرف دس روز پر مشتمل ہے کہ 20 نومبر 1920ء میں انھیں منصب صدارت پر فائز کیا گیا تھا اور 30 نومبر 1920ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد اس عہدہ پر درج ذیل افراد فائز ہوئے ہیں:

نام	مدت صدارت
مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی (1875-1952ء)	6 ستمبر 1921ء تا 7 جون 1940ء۔
مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (1879-1957ء)	8 جون 1940ء تا 5 دسمبر 1957ء۔
مولانا احمد سعید دہلویؒ (1888-1959ء)	مولانا احمد سعید دہلویؒ جمیعۃ علماء ہند کے عبوری صدر تھے جن کا انتخاب مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے انتقال کے بعد ہوا تھا۔ ظن غالب کے مطابق وہ اس عہدہ پر 8 دسمبر 1960ء تک فائز رہے۔
مولانا سید فخر الدین احمدؒ (؟؟)	9 دسمبر 1960ء تا 30 اپریل 1972ء۔
مولانا سید اسعد مدنیؒ (1928-2006ء)	11 اگست 1973ء تا 6 فروری 2006ء۔
مولانا سید ارشد مدنی صاحب (ولادت: 1941ء)	28 فروری 2006ء تا حال۔

جمیعۃ العلماء ہند کی تقسیم

یہ انسانی تاریخ کا المیہ ہے کہ قرن اول کے علاوہ انسان کی فلاح و بہبود کی اجتماعی کوشش کرنے والی ہر جماعت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہی ہے سو جمیعۃ علماء ہند بھی ہوئی۔ جمیعۃ علماء ہند اپنی سو سالہ تاریخ میں کئی بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ جمیعۃ علماء ہند میں پہلی ٹوٹ پھوٹ اس کے آٹھویں اجلاس (اجلاس پشاور 1927ء) کی صدارت کے مسئلہ کو لے کر ہوئی تھی اور جمیعۃ علماء ہند کا ایک گروپ 1927ء میں مولانا نثار احمد کانپوری کی قیادت میں الگ ہو گیا اور جمیعۃ علماء کانپور کے نام سے ایک الگ تنظیم بنالی۔

1986ء میں مجلس عاملہ کے چند اراکین کو جمیعۃ علماء ہند کی پالیسی اور طریقہ کار پر اظہار ناراضگی کی بنا پر 6 سال کے لیے معطل کر دیا گیا لہذا ان حضرات نے ملی جمیعۃ علماء ہند نامی تنظیم بنالی تھی۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد مولانا اسرار الحق قاسمی، جنرل سکریٹری جمیعۃ علماء ہند اپنے چند رفقائے کار کو لے کر الگ ہو گئے اور ایک نئی تنظیم بنالی جس میں ملی جمیعۃ علماء ہند کے افراد بھی شامل ہو گئے۔

جمیعۃ علماء ہند میں سب سے بڑی تقسیم مولانا سید اسعد مدنیؒ کے انتقال کے بعد مارچ 2008ء میں ہوئی اور اس تقسیم کے نتیجہ میں جمیعۃ علماء ہند دو لخت ہو گئی جو اب جمیعۃ علماء ہند (الف / ارشد مدنی) اور جمیعۃ علماء ہند (میم / محمود مدنی) کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ پہلے کے صدر مولانا سید ارشد مدنی ہیں جب کہ دوسرے کے صدر مولانا سید محمود مدنی ہیں۔ اس وقت جمیعۃ علماء ہند میں دو متوازی نظام چل رہا ہے۔

4.3 امارت شرعیہ

4.3.1 ہندوستان میں امارت شرعیہ کی اہمیت اور ضرورت

اسلامی احکامات میں اجتماعی زندگی کو مرکزیت حاصل ہے لہذا جہاں اسلامی حکومت کا قیام ممکن نہ ہو وہاں اجتماعی امور کی ادائیگی کے لیے متقدمین علما اور مفکرین نے یہ حل نکالا ہے کہ ایسے مقامات کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر چن لیں اور اس کی نگرانی میں جس حد تک ممکن ہو سکے اپنے اجتماعی امور کو ادا کرتے رہیں۔

ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام اور اس کی اہمیت کے قائلین کے نظروں میں امارت شرعیہ صرف مذہبی امور کو شریعت کی نگرانی میں ادا کرنے والا ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی عملی شکل ہے اسی لیے امارت شرعیہ کے بانی مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ مسلمانوں کو ملک کے تمام مسائل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا مشورہ دیتے تھے حتی کہ وہ سیاست میں عملی حصہ لینے کے قائل تھے کہ 'ان کی دور رس نگاہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک میں مشترکہ حکومت ہی بنے گی اور مسلمانوں پر ہی مذہب اور ان کے مخصوص قوانین کی حفاظت کی ذمہ داری ہو گی۔ اس فکر کی بنا پر وہ چاہتے تھے کی آزادی سے پہلے "امارت شرعیہ" کا نظام ایسا مضبوط و منضبط اور مکمل اور جامع بن جائے کہ ہندوستان کے اساسی دستور میں اسے مسلمانوں کے "شرعی نظام" کی حیثیت سے منظور کروایا جاسکے تاکہ آزاد ہندوستان میں مسلمان "اسلامی زندگی" گزار سکیں۔

4.3.2 امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے قیام کا پس منظر

ہندوستان میں اسلام کے مطلوبہ سماج کو پروان چڑھانے کے لیے امارت شرعیہ کے قیام کی اولیں کوشش سید احمد شہید اور ان کے قابل قدر رفقاء نے کی تھی۔ تحریک شہیدین کے بعد بھی اس کی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دور کے مذہبی، سماجی اور سیاسی حالات کے پیش نظر امارت شرعیہ کے بانی و مؤسس مولانا ابوالمحاسن کے ذہن و دماغ میں اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر کی روشنی اجتماعی زندگی گزارنے کا ایک مکمل خاکہ تیار ہو چکا تھا جسے انہوں نے اکابر امت کے سامنے "اسکیم نظارت شرعیہ" کے نام سے پیش کیا تھا جس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو قرآن و سنت اور سیرت نبوی کی روشنی میں اجتماعی زندگی گذارنے کے طریقوں کو متعین کرنا اور اس کے لیے راہیں ہموار کرنا تھا۔

اس خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے پہلا قدم انہوں نے 1917ء میں اٹھایا اور بہار کے علماء کو جمع کر کے "انجمن علمائے بہار" کی بناڈالی اور خلافت کی بحالی کے لیے 1919ء میں دیگر علماء کے ساتھ مل کر بمبئی (موجودہ ممبئی) میں خلافت کمیٹی کی تشکیل کرتے ہوئے اس کی صوبائی کمیٹیاں گیا (بہار) اور پھلواری شریف (بہار) میں بنائی۔ اسی سال دہلی میں منعقدہ خلافت کانفرنس کے موقعہ پر "جمعیۃ علماء ہند" کی تاسیس میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے پہلے اجلاس (منعقدہ امرتسر، دسمبر 1919ء) میں ملکی سطح پر امارت شرعیہ کے قیام اور امام المسلمین کی ضرورت کو مدلل انداز میں واضح کیا۔ جمعیۃ العلماء ہند کے دوسرے اجلاس (منعقدہ دہلی، نومبر 1920ء) میں سینکڑوں علماء اور دانشوارن

کے سامنے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "امارت فی الہند" کے قیام کی تجویز پیش کیتا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی دینی اور شرعی تقاضوں کو دین وشریعت کی روشنی میں آسانی سے پورا کر سکیں۔ان کی اس تجویز کی تائید صدر جلسہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے بھی کی تاہم امیر کا انتخاب نہ ہو سکا۔اس نعرہ مستانہ پر ہندوستان کے طول وعرض سے صدائے لبیک کی بازگشت سنی گئی۔مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی اس تجویز کی بھرپور تائید کی۔

جمیعۃ علماءہند کے تیسرے اجلاس(17-19 ربیع الاول 1340ھ / 18-20-1922ء،لاہور)میں جلد از جلد امیر الہند کو منتخب کرنے کی تجویز(تجویز نمبر 8)پیش کی گئی اور اسی تجویز میں ایک سب کمیٹی بنانے کی تجویز بھی شامل تھی تاکہ امیر شریعت کے اختیارات و فرائض کا تعین کیا جاسکے اور کمیٹی کو جلد از جلد اس کا مسودہ پیش کرنے کا پابند بنایا گیا تاکہ اسے بدایوں میں دسمبر میں منعقد ہونے والے جلسہ میں پیش کیا جاسکے۔اس سب کمیٹی میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بھی شامل تھے۔امیر الہند کے حوالہ سے مرتب کردہ مسودہ کو مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ نے اجمیر میں منعقد ہونے والے جمیعۃ علما ہند کے خصوصی اجلاس(3-5رجب 1340ھ / 3-5مارچ 1922ء)میں پیش کیا لیکن اسے مولانا عبدالقدیر بدایونیؒ کی تحریک اور مولانا شاہ سلیمانؒ کی تائید سے آئندہ اجلاس کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔اسی اجلاس میں پاس ہونے والی تجاویز میں وہ تجویز بھی شامل تھی امیر شریعت کے انتخاب سے پہلے صوبائی طور پر امیر شریعت کا انتخاب کر لیا جائے اور امیر شریعت ہند کے انتخاب سے پہلے اس کے فرائض واختیارات و قواعد کو مرتب کر کے اسے جمیعۃ علماہند سے منظور کروالیا جائے۔

24-22جمادی الاولی 1342ھ / بمطابق 31 دسمبر 1923ء-2 جنوری 1924ء میں جمیعۃ علماء ہند کے پانچویں اجلاس میں مذکورہ بالا مسودہ کو شائع کرنے کی تجویز پیش کی گئی تاکہ امیر شریعت کے حوالہ سے پائے جانے والے ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جاسکے۔25-27 محرم 1343ھ / 27-29 اگست 1924ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں امیر شریعت سے متعلق مسودہ کو ملک کے حالات صحیح ہونے تک مؤخر کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور گویا اسے ایک طرح سے ٹھنڈے بستہ کی نذر کر دیا گیا۔ مولانا ابوالمحاسن کی کوششوں کے باوجود جمیعۃ علماءہند کے دیگر اجلاس میں بھی امیر کا انتخاب نہ کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کر لی گئی کہ پہلے مرحلہ میں صوبائی پیمانہ پر امارت شرعیہ قائم کی جائے،بعد ازیں امیر کا انتخاب کیا جائے گا۔نہ جانے کس ساعت میں اس تجویز و قرارداد کو پیش کیا گیا تھا کہ آج تک "امیر" کا انتخاب نہیں کیا جاسکا ہے حالاں کہ امارت شرعیہ کے قیام اور اس کی ضرورت کا اظہار اور امیر کے انتخاب کا ذکر کسی نہ کسی انداز میں جمیعۃ علماءہند کے مختلف اجلاس میں ہوتا رہا اور اس کے حوالہ سے تجاویز پیش کی جاتی رہیں۔ان تجاویز وغیرہ کے حوالہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ امارت شرعیہ کا قیام اور امیر کا انتخاب،جمیعۃ علماءہند کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا تاہم ابھی تک اس کے حصول کی عملی کوششوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔

صوبائی پیمانہ پر امارت شرعیہ کی قیام کی تجویز پر مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے اسے ملکی سطح کی بجائے صوبائی سطح پر ہی قائم کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور اس کے قیام کی کوششوں میں مصروف عمل ہو گئے۔انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں کو صرف کرتے ہوئے "انجمن علمائے بہار" کے اجلاس (منعقدہ مئی 1921ء،دربھنگہ) میں امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز کو منظور کروا لیا اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے زیر

صدرات منعقد ہونے والے پٹنہ (بمقام پتھر کی مسجد) کے خصوصی اجلاس میں 19 شوال 1339ھ / 26 جون 1921ء کو چار ہزار افراد کی موجودگی میں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے سجادہ نشین مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی ؒ کو "امیر شریعت" اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کو "نائب امیر شریعت" منتخب کر لیا گیا اور اجلاس عام میں منتخب امیر شریعت اور نائب امیر شریعت کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی اور مولانا ابوالمحاسن ؒ کے خواب کی مکمل نہ سہی، جزوی تعبیر سامنے آگئی۔

امارت کے قیام کو سو سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے اور اس نے اس عرصہ میں مسلمانوں کی دینی، شرعی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا ہے اور آج بھی مسلم سماج کی ہمہ جہت ترقی کے کئی منصوبوں پر عمل پیرا ہے جس کے گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنے فعال کردار و عمل کا بہتر سے بہتر ثبوت فراہم کرتی رہے گی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانہ میں امارت شرعیہ کی بنیاد پھلواری شریف، پٹنہ، بہار میں رکھی گئی تھی اس وقت بہار میں اڑیسہ اور جھارکھنڈ کی ریاستیں شامل تھیں جس کی وجہ سے اب اسے صرف امارت شرعیہ بہار کی بجائے امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امارت شرعیہ کے ذیلی دفاتر اڑیسہ و جھارکھنڈ میں موجود ہیں۔

4.3.3 امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے مقاصد

امارت شرعیہ کو اسلام کے اجتماعی نظم کی ضرورت پورا کرنے والا ادارہ بتاتے ہوئے مولانا ظفیر الدین مفتاحی ؒ نے لکھا ہے کہ "اجتماعی نظم کے لیے جو چیزیں بھی لازمی ہیں وہ امارت شرعیہ کے مقاصد میں داخل ہیں۔ امیر کا انتخاب و تعین، دینی خطوط پر مسلمانوں کی تنظیم، شریعت اسلامیہ کا ممکن حد تک نفاذ، مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کرنا، دینی تعلیم عام کرنا، ان کی معاشی زندگی کی تنظیم، جدید علوم (سائنس و تکنیک) میں ترقی کی ترغیب، معاشرہ میں پیدا شدہ خرابیوں اور غیر اسلامی رواج کا خاتمہ، مسلمانوں کی آواز میں قوت پیدا کرنے کے لیے انہیں مسلک و مشرب کے اختلاف سے قطع نظر وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا، فتنہ ارتداد اور دوسرے خارجی و داخلی حملوں سے حفاظت، امت اسلامیہ میں عالمی تصور پیدا کرنا اور مسلمانوں کے قومی اور بین الاقوامی مسئلوں کے حل کی ممکن حد تک جدوجہد کرنا۔ یہ تمام امور و مسائل امارت شرعیہ کے بلند و پاک مقاصد کے نمایاں عنوانات ہیں"۔

امارت شرعیہ کے تعارفی رسالہ میں امارت کے آٹھ مقاصد درج کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں کیا جاسکتا ہے:

صحیح شرعی زندگی گزارنے کے لیے منہاج نبوت پر نظام شرعی کا قیام، اس نظام پر عمل کرتے ہوئے جس حد تک ممکن ہو، اسلامی احکام کو بروئے کار لانا اور اس کے اجراء و تنفیذ کے مواقع پیدا کرنا، قوانین خداوندی کو نافذ اور اسلام نظام عدل کو قائم و جاری کرنے کی استطاعت پیدا کرنے کی مستقل جدوجہد، امت مسلمہ کے جملہ اسلامی حقوق و مفادات کا تحفظ اور ان کی نگہداشت، مسلمانوں کو بلا اختلاف مسلک محض کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی بنیاد پر مجتمع کرنا، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم، معاش اور ترقی کے میدان میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا، عام انسانوں کی خدمت کرنا اور اس کے لیے رفاہی اور فلاحی ادارے قائم کرنا، مسلمانوں کے حقوق، شریعت کے احکام اور اسلام کے وقار کو پوری طرح قائم اور محفوظ رکھتے ہوئے ہندوستان میں بسنے والے تمام مذہب فرقوں کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ

کرنا، ملک میں امن پسند قوتوں کو فروغ دینا، اور تعلیم اسلامی "لا ضرر ولا ضرار في الاسلام" کی روشنی میں ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کا جذبہ پیدا کرنا اور ہر ایسے طریق کار و تحریک کی ہمت شکنی کرنا جس کا مقصد ہندوستان میں بسنے والے مختلف طبقات میں سے کسی ایک کی جان و مال، عزت و آبرو، تصورات و معتقدات پر کسی دوسرے کی طرف سے حملہ کرنا ہو، ایسی تمام تحریکات کو قوت پہنچانا جن کا مقصد ملک میں بسنے والی مختلف مذہبی اکائیوں کے درمیان ایک دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو کا احترام پیدا کرنا ہو اور فرقہ وارانہ تعصب و منافرت کو دور کرنا ہو۔

امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کا تنظیمی ڈھانچہ

امارت شریعہ کا تنظیمی ڈھانچہ چار مجالس پر مشتمل ہے جو امیر شریعت کی نگرانی میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتی ہیں:

مجلس ارباب حل وعقد

یہ امارت شرعیہ کی سب سے اہم اور بنیادی باڈی ہے جو غیر منقسم بہار اور مغربی بنگال کے 851 بااثر اور اہل رائے اشخاص وافراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ مجلس ارباب حل وعقد، سماج کی مختلف اکائیوں کی نمائندگی کرنے والوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی باڈی کو امیر کو منتخب و معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے، وہی امارت شرعیہ کی ترقی واستحکام اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کرتی ہے اور عوام الناس میں امیر کی سمع واطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ عام طور پر ہر تین سال پر اس مجلس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

مجلس شوری

امارت شرعیہ کی مجلس شوری 101 ممبران پر مشتمل ہے جن کا انتخاب "مجلس ارباب حل وعقد" کے ممبران میں سے کیا جاتا ہے۔ مجلس شوری کے نامزد اراکین میں نائب امیر شریعت، ناظم امارت شرعیہ، قاضی شریعت، مفتی امارت شرعیہ، نائبین ناظم امارت شرعیہ، ناظم بیت المال امارت شرعیہ اور نمائندہ مبلغین کے عہدہ پر فائز افراد واشخاص ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہر سال کم از کم ایک مرتبہ مجلس شوری کا اجلاس بلایا جاتا ہے تاہم امیر شریعت کو یہ اختیار اور حق حاصل ہے کہ ضرورت کے مطابق جب چاہیں مجلس شوری کا اجلاس بلا لیں۔

مجلس عاملہ

31 افراد پر مشتمل امارت شرعیہ کی ایک مجلس عاملہ بھی ہے۔ نائب امیر شریعت، ناظم امارت شرعیہ، قاضی شریعت اور ناظم بیت المال جیسے عہدوں پر فائز افراد واشخاص مجلس عاملہ کے لازمی اراکین ہوتے ہیں۔ ناظم امارت شرعیہ کی جانب سے عام طور پر اس مجلس کے سالانہ دو اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ تاہم ضرورت اور حالات کی مناسبت سے وہ امیر شریعت کے مشورہ سے مزید اجلاس بھی بلا سکتے ہیں۔

امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ ٹرسٹ

مجلس شوری اور مجلس عاملہ کی سفارشات پر "امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ ٹرسٹ" چند سال قبل بنایا گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کو ملکی قانون اور موجودہ حالات کے پیش نظر 24 ستمبر 2018ء میں رجسٹرڈ کرایا گیا ہے۔ امارت شرعیہ، خانقاہ رحمانیہ اور خانقاہ مجیبیہ سے وابستہ

افراد واشخاص ہی اس ٹرسٹ کے اراکین ہوسکتے ہیں لہذا امیر شریعت، نائب امیر شریعت، ناظم امارت شرعیہ، قاضی شریعت امارت شرعیہ، مفتی امارت شرعیہ، ناظم بیت المال امارت شرعیہ، سجادہ نشیں یا نمائندہ سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی، مونگیر اور سجادہ نشیں یا نمائندہ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف اس ٹرسٹ کے لازمی اراکین ہوتے ہیں۔ ٹرسٹ کی کم از کم سالانہ دو میٹنگ ہوتی ہے تاہم امیر شریعت کی ہدایت پر ناظم امارت شرعیہ اس کی میٹنگ کبھی بھی بلاسکتے ہیں۔

امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے شعبہ جات اور ان کی خدمات

امارت شرعیہ کے تحت حسب ذیل شعبہ جات مختلف قسم کی خدمات انجام دے رہے ہیں:

شعبہ نظامت

دفتر شعبہ نظامت، امارت شرعیہ کی نگرانی میں امارت شرعیہ کے سارے امورانجام دیے جاتے ہیں تاہم امارت شرعیہ کے ناظم، قاضی اور مفتی براہ راست امیر شریعت کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔

شعبہ دعوت وتبلیغ

امارت شرعیہ کا یہ اہم ترین شعبہ ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں دین کا گہرا تعلق پیدا کرنے، عام لوگوں تک دین کی دعوت پہنچانے، غیر اسلامی رسوم کو مٹانے، اصلاح معاشرہ، اشاعت اسلام کے علاوہ شدھی سنگھٹن تحریک، فتنہ ارتداد اور قادیانیت کا مقابلہ کرنے اور ان کے باطل افکار وخیالات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس شعبہ کو قائم گیا تھا۔ مذکورہ خدمات کے ساتھ ساتھ یہ شعبہ ملک میں پیش آنے والے قدرتی حادثات وآفات اور فسادات کے دوران متاثرین کی راحت رسانی کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ اس شعبہ کو مزید مضبوط کرنے کے لیے سابق امیر شریعت مولانا ولی رحمانیؒ اور موجودہ امیر شریعت نے چند عملی اقدام اٹھائے ہیں۔

شعبہ تنظیم

اس شعبہ کا شمار امارت شرعیہ کے بنیادی شعبہ جات میں ہوتا ہے۔ اس شعبہ کے قیام کا بنیادی مقصد مسلم آبادی کو ایک منظم زندگی پر ابھارنا ہے۔ اس شعبہ کے تحت کسی بھی گاؤں اور محلہ کی مسلم آبادی کو ایک یونٹ تسلیم کیا جاتا ہے اور وہاں کے باشندوں کو مقامی امیر "نقیب" کی ماتحتی میں زندگی گذارنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ "نقیب" کی ذمہ داریوں میں اپنے ماتحت علاقہ کی مسلم آبادی کو شریعت کے احکام کا پابند بنانا، ان کے اختلافات کو مقامی طور پر طے کرنے کی کوشش کرنا، بصورت دیگر فریقین کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرنا کہ کورٹ جانے کے بجائے دارالقضا سے رجوع کیا جائے۔ اس کی دیگر ذمہ داریوں میں قبرستان کا تحفظ کرنا، مسلم آبادی کا مختلف قسم کا سروے کرنا، مساجد کو آباد رکھنے کی کوشش کرنا، دینی وعصری تعلیم کا انتظام کرنا، مسلمانوں کی ہر قسم کی پس ماندگی کو دور کرنے کی سبیل کرنا، مرکز-امارت شرعیہ-سے جاری ہونے احکام کو وہاں کی آبادی تک پہنچانا، انہیں ملت کو درپیش مسائل سے آگاہ کرنا اور ان کے دینی وملی شعور کو بیدار کرنا اور زکوۃ وعشر اور صدقات کی وصولیابی اور انہیں اجتماعی طور پر خرچ کرنا وغیرہ شامل ہے۔

مذکورہ بالا شعبہ سے ہی امارت شرعیہ کا ترجمان "نقیب" شائع ہوتا ہے۔

شعبہ مذہبی اور عصری تعلیم

امارت شرعیہ کا قیام مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا لہذا اس پلیٹ فارم سے جہاں ایک طرف انہیں شرعی زندگی گذارنے کے طریقوں اور مناہج سے آگاہ کیا گیا وہیں ان میں دینی اور دنیاوی تعلیم کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے عملی اقدام کیے گئے۔ میری معلومات کی حد تک دینی تحریکات اور مذہبی تنظیموں میں امارت شرعیہ وہ واحد پلیٹ فارم ہے جس کے ذمہ داران نے روز اول سے امت مسلمہ کے نونہالوں کی دینی اور عصری تعلیم کی باضابطہ فکر کی ہے اور اس حوالہ سے عملی اقدام کیے ہیں۔

مذکورہ بالا نظام کے تحت امارت شرعیہ کے دائرہ کار میں شامل علاقہ جات میں سینکڑوں مدارس ومکاتب قائم کیے گئے ہیں۔ ان مکاتب کے پہلو بہ پہلو اعلی دینی تعلیم کے لیے المعہد العالی اور دارالعلوم الاسلامیۃ کا قیام عمل میں لایا جاچکا ہے۔

امارت شرعیہ کی ماتحتی میں وفاق المدارس الاسلامیۃ نامی ادارہ کام کررہا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد دینی مدارس اور اس کے مروجہ نظام میں ہر لحاظ سے تال میل پیدا کرنا اور یکسانیت کو فروغ دینا ہے۔ اس وفاق کے تحت اب تک بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ اور مغربی بنگال کے 276 مدارس منسلک ہو چکے ہیں۔

عصری تعلیم کے حوالہ سے پھلواری شریف میں قاضی نورالحسن میموریل اسکول اور آسنسول میں مولانا منت اللہ رحمانی اسکول کے علاوہ رانچی اور گریڈیہہ میں بھی اسلامی ماحول کو فراہم کرتے ہوئے سی بی ایس سی کے طرز پر انگلش میڈیم اسکول کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں اور بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے دیگر مقامات پر سی بی ایس سی کے طرز پر اسکول قائم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکیوں کے لیے علیحدہ تعلیمی نظام کو قائم کرنے کی مہم بھی چلائی جارہی ہے۔

عصری تعلیم کو فروغ دینے کے امارت شرعیہ نے باقاعدہ ایک ٹرسٹ بنایا ہے اور اسے "امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ" کے نام سے رجسٹرڈ کرایا ہے۔ یہ ٹرسٹ 1993ء سے اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے رہا ہے اور اس کے تحت مختلف مقامات پر آئی ٹی آئی اور پارامیڈیکل ادارے قائم کیے جاچکے ہیں جہاں سے ہزارہا بچے فارغ ہو کر باروزگار ہو چکے ہیں۔

شعبہ افتاء / دارالافتاء

اس شعبہ کی ذمہ داری کا اندازہ اس کے نام سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ روز اول ہی سے یہ شعبہ اپنی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے اور مسلمانوں کے مختلف مسائل کا حل دین وشریعت کی روشنی میں عمدہ انداز میں انجام دے رہا ہے۔ اس شعبہ کے ذریعہ دیے گئے فتاوی کی تعداد لاکھوں کو متجاوز کرچکی ہے۔ اب تک ان فتاوی کی پانچ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور چھٹی زیر ترتیب ہے۔

شعبہ قضاء / دارالقضاء

اس شعبہ کو گویا امارت شرعیہ کا عملی کردار کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بغیر امارت شرعیہ کا تصور ادھورا قرار پائے گا کہ مسلمانوں کے آپسی اختلافات کا تصفیہ دارالقضاء کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ امارت شرعیہ کے مرکزی دارالقضاء سے شائع ہونے والے فیصلے قدر کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں اور عموما فریقین دارالقضاء سے شائع ہونے والے فیصلہ کا احترام کرتے ہیں۔امارت شرعیہ سے صادر ہونے فیصلوں کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور باقی زیر ترتیب ہیں۔

پھلواری شریف میں مرکزی دارالقضاء کو چھوڑ کر امارت شرعیہ نے اپنے دائرہ عمل میں شامل علاقوں میں تقریبا اکیاسی (81) دارالقضاء قائم کیے ہیں جو مسلمانوں کے آپسی اختلافات کو شریعت کی روشنی میں دور کرنے میں شب وروز مصروف عمل ہیں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔امارت شرعیہ کے ماتحت چلنے والے دارالقضاء کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے وہاں صرف بہار واڑیسہ اور جھارکھنڈ سے آئے ہوئے مسائل وقضایا کو ہی فیصل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں اور پڑوسی ملک نیپال سے بھی آنے والے مسائل وقضایا کو شریعت کی روشنی میں حل اور فیصل کیا جاتا ہے۔

شعبہ خدمت(تحفظ مسلمین)

یہ شعبہ زمینی حقائق کی بنیادوں پر کام کرتا ہے یعنی جب کبھی بھی مسلمانوں کے عقائد،اسلام اور مسلمانوں سے متعلق دیگر امور جیسے وقف اور پرسنل لاء وغیرہ پر آنچ آتی ہے تو اس شعبہ کے منتظمین اور کارکنان سڑک پر آکر کام کرتے ہیں اور مسلمانوں کے عقائد اور پرسنل لاء کو بچانے کی عملی کوششیں کرتے ہیں۔

شعبہ بیت المال

اس شعبہ کی حیثیت امارت شرعیہ کے خزانہ کی ہے کہ اس میں زکوۃ،صدقات،خیرات اور دیگر مد کی رقوم جمع کی جاتی ہیں اور انہیں قوم وملت کی مختلف ضرورتوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔مختلف النوع مصائب کے مواقع پر امارت شرعیہ اپنے بیت المال کا منھ کھول دیتی ہے اور متاثرین کی بلا تفریق وملت مدد کرتی ہے۔اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک شعبہ "شعبہ ریلیف فنڈ" کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

بیت المال کے حوالہ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہاں جمع ہونے والی رقوم کو ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک کے ضرورت مندوں میں بھی خرچ کیا جاتا رہا ہے جیسے جنگ بلقان وسمرنا،عرب واسرائیل جنگ کے علاوہ 1934ء میں آنے والے زلزلہ کے متاثرین کی لاکھوں میں مدد کی گئی تھی لیکن غالبا اب اس ضمن میں کوئی سرگرمی نہیں پائی جاتی ہے۔

دارالمشاریع(شعبہ منصوبہ سازی)

منصوبہ بندی کسی بھی قوم اور تحریک وتنظیم کے لیے ریڑھ کی حیثیت رکھتی ہے کہ جتنی عمدہ اور بہتر منصوبہ بندی ہوگی اتنے ہی بہترین نتائج سامنے آئیں گے۔منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے امیر شریعت سابع علیہ الرحمہ نے اس کے لیے ایک باقاعدہ شعبہ "دارالمشاریع" قائم کیا تاکہ امارت شریعہ کے تمام شعبوں کے لیے منصوبہ سازی کی جاسکے اور جدید اصول وتقاضوں پر عمل کرتے ہوئے انھیں زمینی سطح پر لایا جاسکے۔غالبا امارت شرعیہ وہ واحد تنظیم ہے جہاں مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے ایک باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔

شعبہ امور مساجد

اسلامی معاشرہ میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ بیک وقت عبادت گاہ، تعلیم گاہ اور تربیت گاہ ہے۔ اس کی یہ حیثیت عہد نبوی سے لے کر آج تک برقرار ہے۔ امارت شرعیہ کے دائرہ عمل میں ہزارہا مساجد آتی ہیں۔ ان مساجد کے ائمہ وخطبا کی تربیت اور ٹریننگ کے لیے مذکورہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ عملی تربیت کے ساتھ انھیں مختلف قسم کا لٹریچر بھی فراہم کرایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کی مدد سے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح ادا کرنے کے قابل ہو سکیں۔ امیر سابع مولانا ولی رحمانیؒ نے اس شعبہ پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے اس کا ایک باقاعدہ آفس قائم کیا تھا اور ان کے جانشین موجودہ امیر شریعت ان کے منصوبوں کو مکمل کرنے میں پوری طرح سنجیدہ ہیں۔

مذکورہ بالا شعبوں کے علاوہ شعبہ نشر واشاعت، شعبہ تعمیرات، شعبہ اصلاحات آراضی اور شعبہ تحفظ اوقاف (وقف سروے آفس) نامی شعبہ جات بھی اپنی اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ مؤخر الذکر دو اداروں میں سے پہلے کی بنا امیر شریعت سابع نے اور دوسرے کی بنا موجودہ امیر شریعت نے رکھی ہے۔ اول الذکر شعبہ کے قیام کا بنیادی مقصد غیر منقولہ جائیدادوں کا تحفظ اور ان کے حوالہ سے پیش آنے والے مسائل کا تصفیہ کرنا ہے جب کہ مؤخر الذکر شعبہ کے قیام کا بنیادی مقصد اوقاف کا تحفظ اور بہترین ڈھنگ سے ان کا استعمال کرنا ہے۔ موجودہ امیر شریعت کو اس شعبہ کو قائم کرنے کی تحریک امارت شرعیہ کے بانی مولانا ابوالمحاسنؒ دیگر کے طرز عمل سے ملی تھی۔

امرائے امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ

نام	مدت
مولانا سید شاہ بدرالدین قادریؒ (1852-1924ء)	26جون 1921ء تا 16 ستمبر 1924ء
مولانا سید شاہ محی الدین قادریؒ (1879-1947ء)	8اکتوبر 1924ء تا 21اپریل 1947ء
مولانا سید شاہ قمرالدین الدین قادریؒ (1895-1957ء)	27جون 1947ء تا 2مارچ 1957ء
مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ (1912-1991ء)	25مارچ 1957ء تا 19مارچ 1991ء
مولانا عبدالرحمنؒ (1903-1998ء)	31مارچ 1991ء تا 29 ستمبر 1998ء
مولانا سید نظام الدینؒ (1927-2015ء)	یکم نومبر 1998ء تا 17اکتوبر 2015ء
مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ (1943-2021ء)	29نومبر 2015ء تا 3اپریل 2021ء
مولانا سید احمد ولی فیصل رحمانی صاحب (ولادت:؟؟)	9اکتوبر 2021ء تا حال

نائبین امرائے امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ

نام	مدت
مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ	26جون 1921ء-18نومبر 1940ء
مولانا عبدالصمد رحمانیؒ (م 1973ء)	23مارچ 1943ء-4مئی 1973ء
مولانا عبدالرحمنؒ (1903-1998ء)	16جون 1973ء-31مارچ 1991ء

مولانا سید نظام الدینؒ (1927-2015ء)	12 مئی 1991ء-31 اکتوبر 1998ء
مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	24 جون 1999ء-4 اپریل 2002ء
مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ (1943-2021ء)	3 اپریل 2005ء-28 نومبر 2015ء
مولانا محمد شمشاد رحمانی قاسمی صاحب (ولادت؟؟)	21 مارچ 2021ء تاحال

امارت شرعیہ کی اہم دینی وملی خدمات

امارت شرعیہ کی دینی وملی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس نے مختلف محاذ پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے اور ان ترقی کے لیے کئی ایک اہم اقدامات کیے ہیں۔اس کی اہم خدمات میں مسلمانوں کی ملی شیرازہ بندی، بیت المال، دارالقضاء ودارالافتاء کا قیام، مشرکانہ مراسم سے توبہ اور عقائد واعمال کی اصلاح، نشہ خوری سے بچانے کی کوشش، صلح وآشتی کے لیے عملی اقدامات، اسلام کی دعوت، تحریک شدھی سنگھٹن کا مقابلہ، ارتداد سے محفوظ رکھنے کی عملی تدابیر، مکاتب ومساجد کا جال پھیلانا، گدی قوم کی اصلاح، جرائم پیشہ افراد میں اسلام کی تبلیغ، فسادات میں ہر قسم کی امداد فراہم کرنا، مسئلہ فلسطین کی حمایت، مختلف مسائل میں حکومت وقت کے خلاف احتجاج کرنا، عقد ثانی کو فروغ دینا، قومی آفات کے موقع پر ہر قسم مدد کرنا، تعاون باہمی کو فروغ دینا وغیرہ شامل ہیں۔

4.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مسلمانان ہند کی فلاح وبہبود کے لیے قائم کی جانے والی اہم تنظیموں میں جمیعۃ علماء ہند، نئی دہلی اور امارت شرعیہ، پھلواری شریف، بہار کا شمار ہوتا ہے جن کا بنیادی مقصد مسلمانان ہند کی مذہبی ودینی، ملی وقومی، سیاسی اور سماجی شناخت کو اجاگر کرنا تھا۔اول الذکر کے پیش نظر سیاست کو اولیت حاصل تھی کہ ملک کو کیونکر آزاد کرایا جاسکتا ہے اور دین کے بتائے ہوئے راستے پر اس ملک میں کیسے زندگی گذاری جاسکتی ہے۔موخر الذکر کا بنیادی مقصد شریعت کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق زندگی گزارنا تھا جس میں سیاست بھی شامل تھی لیکن اسے ثانوی حیثیت حاصل تھی۔
- دونوں تنظیموں کا ایک اہم مقصد مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا تاکہ وہ اجتماعی زندگی اسلامی قانون کی روشنی میں گذار سکیں۔
- جمیعۃ علماء ہند کے پہلے صدر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے اور موجودہ صدر مولانا سید ارشد مدنی صاحب ہیں۔جمیعۃ علماء ہند (متحدہ) کے اب تک 6 صدر ہو چکے ہیں۔جمیعۃ علماء ہند کی تقسیم کے بعد ارشد مدنی گروپ کے صدر مولانا محمد ارشد مدنی ہیں جب محمود مدنی گروپ کے پہلے صدر مولانا عثمان منصور پوریؒ تھے اور ان کے انتقال کے بعد مولانا محمود مدنی صاحب صدارت کے عہدہ پر فائز ہیں۔
- مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے امارت شرعیہ، بہار کی بنیاد 26 جون 1921ء کو رکھی تھی جس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی

اجتماعی زندگی گرازنے کا ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا تاہم اس کا دائرہ کار ملک، ملت اور سماج کی ہمہ جہت ترقی پر محیط ہے۔ امارت شرعیہ، بہار کے پہلے امیر مولانا سید شاہ بدرالدین قادری اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد پہلے نائب امیر شریعت تھے۔

4.5 نمونہ امتحانی سوالات

4.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جمیعۃ علماء کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا تھا؟

(a)چندی گڑھ (b)لکھنؤ (c)امرتسر (d)دیوبند

2. جمیعۃ علماء ہند کے عہدیداران کا انتخاب کتنے سال بعد ہوتا ہے؟

(a)ایک (b)دو (c)تین (d)چار

3. جمیعۃ علماء ہند کے لیگل سیل، اب تک کتنے افراد کو رہائی دلوا چکی ہے؟

81(a) 181(b) 281(c) 381(d)

4. جمیعۃ علماء ہند کے پہلے مستقل صدر کون تھے؟

(a)مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (b)مفتی محمد کفایت اللہؒ (c)مولانا محمد علی مونگیریؒ (d)مولانا محمود الحسنؒ

5. جمیعۃ علماء ہند کے پہلے عارضی صدر کون تھے؟

(a)مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (b)مفتی محمد کفایت اللہؒ (c)مولانا محمد علی مونگیریؒ (d)مولانا محمود الحسنؒ

6. امارت شرعیہ کے قیام کا محرک کون تھا؟

(a)مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (b)مفتی محمد کفایت اللہؒ (c)مولانا محمد علی مونگیریؒ (d)مولانا محمود الحسنؒ

7. امارت شرعیہ کیا قیام کب عمل میں آیا تھا؟

1918(a) 1919(b) 1920(c) 1921(d)

8. اب تک کتنے امیر شریعت مقرر ہو چکے ہیں؟

10(a) 9(b) 8(c) 7(d)

9. امیر شریعت ثامن کا کیا نام ہے؟

(a)مولانا عبدالرحمن صاحب (b)مولانا سید نظام الدین صاحب

(c)مولانا منت اللہ رحمانی صاحب (d)مولانا احمد ولی فیصل صاحب

10. پہلے نائب امیر شریعت کون تھے؟

(a)مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ (b)مفتی محمد کفایت اللہؒ (c)مولانا عبدالصمد رحمانیؒ (d)مولانا قاضی مجاہد

4.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی جمعیۃ علماء ہند کا تنظیمی ڈھانچہ کتنی اکائیوں پر مشتمل ہے اور وہ کن کن عہدیدارن پر مشتمل ہوتی ہیں؟
2. جمعیۃ علماء ہند کی مذہبی، دینی اور تعلیمی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. امارت شرعیہ کے مقاصد پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے تنظیمی ڈھانچہ ایک نوٹ لکھیے۔
5. امیر شریعت ثانی پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے پس منظر اور اس کے مقاصد پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. جمعیۃ علماء ہند کے شعبہ جات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. امارت شرعیہ کے شعبہ جات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

4.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جمعیۃ العلما کیا ہے؟(حصہ اول و دوم) از مولانا سید محمد میاں، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی 6، ب ت۔
2. پاسبان ہند جمعیۃ علماء ہند، تعارف، نظام عمل اور کارنامے (جلد اول و دوم) از مولانا جمیل اختر قاسمی، فرید بک ڈپو، نیو دہلی، 2023ء۔
3. جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ، تجاویز اور فیصلوں کی روشنی میں (جلد اول و دوم) از محمد یاسین حجازی، شعبہ نشر و اشاعت، جمعیۃ علماء ہند، نئی دہلی، ب ت۔
4. امارت شرعیہ، دینی جدوجہد کا روشن باب از مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ، مکتبہ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، پھلواری شریف، پٹنہ، ربیع الاول 1394 / اپریل 1974۔
5. تاریخ امارت از مولانا عبدالصمد رحمانی، طبع دوم، 1369ھ۔
6. محاسن سجاد از مسعود عالم ندوی، کتب خانہ عزیزیہ، دہلی، 1941ء۔
7. حیات سجاد از مولانا انیس الرحمن قاسمی، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، 1998ء۔
8. چند معاصر شخصیات اور ان کے اجتہادی افکار از پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، نومبر 2020ء

اکائی 5: مشہور تحریکات: سنی بریلوی جماعت، تبلیغی جماعت

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 سنی بریلوی جماعت کا تعارف

5.3 مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856-1921)

5.4 عقائد اور افکار و نظریات

5.5 خدمات

5.5.1 مدارس

5.5.2 اشاعتی ادارے

5.5.3 مختلف رضا کارانہ تنظیمیں

5.5.4 مناظرے

5.6 تبلیغی جماعت کا تعارف

5.7 مولانا محمد الیاس (1885-1944)

5.8 آغاز وارتقا

5.9 اغراض و مقاصد اور طریقہ کار

5.10 خدمات

5.11 کلیدی الفاظ

5.12 اکتسابی نتائج

5.13 نمونہ امتحانی سوالات

5.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

5.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں متعدد تجدیدی جماعتیں اور اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں۔ ان ہی میں سے ایک جماعت 'اہل سنت والجماعت' کی ہے جسے 'سنی بریلوی حنفی جماعت' بھی کہا جاتا ہے اور دوسری اصلاحی تحریک تبلیغی جماعت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں کے بعض افکار و نظریات اور طریقہ کار میں اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ ان کا بنیادی مقصد احیائے اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور سماجی حالات کو بہتر سے بہتر بنانا تھا۔ اس لیے انہوں نے افراد کی ہدایت وتربیت کے علاوہ تعلیم اور اس کی نشرواشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ بریلوی جماعت اور تبلیغی جماعت کی اہم بات یہ تھی کہ دونوں نے اسلامی بصیرت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزی حیثیت دی اور دیگر ہندوستانی تحریکات کی طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی فکری روایات سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا۔ اس اکائی میں ان دونوں جماعتوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل سنت والجماعت (بریلوی جماعت) اور تبلیغی جماعت سے کیا مراد ہے؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ ان کے بانی کون ہیں؟ ان کا قیام کب عمل میں آیا؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ ان کے افکار و نظریات کیا ہیں؟ ان کا طریقہ کار کیا ہے؟ ان کی خدمات کیا رہیں؟ ان جماعتوں نے ہندوستانی مسلمانوں پر کس طرح کے اثرات مرتب کیے ہیں۔

5.2 سنی بریلوی جماعت کا تعارف

اہل سنت والجماعت یعنی سنی بریلوی جماعت کا قیام شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا۔ اس جماعت کے ایک اہم محرک مولانا احمد رضا خاں (1856-1921) تھے۔ انہوں نے اسے ایک مکتب فکر کے طور پر عوام میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے متبعین انہیں بانی سے زیادہ دین کا مجدد تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خاں نے دین کی تجدید واحیاء کا کارنامہ اس وقت انجام دیا تھا جب مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو بھلا چکے تھے اور اسلام کے راستے سے منحرف ہو چکے تھے۔ ان حالات میں انہوں نے لوگوں کو متنبہ کرنے اور راہ راست پر لانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے اعتراف میں مجلس اہل سنت وجماعت کی جانب سے پٹنہ میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس (1900) میں نہ صرف مولانا

احمد رضا خاں کو اس جماعت کے قائد ہونے کا اعلان کیا گیا، بلکہ انہیں اتفاق رائے سے چودھویں صدی ہجری کا مجدد بھی تسلیم کیا گیا۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس فکر کے حاملین خود کو بریلوی کہلانے کے بجائے 'اہل سنت والجماعت' کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بریلوی انہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی نسبت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی جانب کی جاتی ہے، جو بریلی شہر کے رہنے والے تھے۔ بریلی شہر اس وقت روہیل کھنڈ کا حصہ تھا اور اب موجودہ اتر پردیش کا ایک شہر ہے۔

بنیادی طور پر یہ جماعت محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادے بالخصوص حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کے بعض دینی افکار اور علمائے دیوبند وغیرہ کی تحریک کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ اختلافات کے اسباب میں سب سے اہم سبب پیغمبر اسلام کی مسلمانوں کے تعلق سے حقیقت و اہمیت کے بارے میں دیگر جماعتوں کے افکار و نظریات تھے، چنانچہ اہل سنت و الجماعت (بریلوی جماعت) کے علماء نے اس موضوع کے علاوہ بعض دیگر موضوعات جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، اولیاء اور پیروں سے توسل کا جائز یا ناجائز ہونا، جمعہ کی نماز کے لیے اذان دینے کی صحیح شرعی صورت وغیرہ پر دیوبندی، تبلیغی، اہل حدیث، قادیانی اور ندوۃ العلماء کے علماء کرام سے مناظرے کیے اور ان کے خلاف تحریریں بھی لکھیں۔ وہ علماء جنہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اہل سنت و جماعت تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور مولانا احمد رضا خاں کے دست راست بنے رہے، ان میں مولانا وصی احمد، دیدار علی الوری، ارشاد علی رام پوری، عبدالمقتدر بدایونی اور سید محمد میاں کچھوچھوی وغیرہ کا نام خصوصی طور پر لیا جاسکتا ہے۔

5.3 مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856-1921)

مولانا احمد رضا خاں کی پیدائش 14 جون 1856 کو موجودہ اتر پردیش کے ایک شہر بریلی (روہیل کھنڈ) میں ہوئی۔ ان کا اصل نام محمد اور تاریخی نام 'المختار' تھا۔ جد امجد نے احمد رضا نام رکھا اور بعد میں مولانا احمد رضا خاں نے اس میں 'عبدالمصطفیٰ' کا اضافہ کیا۔ ان کے معتقدین انہیں 'اعلیٰ حضرت' اور 'فاضل بریلوی' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ نسب میں پٹھان (روہیلہ)، مسلک میں حنفی اور تصوف میں قادری تھے، اس لیے کہ انہوں نے 1877 میں اپنے والد ماجد نقی علی خان کے ساتھ سید شاہ آل رسول مارہروی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی اور مختلف سلاسل طریقت میں خلافت و اجازت حاصل کی تھی، نیز ممدوح کے علاوہ دوسرے مشائخ سے بھی بعض سلسلوں میں اجازت لی تھی، جیسے قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، علویہ وغیرہ۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو تعلیم و تعلم کا شغف ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد ماجد نقی علی خاں اور جد امجد رضا علی خاں بھی اپنے زمانے کے مشہور عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ اس لیے مولانا احمد رضا خاں نے بیشتر علوم و فنون جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم ہندسہ وغیرہ اپنے والد سے ہی حاصل کیے تھے، نیز بعض علوم و فنون کے حصول کے لیے انہوں نے مختلف ہم عصر علماء کے سامنے زانوئے تلمذ کیا۔ ان کے مشہور اساتذہ میں مرزا غلام قادر بیگ، مولانا ابوالحسین (نوری میاں)، شیخ احمد بن زینی دحلان مکی، شیخ عبدالرحمان مکی، شیخ

حسین بن صالح مکی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں علوم وفنون سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں مصروف ہو گئے۔ ان کے شاگردوں اور خلفاء کی ایک بڑی تعداد ایسی رہی جنہوں نے ان سے کسب فیض کیا اور ان میں سے بعض تو اپنے علم و فن میں بہت مشہور ہوئے جیسے حامد رضا خان، ظفر الدین بہاری، سید احمد شرف گیلانی، مبلغ اسلام مولوی عبد العلیم میر ٹھی، برھان الحق جبل پوری، مولوی حسنین رضا خاں بریلوی، مفتی ابو یوسف محمد شریف سیالکوٹی، مولوی امجد علی، مولوی امام الدین سیالکوٹی، مفتی مکہ مکرمہ شیخ محمد سعید شافعی اور سید غلام جان جام جودھ پوری وغیرہ۔ جہاں تک تصانیف کی بات ہے تو کہا جاتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے پچاس (50) مختلف علوم وفنون جیسے قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، سوانح اور مسائل نزاعیہ وغیرہ پر ایک ہزار سے زائد کتابیں اور رسالے تصنیف کیے تھے۔ حیات اعلیٰ حضرت (محمد ظفر الدین بہاری)، قاموس الکتب اردو (انجمن ترقی اردو)، تذکرہ علمائے حال اور تذکرہ علماء ہند (رحمان علی) میں ان کی کتابوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان کی مشہور تصانیف میں 'کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن'، 'فتاویٰ رضویہ' (العطایا النبویۃ فی فتاویٰ الرضویۃ)، اور 'الملفوظ' وغیرہ ہیں۔ اسی طرح انہوں نے تقریباً اسی (80) کتابوں کے حواشی اور تعلیقات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ 1878 میں جب وہ پہلی بار اپنے والد کے ساتھ مکہ مکرمہ حج کے لیے گئے تو وہاں ان کی ملاقات شیخ حسین بن صالح سے ہوئی، انہوں نے اپنی تالیف 'الجوھرۃ المضیئۃ' کی عربی شرح لکھنے کی گزارش کی تو انہوں نے اس کی شرح لکھی اور اس کا نام 'النیرۃ الوضیۃ فی شرح الجوھرۃ المضیئۃ' رکھا اور پھر اس میں تعلیقات و حواشی کا اضافہ کر کے اس کا نام 'الطرۃ الرضیۃ علی النیرۃ الوضیئۃ' کر دیا۔

مولانا احمد رضا خاں 1905 میں جب دوسری بار حج کے لیے تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ کے علماء نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور کرنسی سے متعلق ایک ایسا مسئلہ ان سے دریافت کیا جو وہ خود حل کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے عربی زبان میں اس کا تحریری جواب دیا اور اس کا نام 'کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم' رکھا۔ اسی طرح مولانا موصوف نے علمائے مکہ کی جانب سے مسئلہ علم غیب سے متعلق استفسار پر 'الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ' نامی کتاب لکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں کو مکہ مکرمہ کے علماء بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے پہلے حج میں مکہ مکرمہ کے دو اہم مفتیان کرام یعنی سید احمد دحلان شافعی اور عبد الرحمن سراج حنفی سے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں سند اور اجازت حاصل کی اور اول الذکر نے مقام ابراہیم میں جب انہیں دیکھا تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ان کی پیشانی کو کافی دیر تک دیکھنے کے بعد فرمایا کہ میں نے اس میں اللہ کا نور دیکھا ہے۔ پھر انہوں نے مولانا کو نئے نام 'ضیاء الدین احمد' سے نوازا، نیز انہیں حدیث میں صحاح ستہ کی اور تصوف میں سلسلہ قادریہ کی ایک ایک سند اپنے دستخط کے ساتھ دی۔ اس سند میں امام بخاری اور حسین بن صالح کے درمیان صرف گیارہ واسطے تھے۔ دوسرے سفر حج میں مولانا احمد رضا خاں کی حیثیت شاگرد کے بجائے ایک استاد کی سی تھی اور انہوں نے متعدد علماء کو حدیث اور تفسیر میں اپنی دستخط کے ساتھ سند و اجازت دی۔ مسجد حرام کی لائبریری میں جب انہوں نے بعض لوگوں کو اس حوالے سے بحث کرتے ہوئے دیکھا کہ مغرب سے قبل رمی جمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور مکہ کے ایک عالم نے اسے جائز قرار دیا تو انہوں نے ان سے اختلاف کیا۔ پھر جب کتابوں میں اس مسئلہ کو تلاش کیا گیا تو جواب مولانا احمد رضا خاں کے مطابق

تھا۔ان مثالوں سے بھی ان کی علمی عبقری شخصیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی علمی خدمات میں ان کی فتویٰ نویسی کو اہم مقام حاصل ہے۔انہوں نے صرف 16 سال کی عمر میں اپنے والد کی جگہ لے لی تھی اور تقریباً پچاس سال تک اسی میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔اس کے ذریعے ہی انہوں نے دین سے متعلق نہ صرف اپنا نظریہ پیش کیا اور علماء وقت کے ساتھ مناظرے اور مباحثے کیے، بلکہ اپنی ان علمی صلاحیتوں سے جو قرآن وحدیث اور فقہ میں احناف کی کتابوں کے استدلال پر مبنی تھیں، اپنے نظریات کا دفاع کیا۔علامہ اقبال نے بھی ان کی فقیہانہ بصیرت کا اعتراف کیا ہے اور بقول ڈاکٹر عابد احمد علی انہوں نے ایک مجلس میں کہا:

"احمد رضا خاں کے فتاویٰ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ اجتہادی صلاحیتوں سے بہرور اور پاک وہند کے کیسے نابغۂ روزگار فقیہ تھے۔"

مولانا بریلوی کی جد الممتار اور فتاویٰ رضویہ کو فقہ کے میدان کی اہم کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ان کا ایک اہم علمی کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ 'کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن' (1911) ہے۔اس کے حواشی 'خزائن العرفان فی تفسیر القرآن' کے عنوان سے مولوی نعیم الدین مرادآبادی نے تحریر فرمائے ہیں۔اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جن آیات کے ترجموں میں ذرا سی بے احتیاطی سے حق جل مجدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بے ادبی کا شائبہ نظر آتا ہے، احمد رضا خاں نے ان کے حوالے سے خصوصی احتیاط کی ہے۔انہیں شعر وشاعری سے بھی بہت دل چسپی تھی۔یوں تو انہوں نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن نعت گوئی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے قرآن کریم سے نعت گوئی سیکھی ہے، بہر حال ان کے نعتیہ مجموعے 'حدائق بخشش' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار اردو، فارسی، عربی اور ہندی زبانوں میں یکساں اور لائق تحسین ہوا کرتے تھے۔

مولانا احمد رضا خاں کی عمر کے آخری دور میں تحریک خلافت (1919) اور تحریک ترک موالات (1920) کا آغاز ہوا اور انہوں نے دونوں ہی تحریکوں کی مخالفت کی کیوں کہ وہ جوش وخروش کے بجائے سلامت روی کو ترجیح دیتے تھے۔انہوں نے اس مسئلہ پر ایک کتاب 'رسالہ المحجۃ الموتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ' لکھ کر مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ کفار ومشرکین سے اختلاط اور ان سے سیاسی اتحاد کافی نقصان دہ ثابت ہوگا، نیز شرعی لحاظ سے بھی وہ اسے صحیح نہیں سمجھتے تھے۔اسی طرح انہوں نے ہجرت افغانستان کی بھی مخالفت کی تھی کہ ہندوستان دارالسلام ہے، اس لیے یہاں سے ہجرت کرنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔بہر کیف مولانا احمد رضا خاں کا اصل میدان سیاست نہیں، بلکہ تعلیم وتدریس اور فتویٰ نویسی تھا اور اس میں انہوں نے یقیناً گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ان کی وفات 1921 میں بریلی میں ہوئی اور وہیں پر ان کی تدفین بھی ہوئی۔

5.4 عقائد اور افکار و نظریات

عام اہل سنت والجماعت (بریلوی جماعت) اپنے عقائد اور افکار و نظریات میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی ہی کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے

ہیں اوران کی ہی اتباع کرتے ہیں۔ان کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر وناظر ہیں اور دنیا کا ذرہ ذرہ آپؐ کی روحانیت و نورانیت کی جلوہ گاہ ہے،ایسی روحانیت و نورانیت جس کے لیے قریب اور دور دونوں مکانی یکساں ہیں۔اس لیے بیک وقت متعدد مقامات پر آپؐ کا موجود ہونا اور کئی مقامات پر حالت بیداری میں اولیاءاللہ کا آپؐ کی زیارت سے مشرف ہونا ممکن اور جائز ہے، کیوں کہ آپؐ نور ہیں اور نور کو اپنی نظر سے تمام دنیا کو دیکھنا اور متعدد مقامات پر موجود ہونا ممکن ہے۔ نیز آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب عطا کیا ہے، یہاں تک کہ 'پانچ غیبوں' میں سے بہت سی جزئیات کا بھی علم دیا ہے۔ حقیقتِ روح اور متشابہات قرآن کا علم بھی آپؐ کو عطا ہوا، تمام آئندہ وگزشتہ واقعات بھی جو لوح محفوظ میں ہیں، ان کا اور ان کے علاوہ واقعات کا بھی آپؐ علم رکھتے تھے۔ آپؐ نور تھے اور آپؐ کا سایہ نہیں تھا۔اسی طرح آپؐ کی بشریت دوسرے انسانوں کی بشریت سے مختلف ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ حاضر وناظر، نور اور عالم الغیب ہیں اس لیے آپؐ سے مدد مانگنا اور آپؐ کو پکارنا یا 'یارسول اللہ' کہنا جائز ہے۔ساتھ ہی یہ یقین بھی رکھنا چاہیے کہ جو کوئی آپؐ کو مدد کے لیے پکارتا ہے،اس کی آواز کو آپؐ نہ صرف سنتے ہیں بلکہ مدد کے لیے بھی پہنچتے ہیں۔اسی طرح یہ بھی یقین ہونا چاہیے کہ آپؐ کے علاوہ دوسرے اولیاءاللہ کو بھی مدد کے لیے پکارنا جائز ہے اور ارواح طیبہ کے لیے دیکھنے اور سننے میں دور اور نزدیک سب برابر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتے ہیں اور خدا کے نور کو کوئی چیز روک نہیں سکتی ہے۔اس لیے اولیاء کرام کی روحوں کے لیے کوئی پردہ نہیں ہے اور ان کے لیے ساری دنیا ایک جیسی ہے۔اسی طرح یہ بھی یقین رکھنا ہوگا کہ اولیاء کرام کی کرامات اور ان کے تصرفات ان کی وفات کے بعد بھی حسب سابق جاری رہتی ہیں اور ان کی وفات سے ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا ہے۔اس لیے ان کی نصرت و مدد ہر جگہ ہر وقت جاری وساری ہے اور اس کے لیے ان کے مزار پر ہی جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ وہ خود ہر جگہ موجود رہتے ہیں اور اس میں قریب اور دور کی کوئی شرط نہیں ہے۔

امت میں چالیس ابدال ہمیشہ رہیں گے جن کے طفیل میں اللہ تعالیٰ اہل زمین کی آفتوں کو ٹالتا رہے گا۔اسی طرح کچھ اولیاء بھی ہوں گے جن کے ذریعے خلق کی حیات،روزی،بارش،پودے اگانے اور آفتوں کے ٹالنے کا کام انجام پائے گا۔ نیز مردے قبروں میں سنتے، دیکھتے اور جانتے ہیں اوران کا علم سمع وبصر یوں تو ہمیشہ ہے مگر جمعہ کے دن اس میں اضافہ ہوجاتا ہے اور عام مردے بھی بلا تخصیص قبر پر آنے والے زائرین سے کلام کرتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔اسی لیے ان کے یہاں اولیاءاللہ کی نیاز اور ان کے مزارات پر جاکر ان سے مدد مانگنا جائز ہے۔اسی طرح جنازے کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھاکر دعا مانگنا، فاتحہ خوانی، تیجہ، چالیسواں اور برسی وغیرہ پر مردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے اچھے کھانوں پر ختم دلانا، قبر پر اذان دینا، مردے کے کفن پر کلمہ طیبہ لکھنا وغیرہ جائز ہے۔اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی گیارہویں دینا اور اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالنا نہ صرف جائز ہے،بلکہ ثواب کا کام ہے۔(اردو دائرہ معارف اسلامیہ:4/487-486)

درج بالا عقائد اورافکار و نظریات میں بعض کے حوالے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ وہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نہیں ہیں، کیوں کہ انہوں نے تو اپنی متعدد کتابوں میں محرمات ومنکرات شرعیہ اور بدعات وخرافات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، نیز تمام مسلمانوں کو

ان سے دور رہنے کی تلقین کی ہے، جیسے ان کا سجدہ تعظیمی کو ناجائز سمجھنا، نیز انہوں نے قبروں پر نماز پڑھنا، قبروں کو اونچا کرنا، مزار پر سجدہ کرنا، اس کا طواف کرنا، بوسہ دینا، عرس میں عورتوں کا قبروں کی زیارت کے لیے جانا یا قوالی سننا، درخت پر ہار لٹکانا، مرادیں مانگنا، لوبان سلگانا، شیرینی وغیرہ کی فاتحہ دلانا، قوالیوں میں ڈھول، سارنگی، بانسری اور باجہ وغیرہ کے استعمال، تعزیہ داری، طعام میت، میت کے گھر شادیوں کی طرح احباب اور دوستوں کی دعوتوں کا ہونا اور شب برأت میں آتش بازی وغیرہ کو اپنے فتاویٰ میں ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ سنی بریلوی جماعت کے ایک عالم دین یٰسین اختر مصباحی لکھتے ہیں:

"متعارف طور پر عہد رسالت و دور صحابہ و تابعین سے منقول و معمول جو عقائد و اعمال قدیم کتب تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف و سیرت و تاریخ میں موجود ہیں، وہی اہل سنت والجماعت (سنی بریلوی جماعت) کے عقائد واعمال ہیں۔ علماء فرنگی محل و لکھنؤ و خیر آباد و بدایوں و بریلی نے تحریر و تقریر کے ذریعے ہمیشہ ان ہی کی دعوت دی ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تعلیمات و نظریات کے صحیح داعی و ترجمان بھی یہی ہیں، جو اسلام کے وارث و امین ہیں۔ جو کسی دخیل فکر، جدید نظریے اور غیر اسلامی خیال کو ایک لمحہ کے لیے بھی قبول بلکہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنی قدیم وراثت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور اسے ہی اپنے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سرمایۂ سعادت و ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔"

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بریلوی جماعت کی تعمیر و ترقی میں بریلی، بدایوں اور رام پور کے علماء کا اہم کردار رہا ہے، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کے درمیان بعض عقائد اور افکار و نظریات کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے، جیسے بدایوں وغیرہ کے بریلوی علماء سجدہ تعظیمی، قوالی، سماع اور عورتوں کے مزار وغیرہ جانے کو جائز سمجھتے ہیں، جب کہ مولانا احمد رضا خاں نے ان سب کو غلط اور ممنوع ثابت کرتے ہوئے ناجائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح سے خانقاہی علماء اور بریلوی علماء کے درمیان فکری اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

5.5 خدمات

مولانا احمد رضا خاں کے تصور دین اور ان کے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں ان کے ہم خیال علماء اور طلبہ کا اہم کردار رہا۔ انہوں نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مختلف اداروں، تعلیم و تدریس، تصنیف و تحقیق اور مناظرے و مباحثے کے ذریعے مولانا کے خیالات کو عوام تک پہنچایا۔ اس کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں بہ کثرت تنظیمیں، مساجد، مدارس، کتب خانے اور تصنیفی و اشاعتی ادارے قائم کیے گئے، جن کے تحت تعلیمی اور مذہبی خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ اسی طرح سے متعدد مقامات پر اس جماعت کی جانب سے سماجی و رفاہی کام بھی کیے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

5.5.1 مدارس

مولانا احمد رضا خاں نے شروع میں عوام کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ اس وقت کے مدارس کی تعداد کو کافی سمجھتے ہوں اور یوں بھی ان کا زیادہ وقت فتویٰ نویسی میں گزرتا تھا۔ بہر کیف انہوں نے 1904 میں بریلی میں مدرسہ مظہر العلوم

کی بنیاد ڈالی، اسے مدرسہ اہل سنت، دارالعلوم منظر الاسلام کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے قیام میں مولانا موصوف کے ایک شاگرد مولانا ظفر الدین بہاری کا اہم کردار تھا۔ احمد رضا خاں اس مدرسہ کے سرپرست تھے اور سال میں ایک مرتبہ وہ مدرسہ کے جلسۂ دستار بندی کے اجتماع کو خطاب کرتے تھے، جس میں شہر کے معزز علماء، صوفیاء اور قابل ذکر شخصیات شریک ہوتی تھیں۔ اہل سنت و جماعت کا دوسرا قدیم مدرسہ، مدرسہ عالیہ راج پور تھا، اسے اٹھارہویں صدی عیسوی میں قائم کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اہل سنت و جماعت کی جانب سے متعدد حنفی مدارس قائم کیے گئے۔ یہ مدارس اپنے قد و قامت میں چھوٹے بڑے اور ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ بعض اہم مدارس میں مولانا وصی احمد محدث سورتی کا پیلی بھیت میں 1893 میں قائم کردہ مدرسۃ الحدیث، بدایوں میں مولانا عبدالقیوم کا 1899 میں قائم کردہ مدرسہ شمس العلوم، پٹنہ میں مولانا قاضی عبدالواحد فردوسی عظیم آبادی کا 1900 میں قائم کردہ مدرسہ حنفیہ، مراد آباد میں مولانا نعیم الدین مرادآبادی کا 1920 میں قائم کردہ مدرسہ نظامیہ اور لاہور میں دیدار علی الوری کا 1976 میں قائم کردہ دارالعلوم حزب الاحناف وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مدرسہ نظامیہ، مراد آباد کو 1933-34 میں جامعہ یعنی بڑی علمی درس گاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، نیز ابتدائی زمانے میں اسے مدرسہ اہل سنت و جماعت، مراد آباد کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ ان تمام مدارس کا مقصد اہل سنت و جماعت علماء کے درمیان ربط و اتصال قائم کرنا اور نئے قائدین کی تربیت کرنا تھا۔ ابتدا میں مدارس کے نظم و نسق کے لیے چندہ وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا کیوں کہ مولانا موصوف اس کے قائل نہیں تھے، البتہ ان کی وفات کے بعد مقامی لوگوں سے چندہ کی اپیل کرنا اور چندہ لینے کا عمل جاری ہوگیا۔ مدارس میں طلبہ کے لیے متعین نصاب ہوا کرتا تھا اور امتحانات میں اعلیٰ نمبرات لانے والوں کو خصوصی انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ اسی طرح ان مدارس میں دارالافتاء اور مناظروں و مباحثوں کے شعبے وغیرہ قائم کیے جاتے رہے تھے اور ہر مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھی شائع ہوتی تھی۔

5.5.2 اشاعتی ادارے

اہل سنت و جماعت (بریلوی جماعت) نے اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کتابوں اور رسالوں کا سہارا لیا، نیز اسے مسلکی کش مکش، مناظروں و مباحثوں وغیرہ میں اپنے نظریات کی حمایت کے لیے بھی بہ کثرت کتابیں یا کتابچوں کو شائع کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ عوام کو اپنے مقاصد سے آگاہ کرایا جاسکے، چنانچہ اس کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں متعدد پریس اور اشاعتی ادارے قائم کیے گئے، جیسے انیسویں صدی کے اواخر میں بریلی میں اہل سنت و جماعت کے دو پریس تھے۔ اول حسنی پریس، جو مولانا احمد رضا خاں کے بھتیجے حسنین رضا کی سرپرستی میں اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ دوم مطبع اہل سنت و جماعت، جو امجد علی اعظمی کی نگرانی میں رواں دواں تھا۔ ان دونوں ہی مطبعوں سے مولانا موصوف اور بعض دیگر علماء کرام کی کتابیں اور فتاویٰ وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ ان اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں اور رسالوں کی تعداد پانچ سو سے ہزار تک ہوا کرتی تھی۔ مولانا احمد رضا خاں کی زیادہ تر کتابیں اور فتاویٰ ان ہی مطبعوں سے شائع ہوئی ہیں، نیز مولانا کے خلفاء اور شاگردوں کی تحریروں کی اشاعت بھی ان دونوں اداروں سے ہوا کرتی تھی۔

رسائل وجرائد

اہل سنت وجماعت کی جانب سے متعدد رسائل وجرائد بھی نکالے گئے، ان میں مولانا حسنین رضاکا رسالہ 'الرضا'(1920)، قاضی عبدالواحد عظیم آبادی کا رسالہ 'تحفۂ حنفیہ'(1897-98)، 'یادگارِ رضا'، مولانا حامد رضا خاں کی سرپرستی میں 'رد مرزائیت' اور 'دبدبۂ سکندری' وغیرہ کا خصوصی طور پر ذکر کیاجاسکتاہے۔ آخر الذکر رسالہ 1864 میں رام پور سے شائع ہوا اور اس کے مدیر اور نائب مدیر انیسویں صدی میں مولانا محمد فاروق حسن اور بیسویں صدی میں محمد فضل حسن تھے۔ ان تمام رسائل وجرائد کا بنیادی مقصد اسلام اور اہل سنت وجماعت کے پائے کو دوام بخشنا تھا اور ان کے دشمنوں کو علمی میدان میں زیر کرنا تھا۔ ان میں بالعموم عقائد، فقہ، حدیث، پیغمبر اسلام ،خلفائے راشدین کے واقعات، ندوۃ العلماء کے خلاف مہم، بین الاقوامی وقومی اہم خبریں، سیاسی خبریں، فتاویٰ، مناظرانہ بحثیں، اہل سنت وجماعت کے مدارس کی اہم خبریں، مختلف سلسلہ تصوف کے علمی اختلافات، عرس کے اعلانات، نعتیں، رمضان میں سحری وافطار کے اوقات کے علاوہ نماز کے اوقات وغیرہ کا بھی احاطہ کیاجاتا تھا۔

5.5.3 مختلف رضاکارانہ تنظیمیں

اہل سنت وجماعت نے اسلام کی نشرواشاعت، اپنے مقاصد کی دعوت وتبلیغ اور اجتماعی مفادات کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں میں متعدد رضاکارانہ تنظیموں کی تشکیل کی۔ ان میں دو تنظیمیں بہت مشہور ہوئیں۔ اول 'جماعت رضائے مصطفیٰ'(1924)، جس کا مقصد آریہ سماج کے ذریعے شدھی کرکے ہندو بنالیے گئے مسلمانوں کو دوبارہ اسلام کی طرف لانا تھا۔ دوم 'انصار الاسلام'، جس کا مقصد پہلی عالمی جنگ میں شکست کھائے ہوئے ترکوں کی ہر ممکن مدد کرنا تھا، نیز مسلمانانِ ہند کی اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی، تمدنی اور اقتصادی رہ نمائی کرنا تھا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد انجمنیں اور کمیٹیاں قائم کی گئیں، ان میں انجمن اہل سنت بریلی، انجمن اہل سنت مراد آباد اور حلقہ اہل سنت سکندرآباد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر انجمنیں متعلقہ شہر کے اہل سنت وجماعت کے مدارس سے وابستہ ہوا کرتی تھیں اور ان کی ذمے داریوں میں یہ شامل تھا کہ وہ اپنی سرپرستی میں عرس یا دستار بندی وغیرہ کے موقع پر بڑے پیمانے پر اجلاس کرائیں اور سالانہ رپورٹ شائع کریں۔ اسی طرح بعض انجمنوں کے عہدے داران آریہ سماج یا دیگر مسلک کے علماء سے بحث ومباحثہ اور مناظرہ وغیرہ کیا کرتے تھے۔

5.5.4 مناظرے

اہل سنت وجماعت نے اپنے افکار ونظریات کی تبلیغ واشاعت اور غیر مسلم سماج سے علمی وفکری بحث ومباحثہ کے لیے مناظروں سے بھی مدد لی، اگرچہ مولانا احمد رضا خاں بذات خود اس سے بہت دل چسپی نہیں رکھتے تھے، کیوں کہ وہ قلم کے آدمی تھے، البتہ ان کے متبعین اور شاگردوں کی ایک تعداد ایسی ضرور تھی جو اس میدان میں بہت مہارت رکھتی تھی۔ ان میں مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا حشمت علی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ مناظرے کے موضوعات بالعموم پیغمبر اسلام کو غیب کا علم ہونا یا نہ ہونا، تقلید (اہل حدیث سے) کی ضرورت کا مسئلہ، ندوۃ العلماء کی مخالفت، امکان نظیر کا مسئلہ وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح آریہ سماج سے قرآن کے مخلوق ہونے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شخصی امتیاز اور تناسخ کے باطل ہونے وغیرہ پر بھی مناظرے ہوتے تھے۔ بہر کیف ان تمام نکات سے بخوبی اندازہ

ہو جاتا ہے کہ اہل سنت وجماعت کی تعلیمی، مذہبی، اصلاحی اور سماجی خدمات گراں قدر ہیں اور انہیں نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

5.6 تبلیغی جماعت کا تعارف

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی صوفیاء کرام، مشائخ اور علماء کرام کی علمی، ثقافتی، دینی اور تبلیغی سرگرمیوں کا بھی آغاز ہوا۔ صوفیاء کرام بالخصوص خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے مشائخ نے ملک کے متعدد حصوں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا، چنانچہ میوات کی آبادی بھی ان سے مستفید ہوئی، جو دہلی کے آس پاس الور، بھرت پور، گوڑ گانوہ اور دیگر متصل علاقوں میں آباد تھی، البتہ بعد کے زمانوں میں مسلم حکمرانوں اور جاگیر داروں نے ان علاقوں پر توجہ نہیں دی کہ یہاں کے مسلمان اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقف ہو سکیں، چنانچہ اہل میوات رفتہ رفتہ دینِ اسلام سے دور ہوتے چلے گئے اور وہ برائے نام ہی مسلمان رہ گئے، کیوں کہ ان کی مذہبی، معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں ہندوانہ تہذیب و ثقافت کے گہرے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ وہ اسلام کے بنیادی عقائد وارکان سے کوسوں دور تھے، ہندوؤں کے متعدد تہواروں کو پورے ذوق وشوق سے مناتے تھے۔ نکاح، شادی، پیدائش اور موت وغیرہ کے موقع پر ہندو رسم ورواج کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بچوں کے نام ہندوانہ رکھے جاتے تھے۔ مرد اور خواتین میں ہندوانہ لباس کا عام رواج تھا اور وراثت میں لڑکیوں کو کوئی حصہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ رہی سہی کسر بیسویں صدی کے آغاز میں دیانند سرسوتی کی قیادت میں تحریک آریہ سماج اور سوامی شردھانند شدھی تحریک وغیرہ نے پوری کر دی۔ ان حالات میں متعدد مسلم جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک 'تبلیغی جماعت' بھی ہے۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے اس تحریک کا آغاز اہل میوات میں کیا اور دس بارہ سال کی قلیل مدت میں ہی ان کی اکثریت کو دوبارہ اسلام کی طرف لانے میں کامیاب ہوئے۔ ان سے قبل شاہ عبد القادرؒ اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے شاگرد محمد رمضان، مولوی نور محمد، محمد اسمٰعیل مہمی، مولوی محمد مرید، میاں راج شاہ، مولوی عبد اللہ خاں وغیرہ نے بھی اس علاقے میں اصلاح و تبلیغ کی خدمات انجام دی تھیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بانی تحریک مولانا محمد الیاسؒ کی حیات و خدمات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

5.7 مولانا محمد الیاس (1885-1944)

مولوی محمد اسمٰعیل کاندھلوی کے تین صاحب زادے مولانا محمد، مولانا محمد یحییٰ اور مولانا محمد الیاس تھے۔ آخر الذکر کی ولادت 1885 میں کاندھلہ، اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کا تاریخی نام اختر الیاس تھا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے رواج کے مطابق مکتب میں حاصل کی اور خاندانی روایت کے مطابق بچپن میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ ابتدا میں وہ اپنے والد کے ساتھ ہی نظام الدین یا کاندھلہ میں رہتے تھے، لیکن پھر ان کے بھائی محمد یحییٰ اپنے ساتھ گنگوہ لے آئے جہاں انہیں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یحییٰ سمیت متعدد علمائ، صلحاء اور فضلاء کی صحبت ملی، یقیناً ان کی علمی، دینی و روحانی زندگی کو پروان چڑھانے میں اس ماحول نے اہم کردار ادا کیا۔ گنگوہ میں ہی علالت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، لیکن ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے منجھلے بھائی مولانا محمد یحییٰ نے انہیں دوبارہ تعلیم کے حصول کی اجازت دے دی

تھی۔وہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے استفادہ کے لیے دیوبند تشریف لے گئے اور بخاری اور ترمذی شریف کی سماعت کی۔ انہوں نے پہلے مولانا گنگوہی کے دست مبارک پر بیعت کی اور ان کی وفات کے بعد مولانا خلیل احمد سہارن پوری سے اپنا تعلق جوڑ لیا اور ان کی نگرانی میں منازل سلوک طے کیے۔ مولانا محمد الیاس نے تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران انہوں نے حج کرنے کی بھی سعادت حاصل کی۔

مولانا محمد الیاسؒ کے بھائی مولانا محمد صاحب ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ میں بیمار ہوئے۔ اس وقت مولانا محمد الیاس بھی اپنے بھائی کی تیمار داری کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے، لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ تدفین وغیرہ سے فراغت کے بعد خاندان اور متعدد احباب و معتقدین نے مولانا محمد الیاس سے درخواست کی کہ اب وہ یہیں قیام فرمائیں اور مدرسہ کی سرپرستی انجام دیں، نیز ان لوگوں نے مدرسہ کی اعانت و خدمت کا وعدہ بھی کیا اور مصارف کے لیے متعینہ رقم دینے کی بھی بات کہی۔ مولانا نے ان کی تمام باتوں کو بعض شرائط کے ساتھ قبول کر لیا، البتہ بستی نظام الدین اولیاء، دہلی میں قیام کو اپنے مرشد مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی اجازت پر معلق کیا اور باقاعدہ انہوں نے جا کر ان سے اجازت لی۔ مولانا سہارن پوری نے انہیں نہ صرف اجازت دی، بلکہ مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ پہلے مدرسہ مظاہر العلوم، سہارن پور سے ایک سال کی وہ رخصت لیں اور اگر بستی نظام الدین کا ماحول انہیں راس آجائے تو استعفیٰ دے دیں، ورنہ واپس آجائیں۔ مولانا الیاسؒ کو ان کی یہ رائے پسند آئی اور انہوں نے اسی کے مطابق عمل کیا، البتہ ابھی بستی نظام الدین جانے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ سخت علیل ہو گئے اور اسی حالت میں انہوں نے سہارن پور سے کاندھلہ کا سفر کیا اور یہاں پر مرض نے مزید شدت اختیار کر لی، نیز ذات الجنب کا شدید دورہ ہوا۔ حالت اس قدر خراب ہوئی کہ متعلقین کو ان کی زندگی سے مایوسی ہونے لگی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابھی مزید زندگی باقی رکھی تھی تو رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئے۔ پھر وہ کاندھلہ سے نظام الدین آگئے اور مدرسہ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے۔

بستی نظام الدین اولیاء دہلی میں اس وقت ایک چھوٹی مسجد، مدرسہ، ایک بنگلہ، ایک حجرہ، درگاہ اور اس کے قریب کچھ آبادی تھی۔ مولانا محمد الیاس نے جس وقت مدرسہ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت بہت نامساعد حالات تھے اور سرمائے کی بھی بہت کمی تھی، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور توکل علی اللہ ساری خدمات انجام دیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انہیں اعلان عام کرنا پڑتا کہ آج کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے تو جس طالب علم کا دل چاہے رہے یا چلا جائے، مگر کوئی بھی طالب علم خواہ وہ میواتی اور غیر میواتی، جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا، چاہے اسے جنگلی پھلوں سے ہی اپنا پیٹ بھرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مولانا کی تربیت کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ طلبہ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ان کا طریقہ تعلیم اور درس میں بھی اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ طلبہ میں مسائل کو ذہن نشین کرانے اور ان میں تفہیم کی قدرت پیدا کرنے کے لیے نت نئی صورتیں اور تدابیر اختیار فرماتے جو بہت موثر اور کارگر ثابت ہوتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ مطالعہ پورے انہماک سے کریں اور عبارت کی صحت، تلفظ اور صرف و نحو کے قواعد وغیرہ کا خیال رکھیں۔ وقت کی پابندی ان کے یہاں لازمی تھی، اس کا اندازہ اس مثال سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک وقت تک مستدرک حاکم کا درس فجر کی نماز سے پہلے دیا کرتے تھے اور اس میں مدرسہ کے تمام طالب علم موجود ہوتے تھے۔ کتابوں میں عام مدارس کے نصاب و نظام کی پابندی نہیں تھی، چنانچہ متعدد ایسی کتابیں شامل نصاب تھیں

جن کا عام طور پر مدارس میں رواج نہیں تھا۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ مولانا محمد الیاسؒ کا سب سے بڑا کارنامہ درس و تدریس اور مکاتب کے قیام سے زیادہ دین کی دعوت و تبلیغ تھی اور اس کے لیے باقاعدہ ایک تحریک چلانا تھا، جس کا آغاز انہوں نے میوات سے کیا تھا۔ ذیل میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا جارہا ہے۔

5.8 آغاز وارتقا

مرزا الٰہی بخش (سمدھی، بہادر شاہ ظفر) نے بستی نظام الدین اولیاء میں سکونت اختیار کی اور چونسٹھ کھمبے کے اندر اور باہر مکانات تعمیر کرائے، نیز ایک مسجد بھی بنوائی۔ انہوں نے مولوی محمد اسمٰعیل کاندھلوی (مرزا الٰہی بخش کے بچوں کے اتالیق) اور اپنے لیے ایک ایک کمرے بنوائے جن پر ٹین کی چھت تھی اور وہ 'بنگلہ' کے نام سے معروف ہوئے، اس لیے مسجد بھی 'بنگلہ والی مسجد' کہی جانے لگی۔ یہ مسجد ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ دیکھا جائے تو تبلیغی جماعت کی ابتدا دراصل اسی مسجد سے ہوئی تھی۔ اسی مسجد میں مولوی محمد اسمٰعیل نے سب سے پہلے میواتی مسلمان مزدوروں کو نماز اور قرآن وغیرہ کی تعلیم دی اور دین کی تبلیغ کے لیے انہیں واپس میوات بھیجا۔ رفتہ رفتہ یہاں میوات اور بستی نظام الدین اولیاء کے طالب علموں کی تعداد بڑھنے لگی تو باقاعدہ ایک مدرسہ قائم کر دیا گیا۔ اس مدرسہ کا نظم ونسق بالترتیب مولوی محمد اسمٰعیل کاندھلوی، مولوی محمد کاندھلوی، مولانا عبدالسبحان میواتی اور حاجی عبدالرحمن وغیرہ کے ہاتھوں میں رہا۔ مولوی محمد کاندھلوی کی وفات کے بعد بنگلہ والی مسجد اور مدرسہ کی ذمہ داری مولانا محمد الیاس کے کندھوں پر آگئی۔ انہوں نے اسی کو مرکز بنا کر ایک تحریک کا آغاز کیا جو تبلیغی جماعت کے نام سے معروف ہے۔

اہل میوات مولانا محمد الیاس کے والد مولوی محمد اسماعیل اور بھائی مولوی محمد سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے اس تعلق کو مولانا محمد الیاس کے ساتھ بھی باقی رکھا اور وہ اپنے ساتھ انہیں میوات لے کر گئے۔ مولانا نے اس تعلق اور خلوص کی نہ صرف قدر کی، بلکہ ان کے مسائل، معاملات اور مقدمات وغیرہ کو سلجھانے کی کوششیں کیں، نیز ان کو حقیقی اسلام کی طرف لانے کی حتی الامکان سعی کی۔ اس حوالے سے انہوں نے پہلے میوات میں مکاتب و مدارس قائم کر کے نئی نسل کو اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات سے آشنا کرنا چاہا، اگرچہ ابتداء میں انہیں اس سلسلے میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ اہل میوات تعلیم اور اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھے اور وہ نہ ہی اپنے بچوں کو کاشت کاری یا اس قبیل کے دیگر کاموں سے ہٹا کر مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے کہ اس سے ان کی آمدنی کم ہو جائے گی، لیکن مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور مستقل اس کے لیے کوشش کرتے رہے۔ بالآخر میوات میں ایک مدرسہ قائم ہو گیا اور اس کے بعد تو ایک سلسلہ چل پڑا اور بہت کم مدت میں ہی لگ بھگ سو (100) مکاتب و مدارس قائم ہو گئے، جن کے مصارف مولانا ہی پورا کرتے تھے۔

میوات میں قائم شدہ ان مکاتب و مدارس سے تعلیم و اصلاح کا آغاز تو ہو گیا، لیکن مولانا ان سے آنے والے نتائج سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ ملک کی بے دینی، عام جہالت، مختلف رسم ورواج کی پابندی وغیرہ کا اثر پورے علاقے، ماحول اور مکاتب وغیرہ میں ہے اور جو طلبہ مدارس سے فارغ ہو رہے ہیں وہ واپس گھر جا کر دوبارہ اسی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ اس لیے مطلوبہ مقاصد کا

حصول نہ تو مکاتب اور مدارس سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی خواص وعمائد کی اصلاح سے، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ ایک دینی تحریک چلائی جائے جس میں عوام الناس کو شریک کیا جائے تاکہ تمام انسانوں تک دین کی دعوت و تبلیغ کو ممکن بنایا جاسکے۔ شوال 1344ھ میں مولانا نے دوسرے حج کے لیے سفر کیا اور انہیں مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی جس میں آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ مولانا کو اس سے دینی تحریک کے خیال کو مزید تقویت ملی اور 1345ھ میں واپس آکر میوات میں انہوں نے عمومی دعوت کے کام کا پروگرام ترتیب دیا اور 'تبلیغی گشت' کا آغاز کر دیا۔ اسی طرح مختلف جماعتوں کو متعدد علاقوں میں دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا۔ جمعہ کے دن وہ خود بھی بعض مقامات پر جاتے تھے۔ اس طرح سے میوات میں دعوت و تبلیغ کا آغاز ہوا جو عرصہ تک چلتا رہا۔ اسی دوران مولانا نے 1351ھ میں اپنا تیسرا حج بھی کیا اور واپسی پر دعوت و تبلیغ کے کاموں کو مزید وسعت دی۔

اہل میوات نے مولانا محمد الیاسؒ کی زیر صدارت 2، اگست 1934ء/1353ھ میں قصبہ نوح میں ایک پنچایت منعقد کی جس میں میوات کے علاقے کے چودھری، میاں جی، ذیل دار، انعام دار، نمبردار، صوبیدار، منشی اور متعدد معزز افراد جمع ہوئے اور ان کی کل تعداد تقریباً ایک سو سات (107) تھی۔ اس پنچایت میں سب سے پہلے اسلام کا تعارف اور اس کی اہمیت وفضیلت وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور پھر سب نے عہد کیا کہ اسلام کے ارکان کی مکمل پابندی کی جائے گی اور دین کی دعوت واشاعت کا کام اجتماعی سطح پر کیا جائے گا۔ اس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ دعوت و تبلیغ کی ذمے داری صرف علماء کی نہیں ہے، بلکہ یہ تمام مسلمانوں کا کام ہے اور ہم سب کو اسے کماحقہ ادا کرنا ہے۔ ان تمام طے شدہ باتوں کو لکھا گیا اور پنچایت نامہ مرتب کر کے اس پر شرکاء کے دستخط لیے گئے، یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پنچایت سے تبلیغی جماعت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سب سے پہلی جماعت کاندھلہ اور دوسری جماعت رائے پور کی طرف روانہ ہوئی تھی، اس کے بعد تو ملک کے مختلف حصوں میں جماعتیں بھیجی جانے لگیں اور اس کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولانا محمد الیاسؒ نے خود بھی متعدد مرتبہ بڑی جماعتوں کے ساتھ میوات کا دورہ کیا اور اس علاقے کی تحصیلوں کے علاوہ پورے گڑگانوا کا نقشہ اور سمتیں تیار کرائیں، نیز وہاں خطوط اور مبلغین بھیجے۔ گاؤں کی آبادی، فاصلہ اور نمبرداروں وغیرہ کے نام لکھوائے اور اس طرح سے انہوں نے ایک ایسا باقاعدہ نظام قائم کر دیا جس سے لوگوں میں دین کی تبلیغ واشاعت کی لگن پیدا ہو گئی۔ مولانا 1356 ہجری میں چوتھی بار حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں بھی موصوف نے دعوت و تبلیغ کے مشن کو جاری رکھا۔ جب وہ مکہ مکرمہ سے واپس آئے تو انہوں نے میوات اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو مزید جلا بخشی۔ انہوں نے متعدد اہل علم ودانش، اساتذہ، علماء کرام اور تنظیموں کو اس طرف متوجہ کیا اور انہیں ان کا فرض یاد دلایا۔ ابتداء میں لوگوں نے توجہ نہیں دی، لیکن جب انہوں نے مولانا کی دعوت و تبلیغ کے نتائج و ثمرات دیکھے تو عوام بالخصوص دہلی اور اس کے قرب وجوار کی اکثریت نے ان کے کام کو سراہا اور اپنی خدمات بھی پیش کیں، چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ دور دور کے شہر وقصبات جیسے خورجہ، علی گڑھ، آگرہ، بلند شہر، میرٹھ، مرادآباد، لکھنؤ اور کراچی تک جماعتیں جانے لگیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کی اس تحریک نے نہ صرف میوات بلکہ برصغیر ہندوپاک میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا نے دعوت و تبلیغ کا کام نہایت ہی توجہ، لگن، محنت، ایثار اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیا تھا، نیز انہوں نے اس کام کے

لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ ان کا انتقال 13 جولائی 1944 میں ہوا۔

مولانا محمد الیاس کی وفات کے بعد ان کے لائق وفائق صاحب زادے مولانا محمد یوسف (1917-1965) جانشین ہوئے۔ انتقال سے قبل 2 جولائی 1944 کو مولانا محمد الیاس کی جب طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے مولانا محمد زکریا، مولانا عبد القادر رائے پوری، مولانا ظفر احمد تھانوی کو پیغام بھیجا کہ مجھے ان چند آدمیوں پر اعتماد ہے، آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اس کے ہاتھ پر ان لوگوں کو بیعت کرا دیں جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں: "حافظ مقبول حسین، قاری داؤد، مولوی احتشام الحسن، مولوی محمد یوسف، مولوی انعام الحسن، مولوی رضا حسن۔" ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے اتفاق رائے سے مولوی محمد یوسف کو منتخب کیا اور اس کی اطلاع مولانا محمد الیاس کو دی، انہوں نے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے منظور ہے، اگر تم نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ اس میں خیر وبرکت فرمائے گا۔ پہلے مجھے بڑا کھٹکا اور بے اطمینانی تھی، اب اطمینان ہو گیا ہے۔ امید کہ میرے بعد ان شاء اللہ کام اچھا ہو گا۔ وقت نے یہ ثابت کیا کہ جماعت کا فیصلہ بالکل درست تھا کیوں کہ اس تحریک کا دائرہ عالمی سطح پر پھیلتا چلا گیا اور تبلیغی جماعت کے اثرات ہند سے نکل کر عرب، عراق، افغانستان، شام، مصر، افریقہ، مغرب، جاپان، ملیشیا، انڈونیشیا اور برما وغیرہ تک پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس میں مولانا محمد یوسف کے عزم واستقلال، لگن اور انہماک کا اہم کردار تھا۔ وہ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک پر کامل یقین واعتماد رکھتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیتے رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔

مولانا محمد یوسف کے بعد مولوی انعام الحسن کاندھلوی (1918-1995) ان کے جانشین ہوئے۔ وہ کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی اکرام الحسن بانی تحریک مولانا محمد الیاس کے بھانجے تھے۔ اگرچہ مولوی انعام الحسن عمر میں مولانا محمد یوسف سے ایک سال چھوٹے تھے، لیکن تعلیم وتربیت دونوں کی ساتھ ساتھ ہی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ مولانا محمد الیاس سے بیعت کی اور دعوت وتبلیغ میں بھی ایک ساتھ رہے۔ مولانا محمد یوسف کی حیات میں تو مولوی انعام الحسن زیادہ تر خاموش رہتے تھے، البتہ مشوروں اور دعوت واجتماعات وغیرہ میں بھرپور شرکت کرتے تھے۔ مولانا محمد یوسف کی وفات کے بعد جب وہ جانشین بنائے گئے تو بہت متحرک اور فعال ہو گئے اور بہ حیثیت امیر انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی وفات کے بعد ہندوستان کے متعدد علماء نے متفقہ طور پر مولانا زبیر الحسن کاندھلوی کو امیر منتخب کیا، لیکن اہل میوات مولانا محمد سعد کاندھلوی کی امارت پر اصرار کرتے رہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ذمے داران جماعت نے کسی ایک فرد کو امیر بنانے کے بجائے اس کے کام کو تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس کی نگرانی میں تمام کام انجام دیا جانے لگا، البتہ جب کمیٹی کے متعدد ممبران کا انتقال ہو گیا تو مولانا محمد سعد کاندھلوی نے امیر ہونے کا اعلان کر دیا، اس سے تبلیغی جماعت میں اختلاف ہو گیا اور لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروپ کے امیر مولانا محمد سعد ہیں اور دوسرا گروپ ایک کمیٹی کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبلیغی جماعت کے ارتقاء میں امیرانِ جماعت کے علاوہ، مولانا محمد زکریا، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ کی مساعی جمیلہ کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

5.9 اغراض ومقاصد اور طریقہ کار

مولانا محمد الیاس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کے درمیان اسلامی تعلیمات کو واضح کیا جائے تا کہ ان کے اندر صحیح شعور اور جذبہ پیدا ہو سکے، نیز وہ اسلامی نظام کے تحت اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس حوالے سے انہوں نے جن پہلوؤں پر خصوصی زور دیا ان میں سے بعض کا ذکر کیا جارہا ہے، جیسے کلمہ کو صحیح طریقے سے یاد کرنا، اسلامی عقائد کی اتباع، نماز کی پابندی، تعلیم کا حصول اور اس کی اشاعت، اسلامی وضع قطع، شرکیہ رسم ورواج سے اجتناب، خواتین کے لیے پردہ کی پابندی اور لباس میں اسلامی احکام کا خیال، سنت رسول کے مطابق نکاح، انسانی حقوق کی پاس داری، پاکی کا خیال رکھنا، دین کی دعوت و تبلیغ میں حصہ لینا وغیرہ۔ بانی تحریک نے ان مقاصد کے حصول کے لیے چھ بنیادی اصول متعین کیے جو حسب ذیل ہیں:

1. کلمہ کی تصحیح و تلقین: یعنی سب سے پہلے ایک مسلمان کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے صحیح تلفظ اور اس کے مقام و مرتبہ سے واقف کرایا جائے، تا کہ وہ اپنی زندگی کی حقیقت اور اس دنیا میں بھیجے جانے کے مقصد کو بہ حسن وخوبی سمجھ لے۔
2. نماز کی تصحیح وترقی: کلمہ کے بعد ایک مسلمان کو نماز کی اہمیت وافادیت اور اس کے اصول وضوابط سے واقف کرایا جائے تا کہ وہ اپنی نمازوں کو سنت نبوی کے عین مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اس میں فرض، سنت اور نفل تمام طرح کی نمازیں شامل ہیں۔ اسی طرح سے اس میں پاکیزگی کے اصول بھی شامل ہیں۔
3. تحصیل علم وذکر: کلمہ اور نماز کے بعد ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق مختلف اوقات میں دینی علوم کا حصول کرے اور ذکر واذکار کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی دعاؤں کا بھی اہتمام کرے۔
4. اکرام مسلم: کلمہ، نماز اور تحصیل علم وذکر کے بعد ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر تمام مسلمانوں کے ساتھ عزت وتکریم سے پیش آئے کیوں کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں ذات پات اور طبقہ اور دیگر تفریقات کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو کسی کی مخالفت اور تنقید نہیں کرنی چاہیے اور علماء کرام کا خصوصی احترام کرنا چاہیے۔
5. تصحیح نیت: اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اس لیے ایک مسلمان کو اپنی نیت درست رکھنی چاہیے اور اپنے ہر عمل کے صلہ کی امید اللہ رب العزت سے ہی کرنی چاہیے، انسانوں سے نہیں۔ اسی طرح کوئی کام نام ونمود اور شہرت یا ریاکاری کے لیے نہیں کرنا چاہیے۔
6. تفریغ وقت: وقت فارغ کرنا یا نکالنا، یعنی ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کے لیے وقت نکالے اور اس نے جو کچھ دین کے حوالے سے سیکھا ہے، اسے وہ دوسرے مسلمان بھائیوں تک بھی پہنچائے اور ان کے اعمال کی اصلاح کرے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا بھی مشن تھا اور اب اس کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے۔

جہاں تک طریقہ کار کی بات ہے تو مولانا محمد الیاس نے دین کی دعوت و تبلیغ کے لیے سنت نبوی کا طریقہ اختیار کیا اور اس کے لیے محنت، جدوجہد، گشت اور سفر کو لازمی قرار دیا۔ انہوں نے اسلام کی اشاعت کے لیے عارضی ترک وطن کو ضروری سمجھا، یعنی ہر مسلمان دین

سیکھنے اور سکھانے کے لیے اپنے مشاغل اور ماحول کو چند دنوں کے لیے چھوڑ کر دوسری جگہ جائے اور ایک بہتر ماحول میں رہ کر پوری یکسوئی کے ساتھ دینی باتیں سیکھے۔ انہوں نے اس حوالے سے ایک بار فرمایا:

"ہم نے جماعتیں بنا کر دین کی باتوں کے لیے نکلنا چھوڑ دیا، حالاں کہ یہی بنیادی اصل تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود پھرا کرتے تھے اور جس نے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، وہ بھی مجنونانہ پھرا کرتا تھا... غرض پھرنا اور دین کے لیے جدوجہد اور نقل و حرکت میں رہنا اصل تھا۔ جب یہ چھوٹ گیا جب ہی خلافت ختم ہو گئی۔"

تبلیغی جماعت کے افراد نے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے حسب ضرورت مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے مسجدوں کو آباد کیا، اجتماعات کا اہتمام کیا، گشت اور چلّوں کے لیے وقت نکالا، طلبہ پر خصوصی توجہ دی، خواتین کے درمیان دعوت و تبلیغ کا کام کیا اور ملک و بیرون ملک میں تبلیغی وفود بھیجے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا کوئی باقاعدہ دستور نہیں ہے، قرآن و سنت اور شریعت کو ہی دستور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس جماعت کا باقاعدہ مرکزی دفتر بھی نہیں ہے، حضرت نظام الدین، دہلی میں واقع بنگلہ والی مسجد کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہیں سے امیر جماعت کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں جن کی اطاعت کرنا اس جماعت سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے لیے ضروری ہے، نیز وہ لوگ جب دین کی راہ میں نکلتے ہیں تو اپنا خرچ خود برداشت کرتے ہیں، جماعت اس سلسلے میں ان کی ذمہ داری نہیں لیتی ہے۔ اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ اس تنظیم میں شامل افراد نے دین کی تبلیغ و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

5.10 خدمات

مولانا محمد الیاس اور ان کے جانشینوں نے جس دور میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا، اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے سماجی، معاشی، تعلیمی اور مذہبی حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ ان میں نہ تو دینی شعور پایا جاتا تھا اور نہ ہی دنیاوی علوم کے حصول کا جذبہ، دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو وہ صرف نام کے مسلمان تھے، کیوں کہ ان کے اعمال زیادہ تر ہندوانہ تھے۔ مسجدیں خالی رہتی تھیں اور پوجا پاٹھ کا بہت اہتمام ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ اخلاقی طور پر بھی گرے ہوئے تھے کیوں کہ چوری، ڈکیتی، رہزنی، دروغ گوئی، مکر و فریب اور لڑائی جھگڑا ان کے یہاں عام تھا۔ انہیں اسلام کے عقائد اور ارکان وغیرہ کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ ہی وہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان حالات میں مولانا نے اصلاح و تربیت کی تحریک چلائی اور بہت کم وقت میں انہوں نے ملک کے متعدد علاقوں میں دینی انقلاب پیدا کر دیا۔ جن علاقوں میں مساجد نہیں تھیں، مسجدیں تعمیر ہوئیں، مساجد و مکاتب قائم ہوئے، علماء کرام اور حفاظ کرام کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوئی جس نے ملک کے مختلف گوشوں میں دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام کیا، جس کے نتیجے میں عوام نے عقائد و ارکان کی طرف توجہ دی، اسلامی وضع قطع اختیار کر لی اور انہیں ہندوانہ رسوم و رواج اور دیگر بدعات و خرافات سے نفرت ہونے لگی۔ اسی طرح لوگوں نے تمام برے کام جیسے چوری، ڈکیتی، قتل و غارت گری، سود خوری اور شراب نوشی وغیرہ سے توبہ کر لی اور وہ واپس اسلام کی طرف لوٹ آئے۔

مولانا محمد الیاس کی اس تحریک کی خدمات اوراس کے اثرات کا اعتراف متعدد بڑے بڑے علماء نے کیا ہے جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید ابوالحسن علی ندوی، سید سلیمان ندوی اور ملاواحد دہلوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سید سلیمان ندوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا محمد الیاس نے نہایت خاموشی کے ساتھ صرف اپنے مخلصانہ سادہ طریق اور صحیح اصول و دعوت کے ذریعے پچیس برس کی انتھک محنت میں ان میواتیوں کو خالص و مخلص مسلمانوں کی صورت میں بدل دیا، جن کے ظاہر و باطن پر خاندانی مسلمانوں کو بھی رشک آتا ہے۔"

5.11 کلیدی الفاظ

مجدد : ہر صدی کے اوائل میں پیدا ہونے والا وہ مصلح جو مسلمانوں میں مروج بدعات کی اصلاح کرتا ہے۔

ربط واتصال : جوڑنا اور ملانا

پنچایت نامہ : کسی مسئلہ پر مجلس انتظامیہ کی زیر نگرانی مرتب کیے ہوئے اصول وضوابط

تفریغ وقت : وقت نکالنا

5.12 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جدید ہندوستان میں مسلم تحریکوں کا قیام 1857 میں آزادی کی جنگ میں ناکامی اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات کی دین ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب مسلمان مختلف اسباب کی بناپر دیگر قوموں سے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور تعلیمی میدان میں پیچھے ہوتے چلے جارہے تھے تو متعدد اصحاب علم ودانش نے اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں آگے بڑھانے اور ان کی مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں، جس کے نتیجے میں متعدد تحریکات وجود میں آئیں، ان میں سنی بریلوی جماعت اور تبلیغی جماعت کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں نے اپنی استطاعت کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، سماجی، معاشی اور علمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور دے رہی ہیں۔
- سنی بریلوی جماعت نے اپنے عقائد وافکار و نظریات کی نشرواشاعت اپنے حلقوں کے علاوہ دیگر مکتب فکر میں بھی کی ہے اور اس کے لیے اس نے مدارس، مکاتب، دینی وعصری جامعات، مساجد، کتب خانے، اشاعتی ادارے، لائبریریاں اور رسائل وجرائد سے مدد لی ہے۔ اس جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد امت مسلمہ کی بقااور ترقی کے لیے بھی سرگرم ہیں، نیز وہ رفاہی وسماجی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ دیگر جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی تشدد پسند اور معتدل دونوں طرح کے افراد شامل ہیں۔
- تبلیغی جماعت اپنے آغاز سے حال تک پورے آب وتاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے مشن اور مقصد سے غافل نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی اس کا اجتماعی جوش وجذبہ سرد ہوا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آغاز سے ہی اس جماعت کا نہ تو کوئی باقاعدہ مرکزی دفتر ہے اور نہ ہی

کاغذاتی ریکارڈ یا ممبر فیس وغیرہ، اس کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور ملک و بیرون ملک میں اس تنظیم کے افراد پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس کے اکابرین اگرچہ فقہ حنفی کی اتباع کرنے والے ہیں، لیکن انہوں نے خود کو مسلکی تشدد سے دور رکھا ہے اور اس جماعت میں آنے والے تمام مسلمانوں کا خیر مقدم کیا ہے، خواہ وہ کسی بھی مسلک یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس جماعت کی سب سے نمایاں کام یابی یہی ہے کہ اس میں مختلف ملک، علاقہ، نسل، رنگ اور زبان کے افراد شامل ہیں جن کا مقصد ایک ہے۔

- ہر فرد اور ہر جماعت میں کچھ خوبیاں اور کچھ خامیاں ہوتی ہیں، یہی بات سنی بریلوی جماعت اور تبلیغی جماعت کے حوالے سے بھی کہی جاسکتی ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دونوں جماعت کے بانی اپنی نیت اور مقصد میں نیک اور مخلص تھے اور انہوں نے یا ان کی جماعت نے انتہائی مشکل حالات میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

5.13 نمونہ امتحانی سوالات

5.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا احمد رضا خاں کس سن عیسوی میں پیدا ہوئے۔

(a).1856 (b).1860 (c).1856 (d).1835

2. مولانا احمد رضا خاں کی تدفین کس شہر میں ہوئی۔

(a).بدایوں (b).لکھنو (c).بریلی (d).اجمیر

3. جماعت رضائے مصطفی کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a).1824 (b).1934 (c).1915 (d).1924

4. 'کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن' کس کی تصنیف ہے؟

(a).ولی اللہ دہلوی (b).احمد رضا خاں (c).ابوالکلام آزاد (d).سید ابوالاعلی مودودی

5. مولانا احمد رضا خاں نے 1904 میں بریلی میں کس مدرسہ کی بنیاد ڈالی؟

(a).مدرسہ مظہر العلوم (b).مدرسہ شمس العلوم (c).مدرسہ حنفیہ (d).مدرسہ عالیہ راج پور

6. مولانا محمد الیاس کی پیدائش کس سن عیسوی میں ہوئی؟

(a).1875 (b).1885 (c).1785 (d).1944

7. مولانا محمد الیاس کا تاریخی نام کیا تھا؟

(a).اختر نعمان (b).اختر الیاس (c).محمد اختر (d).یوسف اختر

8. مولانا محمد الیاس کی وفات کے بعد ان کا جانشین کون ہوا؟

(a). مولانا محمد یوسف (b). مولانا نعیم الحسن (c). مولانا اکرام الحسن (d). مولانا محمد زکریا

9. مولانا محمد الیاس کی قیادت میں سب سے پہلی جماعت کس علاقہ میں گئی؟

(a). سہارن پور (b). میوات (c). رائے پور (d). کاندھلہ

10. مولانا محمد الیاس کو کس حج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی؟

(a). پہلا حج (b). دوسرا حج (c). تیسرا حج (d). چوتھا حج

5.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. سنی بریلوی جماعت کا تعارف پیش کیجیے۔
2. سنی بریلوی جماعت کے افکار و نظریات کا جائزہ پیش کیجیے۔
3. تبلیغی جماعت کے قیام اور اس کے اسباب کا تذکرہ کیجیے۔
4. تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. تبلیغی جماعت کے طریقہ کار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

5.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6. مولانا احمد رضا خاں کی حیات و خدمات سے بحث کیجیے۔
7. مولانا محمد الیاس کی حیات و خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔
8. سنی بریلوی جماعت کی خدمات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات	: یسین اختر مصباحی
2.	امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں	: یسین اختر مصباحی
3.	برطانوی ہندوستان میں عقیدت پر	: ڈاکٹر اوشا سانیال، ترجمہ: ڈاکٹر وارث مظہری
4.	حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت	: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
5.	تبلیغی جماعت کا آغاز و نشو و نما	: یوگندر سکند، ترجمہ: سعود الحسن خان
6.	تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ	: محمو ایوب قادری

اکائی 6: مشہور تحریک: جماعت اسلامی ہند

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 بیسویں صدی عیسوی تحریکات کی صدی

6.3 جماعت اسلامی کی تاسیس

6.3.1 تقسیم ملک کے بعد آئندہ لائحہ عمل

6.3.2 جماعت اسلامی ہند کی تشکیل نو

6.3.3 نصب العین اور طریقہ کار

6.3.4 نظم جماعت

6.3.5 امرائے جماعت اسلامی ہند

6.3.6 دائرہ کار اور خدمات

6.4 جماعت اسلامی ہند اور سیاست

6.4.1 جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعت کا موقف

6.4.2 جماعت کا پچھتر سالہ سفر

6.5 اکتسابی نتائج

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

6.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

6.0 تمہید

اس اکائی میں جماعت اسلامی ہند کا تعارف کرایا جائے گا۔ بتایا جائے گا کہ اس کی تاسیس کن حالات میں اور کب ہوئی؟ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں اس کی تشکیل کیسے ہوئی؟ اس کا نصب العین اور طریقہ کار کیا ہے؟ اس کا نظم کیسا ہے؟ اس پر بھی رروشنی ڈالی جائے گی کہ اس کی سرگرمیاں کن میدانوں میں ہیں؟ اور سماج پر اس کے کیا اثرات پڑے ہیں؟۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند کا تعارف کرایا جائے، اس پر روشنی ڈالی جائے کہ اس کی تشکیل کیوں عمل میں آئی تھی؟ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے کیا طریقہ کار اختیار کیا؟ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جائے کہ اس نے کیا سرگرمیاں انجام دی ہیں ؟ اور اس کی کیا خدمات ہیں؟ اس سے امید ہے کہ قارئین کو اس کے بارے میں درست معلومات حاصل ہوں گی اور اس سے متعلق ان کی بعض غلط فہمیاں دوٗر ہوں گی۔

6.2 بیسویں صدی عیسوی تحریکات کی صدی

بیسویں صدی عیسوی عالم اسلام کی سطح پر اسلامی تحریکات کی صدی ہے۔ اس زمانے میں مختلف ممالک میں ایسی تحریکات اٹھیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کی سرزمینوں اور وسائل پر قابض سامراج کے خلاف محاذآرائی کی تو دوسری طرف اسلام کا انقلابی تصور پیش کیا اور اس کی حکم رانی کی بات کی۔ ان تحریکات نے مسلمانوں کو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسلام کو نافذ اور جاری وساری کرنے کی دعوت دی۔ انھی تحریکات میں سے ایک جماعت اسلامی ہے، جس کا قیام 1941ء میں غیر منقسم ہندوستان میں ہوا تھا۔ اب یہ الگ الگ نظم کے تحت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں کام کر رہی ہے۔ جموں وکشمیر کی جماعت اسلامی بھی الگ اور مستقل نظم کے تحت سرگرم عمل ہے۔

6.3 جماعت اسلامی کی تاسیس

بیسویں صدی عیسوی میں جن مسلم شخصیات کے افکار کے عالمی سطح پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء) کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بیش قیمت کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں ایک طرف غیر اسلامی نظریات وافکار پر زبردست تنقید کی گئی ہے اور اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا گیا ہے تو دوسری طرف اس کے عقائد، اقدار، نظاموں اور تعلیمات کی دل نشیں انداز میں توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ مولانا نے اسلام پر کیے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالے کا کام عین جوانی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان کی معرکہ آرا تصنیف 'الجہاد فی الاسلام' اس کا ثبوت پیش کرتی ہے،

جو پہلے جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان سہ روزہ الجمعیۃ دہلی میں، جس کے مولانا مدیر مسوٴل تھے، قسط وار شائع ہوئی۔ بعد میں کتابی صورت میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے 1930ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ مولانا کی یہی خدمت ان کو عالمی شہرت عطا کرنے کے لیے کافی تھی، لیکن اس کے ساتھ ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک عظیم تحریک برپا کی۔ موجودہ دور میں دنیا میں جتنی بھی تحریکیں اسلام کے غلبہ اور احیا کے لیے جدّوجہد کر رہی ہیں، انہوں نے مولانا کی تحریروں سے ہی فکری غذا حاصل کی ہے۔ جماعت اسلامی کی تشکیل یوں ہی اتفاقیہ طور پر نہیں ہوگئی تھی، بلکہ اس کے لیے مولانا مودودی گزشتہ دس برس سے زمین ہموار کر رہے تھے۔ 1932ء میں انہوں نے حیدرآباد میں ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت سنبھالی، پھر اس میں برابر ایسے مضامین شائع کیے جن میں مغربی تہذیب وافکار پر سخت تنقید کی گئی تھی اور اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ اسی مجلہ کے ذریعہ مولانا نے مسلمانوں کو اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لیے اجتماعی جدّوجہد کرنے پر ابھارا۔ بالآخر ان کی دعوت پر 1941ء میں لاہور میں پچھتر (75) نفوس اکٹھا ہوئے اور جماعت اسلامی کی بنیاد پڑی۔

6.3.1 تقسیم ملک کے بعد آئندہ لائحہ عمل

تقسیمِ ملک سے قبل کے چھ (6) برسوں میں جماعت کا کام ملک میں خاصا پھیل چکا تھا اور اس کے وسیع لٹریچر سے ملک کا بڑا طبقہ متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ کل ہند اجتماعات منعقد کیے جائیں۔ چنانچہ پہلا اجتماع اپریل 1945ء میں دارالاسلام پٹھان کوٹ میں اور دوسرا اجتماع 5-7 اپریل 1946ء میں ہروارہ الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس زمانے میں ملک کی فرقہ وارانہ فضا میں تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔ 1947 کے آغاز میں جب یہ بات واضح ہوگئی کہ جلد ہی ملک کی سیاسی کش مکش اس کی تقسیم پر منتج ہونے والی ہے تو طے کیا گیا کہ کل ہند اجتماع کے بجائے علاقائی سطح پر اجتماعات منعقد کیے جائیں، جن میں جماعت کے ارکان و ہمدردان کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کی جائے۔ چنانچہ پٹنہ، مدراس، ٹونک اور پٹھان کوٹ میں علاقائی اجتماعات طے کیے گئے۔ ان اجتماعات میں مدراس میں 25-27/ اپریل 1947ء میں منعقد ہونے والا اجتماع بہت اہم تھا کہ اس میں مولانا مودودی نے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے وابستگانِ جماعت کے لیے لائحہ عمل پیش کیا تھا، جو چار نکات پر مشتمل تھا:

1. ہمارے لیے سب سے مقدّم کام یہ ہے کہ اس قومی کش مکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنے قومی اغراض اور مطالبوں کے لیے روتے رہیں، مگر اب تو اسے جاری رکھنا مہلک غلطی ہی نہیں، بلکہ احمقانہ خودکشی ہے۔
2. دوسرا اہم کام ہمارے لیے یہ ہے کہ مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلائیں، ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کریں اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کرلیں کہ ان کے ہم سایہ غیر مسلموں کو یہ سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے اور ان میں سے جو لوگ بھی اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں، خواہ وہ کسی بھی طبقے کے ہوں، ان کو بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے اندر لیا جاسکے۔

3. تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی دعوت کے لیے فراہم کرلیں اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہل قلم اب انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں حقوق کی چیخ پکار، ملازمتوں کی فی صدی تناسب پر شور وغل کے بجائے رائج الوقت نظام پر اصولی تنقید کریں اور اس سے بہتر ایک نظام زندگی پیش کرکے رائے عامہ کو اس کے حق میں ہموار کریں۔

4. چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تقریری مہارت حاصل کریں، جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کردیا جائے۔ (خطبہ مدراس، سید ابوالاعلیٰ مودودی)

6.3.2 جماعت اسلامی ہند کی تشکیل نو

تقسیم ملک کے بعد جو ارکانِ جماعت ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کے سامنے یہ سوال درپیش تھا کہ اب یہاں نظمِ جماعت کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ مشرقی اترپردیش کے ارکانِ جماعت کو نسبتاً ایک جگہ جمع ہوکر باہمی تبادلۂ خیال کا موقع حاصل تھا۔ مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی، جو سرائے میر، اعظم گڑھ کے امیر مقامی تھے، انہوں نے الٰہ آباد میں اترپردیش کے منتخب ارکان کی نشست طلب کی۔ باہم مشاورت سے طے پایا کہ اس سلسلے میں مرکزِ جماعت سے خط وکتابت کی جائے اور امیر جماعت کو ہندوستان کے ارکانِ جماعت کے احساسات سے مطلع کیا جائے۔ مولانا نے خط لکھا تو جناب میاں طفیل محمد قیم جماعت کی طرف اس کا یہ جواب موصول ہوا:

"آپ حضرات ہندوستان میں مقیم ارکانِ شوریٰ، قیمین حلقہ جات اور دوسرے صائب الرائے حضرات کو کسی ایک جگہ جمع کرکے مشورہ کریں اور ہندوستان کے نظام جماعت کو الگ کرلیں۔"

مرکزِ جماعت سے اجازت پاکر مولانا ابواللیث نے ہندوستان میں رہ جانے والے ارکانِ جماعت کا ایک اجتماع الٰہ آباد میں طلب کیا۔ یہ اجتماع 16-18/اپریل 1948ء کو منعقد ہوا۔ اس میں اکتالیس (41) افراد شریک ہوئے۔ باہم مشاورت اور غور وخوض کے بعد تمام حاضرین نے مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی کو انڈین یونین کی جماعت اسلامی کا امیر منتخب کرلیا۔ اس اجتماع کی کارروائی کی روداد جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھیجی گئی تو انہوں نے جواب میں مولانا ابواللیث کو لکھا:

"معلوم ہوا کہ آپ کو وہاں کے رفقاء نے بالاتفاق امیر جماعت منتخب کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جماعت خود بھی اسی نتیجے پر پہنچی جس پر میں پہنچا تھا۔"

جماعت کے مرکزی دفاتر ملیح آباد (لکھنؤ) میں قائم کیے گئے، پھر بعض سہولیات کے پیش نظر اواخر 1949 میں انہیں رام پور منتقل کردیا گیا۔ بعد میں دہلی کی مرکزی حیثیت اور بعض دوسری آسانیوں کی وجہ سے اگست 1960 میں وہ دہلی منتقل ہوگئے۔ آخر میں 1990 ان کی منتقلی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے متصل جامعہ نگر، ابوالفضل انکلیو کے وسیع کیمپس میں ہوگئی۔

6.3.3 نصب العین اور طریقہ کار

جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اس کے دستور میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامتِ دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔"

اس میں دو(2) الفاظ خصوصی طور پر مرکزِ توجہ ہیں: ایک دین اور دوسرے اقامت۔ دستور میں ان دونوں الفاظ کی تشریح کی گئی ہے، جو درج ذیل ہے:

"دین سے مراد وہ دینِ حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام 'اسلام' ہے۔ یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔ یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے، اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہتر نظامِ زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح و ترقی پذیر تعمیر صرف اس کے قیام سے ممکن ہے۔ (دستور جماعت اسلامی ہند، دفعہ 4)

اور 'اقامت' کے درج ذیل معنیٰ بتائے گئے ہیں:

"اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تقسیم و تفریق کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقا، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل، سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔ اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد ﷺ اور حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔"

اس سے واضح ہے کہ جماعت اسلامی ہند کا مقصد اللہ کا پیغام عام کرنا اور ملک کے تمام باشندوں تک اسے پہنچانا ہے، تاکہ وہ مالکِ حقیقی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

جماعت نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ تبلیغ و اشاعتِ افکار اور افہام و تفہیم کا طریقہ ہے، نہ کہ جبر و تشدّد، فرقہ وارانہ منافرت اور انتہا پسندی کا۔ جماعت کے دستور میں اس کے طریقہ کار کی وضاحت تین نکات میں کی گئی ہے:

1. قرآن و سنت جماعت کی اساس کار ہوں گی۔ دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اسی حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی جس حد تک قرآن و سنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔
2. جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہو گی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے

خلاف ہوں، یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔

3. جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پُر امن طریقے اختیار کرے گی، یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔" (دستور جماعت اسلامی ہند، دفعہ 5)

6.3.4 نظم جماعت

جماعت اسلامی ہند کا نظم شورائی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے یہ مرکز، حلقہ جات اور مقامی جماعتوں میں منقسم ہے۔ مرکزی نظم مجلسِ نمائندگان، مرکزی مجلسِ شوریٰ، امیر جماعت اور قیم جماعت (جنرل سکریٹری) پر مشتمل ہے۔ مجلس نمائندگان ارکانِ جماعت کے منتخب نمائندوں سے تشکیل پاتی ہے۔ اس کا کام ہر دو (2) سال پر جماعت کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا اور چار (4) سال کے لیے امیر جماعت کا انتخاب کرنا ہے۔ مجلس نمائندگان ہی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا انتخاب کرتی ہے۔ ہر حلقہ کا ایک امیر ہوتا ہے۔ اس کا تقرر امیر جماعت ارکانِ حلقہ کی رایوں اور مصالح جماعت کو سامنے رکھتے ہوئے حلقہ کی مجلس شوریٰ کے مشورے سے کرتا ہے۔ جس مقام پر ایک سے زیادہ ارکان ہوں وہاں مقامی جماعت قائم ہو جاتی ہے۔ ہر مقامی جماعت کا ایک امیر ہوتا ہے، جس کا تقرر امیر جماعت مصالح جماعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقامی ارکان اور امیر حلقہ کی رایوں کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ نظم جماعت میں عہدہ و منصب کی خواہش کو سخت ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ امیر جماعت، امیر حلقہ اور امیر مقامی کے لیے دستورِ جماعت میں جن مطلوبہ صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں اولین صفت یہ ہے کہ وہ امارت یا کسی اور اجتماعی منصب کا امیدوار یا خواہش مند نہ ہو۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے دستور جماعت اسلامی ہند)

6.3.5 امرائے جماعت اسلامی ہند

جماعت کے پہلے امیر مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی نے لگاتار چوبیس برس (1948-1972ء) اس کی قیادت کی۔ ان کے بعد امارت کے لیے مولانا محمد یوسف کا انتخاب ہوا۔ 1981ء میں دوبارہ مولانا ابواللیث کو امیر منتخب کیا گیا اور انہوں نے 1990ء تک امارت سنبھالی۔ اس کے بعد 2003 تک مولانا محمد سراج الحسن جماعت کے امیر رہے۔ ان کے بعد یہ ذمہ داری ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کو سونپی گئی، جو 2007ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس کے بعد 2019ء تک مولانا سید جلال الدین عمری امیر رہے۔ ان کے بعد سے سید سعادت اللہ حسینی امارت کی ذمے داری نبھا رہے ہیں۔

6.3.6 دائرہ کار اور خدمات

جماعت اسلامی ہند کی سرگرمیوں اور خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ وہ ملک میں بڑے پیمانے پر اسلام کا تعارف اور اس کے حق میں رائے عامّہ کی مثبت تبدیلی چاہتی ہے۔ ساتھ ہی اس سلسلے میں بھی کوشاں ہے کہ ملک میں مسلمان عزّت و وقار کے ساتھ رہیں، ان کے بنیادی حقوق محفوظ رہیں اور وہ تعلیم اور معیشت کے میدانوں میں ترقی کریں۔ اس کی سرگرمیوں اور خدمات کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1. دعوت

جماعت اسلامی ہند نے دعوت کے کام کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ اس کے نزدیک دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بندوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے، توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات اور ان کے تقاضوں سے انہیں واقف کرایا جائے، تاکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلام ہی واحد دینِ حق اور نظامِ عدل ہے، جسے اختیار کرنا دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا ضامن اور جسے نہ اختیار کرنا دنیا اور آخرت میں خسارہ کا موجب ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں باشندگانِ ملک کے درمیان بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ جماعت ان غلط فہمیوں کو دور کرنا اور ان کے سامنے صحیح تصویر پیش کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے وہ بڑے پیمانے پر انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ سمپوزیم اور بین مذہبی پروگرام منعقد کرتی ہے، دعوتی مہمات مناتی ہے اور درسِ قرآن کی مجلسیں منعقد کرتی ہے۔ جماعت نے تعارفِ اسلام پر مبنی وسیع لٹریچر (کتابیں، کتابچے اور فولڈرس) انگریزی، ہندی اور دیگر مقامی زبانوں میں تیار کیا ہے، جسے بڑے پیمانے پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسی کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں جن میں دعوت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس کام کی انجام دہی پر ابھارا گیا ہے۔

2. اصلاح معاشرہ

جماعت کی سرگرمیوں کا دوسرا اہم میدان مسلم معاشرہ کی اصلاح ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نہ صرف اپنے فریضۂ منصبی سے غافل اور اپنے مقصدِ وجود سے بے پرواہے، بلکہ شرک وبدعات کی آلائشوں، فکر وعمل کی خرابیوں اور مسرفانہ رسوم وروایات میں مبتلا ہے۔ جماعت چاہتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنے 'خیر امت' ہونے کا شعور پیدا ہو، وہ زندگی کے تمام معاملات میں کتاب وسنت کو پیش نظر رکھیں اور ان پر عمل کریں، شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیں اور انتشار وافتراق سے بچتے ہوئے اتحاد واتفاق کا ثبوت پیش کریں۔

سماج کی ایک اکائی خاندان ہے۔ خاندانوں کے مجموعے سے سماج بنتا ہے۔ اگر پاکیزہ خاندان وجود میں آئے، افرادِ خاندان ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں اور ان کے درمیان الفت ومحبت، بھائی چارہ، خیر خواہی اور ایثار کے جذبات پروان چڑھیں تو ان کے ذریعہ وجود میں آنے والا سماج بھی پاکیزہ اور مثالی ہوگا۔ اس لیے جماعت کی کوشش ہے کہ خاندان کی تعمیر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کی جائے، بچوں اور نوجوانوں کی دینی تربیت کا انتظام کیا جائے، خواتین کے حقوق وفرائض کا صحیح شعور عام ہو، معاشرہ میں انہیں صحیح مقام دیا جائے اور مرد اور خواتین دونوں مل کر، اسلامی حدود وآداب کی رعایت کے ساتھ، معروفات کے قیام اور منکرات کے ازالے میں اپنا کردار سرانجام دیں۔ جماعت چاہتی ہے کہ اگر افرادِ خاندان کے درمیان کبھی کسی معاملے میں تنازعہ پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی بتائی ہوئی ہدایات اور تعلیمات کے مطابق حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جماعت نے اس کے لیے بچوں، نوجوانوں، طلبہ، طالبات اور خواتین کے فورمس، شعبے اور تنظیمیں بنائی ہیں، جن کے ذریعہ اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ جماعت کی سرگرمیوں کا بڑا حصہ اصلاح معاشرہ کے لیے وقف ہوتا ہے۔

3. تربیت وتزکیہ

دنیا کی کوئی بھی تحریک اپنے کارکنوں کی تربیت اور اصلاح سے غفلت نہیں برت سکتی۔ اس لیے کہ تربیت کے بغیر وہ مردانِ کار تیار

ہی نہیں ہوسکتے جو اسے مطلوب ہیں اور اس دنیا میں وہ صالح انقلاب برپا ہی نہیں ہوسکتا جو اس کے پیش نظر ہے۔ جماعت اسلامی ہند شروع سے اپنے وابستگان اور متوسلین کی تربیت کی طرف متوجہ رہی ہے اور اس کے لیے مختلف پروگرام وضع کیے ہیں۔

جماعت کے تربیتی نظام میں مطالعہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے پر زور دیا جاتا ہے، صحت کے ساتھ تلاوت کرنے اور تجوید کے اصولوں کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی جاتی ہے، قرآن مجید کے کسی ترجمہ اور تفسیر کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ احادیثِ نبوی کے متعدد منتخبات تیار کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات میں عام دینی کتب پر مشتمل ایک کورس تیار کیا گیا ہے، جس سے استفادہ کرنے کا ہر سطح کے ذمے دارانِ جماعت اور عام ارکان وکارکنان کو پابند کیا جاتا ہے۔ وابستگان کی روحانی تربیت پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ فرائض کی پابندی، نمازوں کا باجماعت اہتمام، نوافل کی ادائیگی، مسنون دعاؤں کا التزام، اخلاقِ فاضلہ سے آراستگی اور رذائل اخلاق سے اجتناب، اہل وعیال اور اہل خاندان کی تربیت کی فکر، رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی، معاملات میں شفافیت، کارکنوں کے درمیان فکری ہم آہنگی اور بہتر تعلقات اور نظم جماعت کی پابندی، ان تمام کاموں کی طرف نہ صرف یہ کہ برابر متوجہ کیا جاتا ہے، بلکہ وقتِ ضرورت احتساب بھی کیا جاتا ہے۔ مرکز اور حلقوں کی سطح پر وقتاً فوقتاً تربیت گاہیں قائم کی جاتی ہیں، جن میں منتخب کارکنوں کو ہفتہ عشرہ ایک ساتھ رکھ کر ان کی تربیت کی جاتی ہے۔

تربیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی کی پوشیدہ صلاحیتیں بیدار ہوں اور انہیں نشوونما ملے۔ جماعت اس پہلو کی طرف بھی متوجہ ہے۔ چنانچہ اس نے Human Resource Development(HRD) کا شعبہ قائم کیا ہے۔ اس کے تحت کارکنوں میں مختلف صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ورک شاپس منعقد کی جاتی ہیں۔ اس کام کو بڑے پیمانے پر انجام دینے کے لیے جماعت نے شفیع مونس اکیڈمی قائم کی ہے

4. خدمت خلق

اسلام میں تمام انسانوں سے ہم دردی اور غم خواری پر زور دیا گیا ہے۔ ساری مخلوق کو اللہ کا کنبہ کہا گیا ہے۔ بلا تفریق مذہب وملت، ذات برادری اور رنگ ونسل، سب کے ساتھ حسن سلوک کرنا، مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کرنا، مظلوموں کی حمایت اور دادرسی کرنا اور آفت زدہ لوگوں کے کام آنا، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند اپنے قیام کی ابتدا سے ہی رفاہی، فلاحی اور خدمتِ خلق کے کام بلا تفریق مذہب انجام دیتی رہی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد مختلف ریاستوں میں کافی دنوں تک مسلم کش فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مواقع پر جماعت نے بڑے پیمانے پر ریلیف کا کام کیا اور پھیلے ہوئے خوف وہراس کو دوٗر کرنے کی سعی کی۔ فسادات کے علاوہ قحط، سیلاب، زلزلے، سائیکلون، آتش زدگی اور دیگر مواقع پر اپنے محدود وسائل وذرائع کے باوجود خدمتِ خلق کا کام انجام دیا۔

جماعت کا خدمتِ خلق کا کام مختلف الجہات ہے۔ قدرتی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات میں ہنگامی طور پر ریلیف فراہم کرنے کے علاوہ اس کی رفاہی سرگرمیاں عام دنوں میں بھی جاری رہتی ہیں۔ اس نے بڑے پیمانے پر ہاسپٹلس اور ڈسپنسریاں قائم کی ہیں، تاکہ غریب اور نادار بیماروں کا واجبی فیس کے ساتھ یا مفت علاج کا بندوبست ہوسکے۔ اس کے علاوہ چھوٹے پیمانے پر بلا سودی قرض دینے کی اسکیمیں جاری کی

ہیں۔ خدمتِ خلق کے یہ کام مرکزی، ریاستی اور مقامی تمام سطحوں پر انجام دیے جاتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: جماعت اسلامی ہند کی رفاہی خدمات، شعبۂ تنظیم مرکز جماعت اسلامی ہند)

5. تعلیم

مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کی تشکیل سے پہلے ہی اپنے متعدد مضامین میں رائج الوقت نظامِ تعلیم کی خامیاں واضح کی تھیں اور مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لیے نئے نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا تھا۔ یہ مضامین 1936ء اور اس کے بعد ماہ نامہ ترجمان القرآن میں 'ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص'، مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل' اور 'نیا نظام تعلیم' کے عناوین سے شائع ہوئے۔ ان میں انہوں نے عصری اور دینی نصاب ہائے تعلیم میں اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت بتاتے ہوئے واضح کیا تھا کہ دنیا کی امامت و قیادت کے جس منصب پر امتِ مسلمہ کو فائز کیا گیا ہے اس کے لیے نیا نظام تعلیم تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔

جماعت اسلامی اپنی تشکیل کے ساتھ اس نئے نظام تعلیم کی صورت گری کے لیے فکر مند ہوگئی۔ چنانچہ 14/اگست 1944ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں مجلس تعلیمی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں نئے نظام تعلیم کا پورا خاکہ پیش کیا گیا، پھر اس میں رنگ بھرنے کے لیے بنیادی تعلیم کی درس گاہ بھی قائم کر دی گئی۔ ابھی یہ سرگرمیاں ابتدائی مرحلے ہی میں تھیں کہ ملک کی تقسیم عمل میں آگئی اور جماعت اسلامی کا نظم بھی الگ الگ ہو گیا۔

جماعت اسلامی ہند نے روزِ اوّل ہی سے نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اور اس کی فکر کی۔ چنانچہ تشکیلِ جماعت کے بعد اس کی مجلس شوریٰ کے پہلے ہی اجلاس (منعقدہ 27 تا 29 اگست 1948ء) میں اس مسئلے پر غور ہوا اور نصاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 28/ستمبر 1948ء کو نو تشکیل شدہ نصاب کمیٹی کا اجلاس رام پور میں منعقد ہوا، جس میں ابتدائی تعلیم کا خاکہ مرتب کیا گیا اور اس پر عمل آوری کے لیے ابتدائی درس گاہ قائم کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ درس گاہ یکم جنوری 1949ء سے ملیح آباد (لکھنؤ) میں، جہاں جماعت کا مرکز تھا، مرکزی درس گاہ جماعت اسلامی ہند کے نام سے قائم کر دی گئی، پھر چند ماہ کے بعد جولائی 1949ء میں رام پور منتقل کر دی گئی اور جناب افضل حسین (1918-1990ء) کو، جو اس وقت ضلع جھانسی (اتر پردیش) کے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل تھے، بلا کر درس گاہ کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔

درس گاہ کے قیام کے بعد درسی کتابوں کی تیاری کا سلسلہ شروع ہوا اور پرائمری سطح کے تمام مضامین کی درسی کتابیں اور معاون کتابیں تیار کر لی گئیں۔ 1990ء سے مرکز جماعت میں باقاعدہ شعبۂ تعلیم کے قیام کے بعد درسی کتب میں مسلسل نظر ثانی، حذف واضافہ، نئی درسی کتب کی تیاری اور ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ان کی منتقلی کا کام ہو رہا ہے۔ یہ درسی کتابیں اردو، اسلامیات، ہندی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، علم شہریت، سائنس، عربی اور انگریزی کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں جہاں اسلامی نقطۂ نظر کی پیش کش کو ترجیح دی گئی ہیں وہیں زبان وبیان اور مواد کو سلیس، آسان اور دل چسپ بنا کر بچوں کے ذوق ورجحان اور نفسیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جماعت کے تیار کردہ اس نصاب کو ملک میں کافی مقبولیت حاصل ہے اور مختلف تعلیمی اداروں نے اسے اپنے یہاں جگہ دی ہے۔

جماعت اسلامی ہند کے ارکان و متوسلین کی کوششوں سے ملک کے طول و عرض میں تعلیمی اداروں کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم ہو گیا ہے۔ کہیں انہوں نے خود ادارے قائم کیے ہیں اور کہیں ملت کے اصحابِ خیر کے تعاون سے ان کا قیام ہوا ہے۔ مستقل تعلیمی اداروں کے علاوہ بڑی تعداد میں جزوقتی صباحی و شبینہ مکاتب قائم کیے گئے، جہاں چھوٹے بچوں کے لیے ناظرۂ قرآن کے ساتھ عربی زبان، اسلامیات اور اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے دینی تعلیم کی سنڈے کلاسز اور تعطیلاتی کلاسز کے انعقاد کے علاوہ کرناٹک، مدھیہ پردیش اور بعض دیگر ریاستوں میں دینی معلوماتی امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں، جن میں ہزاروں طلبہ وطالبات شریک ہو کر اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اساتذہ کی دینی، فکری اور فنّی رہ نمائی کے لیے ٹیچرس ٹریننگ کیمپس کا انعقاد جماعت کے شعبۂ تعلیم کی مستقل سرگرمی ہے۔ اس مقصد سے کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔ تعلیمی لیکچرس اور نمونہ کے اسباق کی ویڈیوز بھی تیار کی گئی ہیں اور مختلف دورانیہ کے کیمپس بھی پابندی سے منعقد کیے جاتے ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کی ابتدا سے کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل حل کرنے کے لیے ملت میں مشترکہ کوششیں کی جائیں۔ چنانچہ مختلف ریاستوں میں اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں، جماعت نے ان کا ساتھ دیا۔ 30-31/دسمبر 1959ء میں ضلع بستی (اترپردیش) میں مختلف مکاتبِ فکر کے ملّی رہ نمائوں کی موجودگی میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا قیام عمل میں آیا تو جماعت پہلے دن سے اس میں شامل رہی۔ کونسل کے ذریعہ قائم کیے گئے مکاتب و مدارس میں عرصہ تک جماعت کی تیار کردہ درسیات پڑھائی جاتی رہیں۔ 1965ء میں حکومت کے ایک آرڈیننس اور ایکٹ کے ذریعہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا اقلیتی کردار ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے خلاف مزاحمت میں جماعت ملّت کے شانہ بہ شانہ کھڑی رہی۔ جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاسوں کی قرار دادیں اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

2019ء میں جماعت نے تعلیمی میدان میں کاموں کی توسیع کے لیے 'مرکزی تعلیمی بورڈ' قائم کیا ہے۔ اس کے تحت درسیات پر نظر ثانی، تعلیمی اداروں کی رہ نمائی، سرکاری درسی کتابوں میں قابلِ اعتراض مواد کی نشان دہی، حکومت کی تعلیمی پالیسی پر نظر اور دیگر اہم کام انجام دیے جارہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات، محمد اشفاق احمد، جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی کاوشیں، افضل حسین)

6. ملکی اور ملی امور

جماعت اسلامی ہند کی ابتدا سے کوشش رہی ہے کہ ملک و ملت کی تعمیر، ان کی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل کے حل میں اپنا کردار ادا کرے۔ جماعت چاہتی ہے کہ ہندوستانی سماج میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً ظلم و استحصال، بددیانتی، مکر و فریب، اونچ نیچ اور عصبیت، اوہام پرستی، بے حیائی، قتلِ ناحق، قتلِ اولاد، جہیز کے لیے جبر، لڑکیوں کی حق تلفی، جوا، شراب، سود، اسراف، وغیرہ، وہ دوٗر ہوں اور ملک امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔ جماعت کی کوشش ہے کہ مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان پائی جانے والی دوٗریاں کم ہوں، افتراق و انتشار، تصادم اور کش مکش کی فضا ختم ہو، باشندگانِ ملک رواداری اور احترامِ انسانیت کے جذبے سے مل جل کر ملک کی ترقی کے لیے کام

کریں، نظامِ حکم رانی کے آزاد اداروں کی خود مختاری محفوظ رہے، دستورِ ہند کی انسانی قدریں باقی رہیں اور شہری حقوق کا احترام ہو۔

اسی طرح جماعت امتِ مسلمہ کی ترقی اور تحفظ کے لیے بھی فکر مند اور کوشاں رہتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ اور دینی تشخّص کی بقا کے لیے پیہم جدّوجہد کرتی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ امّت تعلیم، معیشت اور صحتِ عامّہ کے محاذوں پر ترقی کرے۔ مسلمانوں کا بہت بڑا سرمایہ اوقاف کی شکل میں ہے، لیکن حکومتی اور غیر حکومتی حلقوں کی جانب سے ان میں ناجائز تصرفات کی کوشش آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ جماعت ان کے تحفظ کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتی ہے۔ جماعت نے ایسے گروپس تشکیل دیے ہیں جو مسلمانوں اور دیگر کم زور اور مظلوم طبقات پر مظالم کے خلاف فوری طور پر متحرک ہوں اور ان کے حق میں قانونی چارہ جوئی کریں۔

7. مسلمانوں کے مشترکہ پلیٹ فارمس کی تشکیل

جماعت اسلامی ہند کی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہم مشورہ سے انجام پائیں۔ دینی جماعتوں کے سربراہان اور ملت کے نمائندہ شخصیات مل بیٹھ کر غور وفکر کریں اور متحدہ موقف اختیار کریں۔

1972ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ میں 'متبنّیٰ بل' پیش کیا گیا تھا، جس کی رو سے منھ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کے حقوق حاصل ہو رہے تھے۔ اُس وقت کے وزیر قانون نے اس بل کو یکساں سول کوڈ کی جانب پہلا قدم قرار دیا تھا۔ یہ مسلم پرسنل لا میں کھلی مداخلت تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے تمام فرقوں، مسلکوں، اور جماعتوں کے رہ نماؤں نے اس کی سخت مخالفت کی اور 27-28/دسمبر 1972ء کو ممبئی میں بہت بڑا اجلاس منعقد کیا۔ اس میں اسلام کے عائلی قوانین کی حفاظت کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تشکیل دینے پر اتفاق ہوا۔ چنانچہ 7/اپریل 1973ء کو حیدرآباد دکن میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی باقاعدہ تاسیس عمل میں آئی۔ جماعت اسلامی ہند ابتدا سے اس میں شریک رہی ہے۔ جماعت کے پہلے امیر مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی، جناب محمد مسلم، مولانا سید احمد عروج قادری، جناب شمس پیرزادہ اور دیگر اکابرِ جماعت اس کے داعیان میں سے تھے۔ بعد میں مولانا محمد سراج الحسن، مولانا سید جلال الدین عمری اور اب جناب سید سعادت اللہ حسینی اس کے نائب صدر رہیں۔ بورڈ کی دیگر باڈیز اور کمیٹیوں میں بھی جماعت کی نمائندگی ہے۔

اسی طرح گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں، جب ملک میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے، ملک کے معروف علماء اور دانش وروں نے ایک گروپ تشکیل دیا تھا، جو مسلمانوں کی رہ نمائی، ان کے حقوق کی بحالی اور جان ومال کے تحفظ میں اہم کردار ادا کرے۔ چنانچہ 8/اگست 1964ء کو مسلم تنظیموں کا ایک فیڈریشن 'آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت' کے نام سے وجود میں آیا تھا۔ نصف صدی میں مشاورت نے اہم خدمات انجام دی ہے۔ اس کی تشکیل میں دیگر عمائدینِ امّت کے ساتھ مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی اور جناب محمد مسلم کا کلیدی کردار ہے اور جماعت اسلامی ہند اس کی سرگرمیوں میں شامل رہی ہے۔

دیگر مواقع پر بھی جماعت کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے اہم معاملات میں تمام دینی جماعتوں کے رہ نما باہم مشاورت کرکے متحدہ موقف اختیار کریں اور حکومت کے سامنے ان کی اجتماعی نمائندگی ہو۔

8. چند اہم کام

جماعت اسلامی ہند نے چند ایسے اہم کام انجام دیے ہیں جنہوں نے اس کی امتیازی شناخت بنائی ہے اور سماج پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں:

1. قرآن مجید کے تراجم:

جماعت اسلامی نے اسلام کا پیغام ملک کے تمام طبقات تک پہنچانے کے لیے قرآن مجید کا ملک کی مقامی زبانوں میں ترجمہ کروانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اب تک پندرہ(15) زبانوں میں ترجمۂ قرآن شائع ہو چکا ہے: (1) اردو (2) ہندی (3) انگریزی (4) مراٹھی (5) پنجابی (6) گجراتی (7) ملیالم (8) تامل (9) آسامی (10) بنگالی (11) تیلگو (12) کنڑ (13) اڑیا (14) منی پوری (15) کونکنی۔ اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن کا بھی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

2. اسلامی لٹریچر کی اشاعت:

جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے فوراً بعد اس نے اپنا دارالاشاعت مرکزی مکتبہ اسلامی کے نام سے قائم کر لیا تھا۔ مرکز جماعت دہلی منتقل ہوا تو اس کی بھی منتقلی عمل میں آئی۔ بعد میں اس کا نام تھوڑا تبدیل کر کے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کر دیا گیا۔ اب تک اس کے ذریعہ اردو میں 1221، ہندی میں 398 اور انگریزی میں 328 کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی دیگر مقامی زبانوں میں دارالاشاعت قائم کیے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ بڑے پیمانے پر دینی لٹریچر شائع کیا جا رہا ہے۔

3. اخبارات و رسائل کا اجرا:

جماعت نے میڈیا کی طاقت محسوس کرتے ہوئے ملک کی مختلف زبانوں میں اخبارات و رسائل نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ان اخبارات نے نہ صرف قارئین کی سیاسی بیداری اور ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا، بلکہ ان کی دینی معلومات میں بھی اضافہ کیا۔ چند اہم اور مشہور رسائل کے نام درج ذیل ہیں:

☆روزنامہ، سہ روزہ، ہفت روزہ دعوت دہلی (اردو)
☆ماہنامہ زندگی رام پور، زندگی نو دہلی (اردو)
☆ہفت روزہ، ماہنامہ کانتی دہلی (ہندی)
☆ہفتہ روزہ ریڈینس دہلی (انگریزی)
☆ہفت روزہ پربودھنم کالی کٹ (ملیالم)
☆ماہنامہ بودھنم کالی کٹ (ملیالم)
☆ہفت روزہ گیتورائی حیدرآباد (تیلگو)
☆ہفت روزہ مجاہد گوہاٹی (آسامی)
☆ہفت روزہ میزان کلکتہ (بنگلہ)
☆ہفت روزہ شاہین احمد آباد (گجراتی)
☆ہفت روزہ شانتی مارگ (مراٹھی)
☆ہفت روزہ سن مارگ بنگلور (کنڑ)
☆پندرہ روزہ سمرسم چنئی (تمل)

4. اداروں کا قیام:

جماعت نے اپنی بڑھتی ہوئی اور متنوع سرگرمیوں کو منظم کرنے اوران میں تیزی لانے کے مقصد سے آزاد اور مستقل اداروں کے قیام کا فیصلہ کیا۔ یہ ادارے مختلف ٹرسٹوں کے تحت آزادانہ حیثیت میں کام کر رہے ہیں:

☆مرکزی تعلیمی بورڈ ☆شریعہ کونسل

☆اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ (ہندی کتابوں کی تیاری کا ادارہ) ☆سدبھائونا منچ

☆دھارمک جن مورچہ ☆Human welfare Foundation(HWF)

☆Vision 2026 ☆Human Welfare Trust (HWT)

☆Movement for Peace and Justice (MPJ)

☆Center for Study and Research (CSR)

☆Forum for Democracy and Communal Amity(FDCA)

☆Association for Protection of Civil Rights (APCR)

☆Ideal Relief Wing (IRF)

☆(SMART)Shafi Monis Academy for Resource Development and Training

☆Indian Institute of Islamic Studies and Research (IISSR)

☆Board of Islamic Publication (BIP)

☆Entrepreneurship Development Cell (EDC)

☆Rifah Chambers of Commerce (RCC)

☆Federation of Muslim Educational Institutions of India (FMEII)

☆Society for Bright Future (SBF)

☆All India Ideal Teachers Association (AIITA)

☆Sahulat Microfinance Society(SMS)

☆Indian Center of Islamic Finance (ICIF)

6.4 جماعت اسلامی ہند اور سیاست

جماعت کے بارے میں بعض حلقوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نصب العین (اقامتِ دین) کو سیاسی رخ دے دیا ہے۔ اس سے سیاسی ذوق اور سیاسی تبدیلی کا رجحان تو پیدا ہو سکتا ہے، لیکن دینی جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خود مختار اور آزاد نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو، اس میں اسے اللہ کی ہدایت کا طالب ہونا چاہیے۔ مولانا سید جلال الدین عمریؒ نے لکھا ہے:

"دین ہماری پوری زندگی کے لیے ایک مربوط نظامِ فکر و عمل فراہم کرتا ہے۔ اس میں سیاست بھی داخل ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی سیاست کو نہ تو دین سے خارج سمجھتی ہے اور نہ کل دین، بلکہ اسے وہ دین کا ایک ضروری اور لازمی جز تصور کرتی ہے اور اسی حیثیت سے اس کا تعارف کراتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح موجودہ سیاست کا رخ بھی غلط ہو گیا ہے اور اس نے پوری دنیا کو فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے۔ اس کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ اور اس کے قانون سے بے نیازی ہے۔ کسی فرد، ادارہ یا ریاست کو خدا کے قانون سے بے نیاز ہو کر حکم رانی کا حق دیا جائے گا تو وہ بے لگام ہو ہی جائے گا اور بے لگام طاقت جو بھی کر گزرے، کم ہے۔ اس بنیادی حقیقت سے عام طور پر چوں کہ غفلت برتی جاتی ہے اس لیے جماعت پورے زور اور قوت کے ساتھ اس طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس پر کہا جاتا ہے کہ جماعت پر سیاست سوار ہے اور اس نے دین کو سیاست بنا دیا ہے۔"

(جماعت اسلامی ہند: پس منظر، خدمات اور طریقہ کار، سید جلال الدین عمری، ص66-67)

6.4.1 جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعت کا موقف

جماعت اسلامی ہند اسلام کی اشاعت اور غلبہ کی علم بردار ہے، اس کے لیے وہ ملک کی رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہتی ہے۔ اسے بعض لوگ فرقہ واریت اور انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ ملک کے تمام باشندوں کے درمیان مذہب و مسلک سے بلاتر ہو کر امن و امان اور بھائی چارہ قائم رکھنا چاہتی ہے اور فرقہ وارانہ منافرت اور طبقاتی کش مکش کو ختم کرنے کی خواہاں ہے۔ اس پر بعض حضرات کہتے ہیں کہ جماعت نے اپنا نصب العین ترک کر دیا ہے اور جمہوریت اور سیکولرزم کی داعی بن گئی ہے۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعت کا موقف واضح کر دیا جائے۔

جمہوریت کے بارے میں جماعت کے موقف کی ترجمانی سابق امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمریؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

"بعض لوگ جماعت کو جمہوریت (Democracy) کی مخالف سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک پہلو سے جمہوریت کے تصور سے اختلاف رکھتی ہے تو دوسرے پہلو سے صاف الفاظ میں اس کی تائید کرتی ہے۔ جمہوریت میں اقتدار کا مرکز عوام ہوتے ہیں۔ ان ہی کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ وہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا ضابطۂ حیات صحیح اور کون سا غلط ہے؟ صحیح اور غلط یا حق و باطل کے فیصلہ کا کلّی اختیار وہ رکھتے ہیں۔ ان کے اقتدار کو سلب کرنے یا اس پر پابندی لگانے والی کوئی اور طاقت نہیں ہوتی۔ قانون سازی عملاً

ان کے نمائندے کرتے ور نظمِ مملکت چلاتے ہیں۔ اسلام اس معنیٰ میں جمہوریت کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ اسی کی ذات سرچشمۂ اقتدار ہے۔ قانون دینے کا اسی کو حق ہے۔ انسان قانون ساز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنے اور اسے دنیا میں نافذ کرنے والا ہے۔ وہ اس حد تک آزاد ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے آزادی عطا کی ہے اور ان حدود کا پابند ہے جن کا اسے اللہ نے پابند بنایا ہے۔ وہ اسی کی ہدایات کے تحت اپنے لیے اصول اور ضابطے وضع کرے گا اور اس کے قائم کردہ حدود کے اندر عمل کرے گا۔ اسلام کا یہ تصور آج کے تصوّرِ جمہوریت سے متصادم ہے۔ اس وجہ سے جماعت اسے غیر اسلامی سمجھتی ہے۔ جمہوریت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں مساوات اور عدل وانصاف کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ملک کے تمام شہری سیاسی، سماجی اور قانونی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ حقوقِ شہریت سب کے یکساں ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ جمہوریت میں ملکی قانون کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے اور اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس میں ہر فرد کو تحریر وتقریر کی رائے اور خیال اور عقیدہ ومذہب کی آزادی حاصل ہے۔ کسی اجتماعی مقصد کے لیے جماعت بنانے اور تنظیم قائم کرنے کا شہریوں کو حق ہے۔ یہ سب باتیں اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس پہلو سے جماعت جمہوریت کی تائید کرتی ہے اور موجودہ حالات میں اسے ملک کے لیے بہتر اور موزوں طرز سیاست سمجھتی ہے۔ "

(جماعت اسلامی ہند: پس منظر، خدمات اور طریقہ کار، سید جلال الدین عمری، ص69-71)

سیکولرزم کو مذہب مخالف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا مفہوم ہندوستان کے پس منظر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ریاست مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان تفریق نہ کرے۔ مؤخر الذکر مفہوم میں جماعت سیکولرزم کی مخالفت نہیں کرتی۔ اس کے بارے میں جماعت کا یہ موقف بیان کیا گیا ہے:

"ہندوستان کو اس معنیٰ میں ایک سیکولر ریاست کہا جاتا ہے کہ اس کا دستور مختلف مذاہب اور ان کے پیروؤں کے درمیان غیر جانب دار ہے، یعنی وہ مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتا۔ اس کی رو سے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ واشاعت کی یکساں آزادی ہے۔ دستورِ ہند کی مذکورہ خصوصیات ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کے لیے بھی موقع فراہم کرتی ہیں۔ بنابریں جماعت اسلامی ہندوستان کے نظامِ حکومت کی مذکورہ ان خصوصیات کی اور اس مفہوم میں سیکولرزم کی مخالف نہیں ہے۔ سیکولرزم کا وسیع تر اور ایجابی مفہوم یہ ہے کہ مذہب کو انسانی زندگی سے یا کم از کم اس کے اجتماعی دائرے سے بے دخل کر دیا جائے۔ سیکولرزم کا وہ مفہوم جو انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی سے ہدایتِ الٰہی کی بے دخلی اور الحاد کے ہم معنیٰ ہو، اسلام کی ضد ہے۔"

6.4.2 جماعت کا پچھتر سالہ سفر

جماعت اسلامی ہند نے اپنی تاسیس کے پچھتّر (75) برس مکمل کر لیے ہیں۔ اس عرصے میں اس نے دعوت، اصلاحِ معاشرہ، تربیت، خدمتِ خلق، تعلیم اور دیگر میدانوں میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں اس نے وقتاً فوقتاً اپنی پالیسیوں اور پروگراموں میں حسبِ ضرورت تبدیلی کی ہے، لیکن اپنے مشن اور نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس کا شمار ملک کی بڑی اور نمایاں تنظیموں میں ہوتا ہے اور اس کے خدمات کا ملک کے تمام طبقات میں اعتراف کیا جاتا ہے

6.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جماعت اسلامی کا قیام غیر منقسم ہندوستان میں 1941ء میں ہوا تھا۔ جماعت اسلامی ہند کی تاسیس اپریل 1948ء میں الٰہ آباد میں ہوئی تھی۔
- جماعت کا نصب العین 'اقامتِ دین' ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا حصول ہے۔
- قرآن و حدیث جماعت اسلامی ہند کی اساسِ کار ہے۔
- جماعت اپنے کاموں میں اخلاقی حدود کی پابندی کرتی اور تعمیری اور پُرامن طریقے اختیار کرتی ہے۔
- جماعت کا نظم شورائی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے یہ مرکز، حلقہ جات اور مقامی جماعتوں میں منقسم ہے۔
- جماعت نے 'دعوت' (اللہ کے بندوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا) کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔
- جماعت کی کوشش ہے کہ مسلمانوں میں اپنے خیر امّت ہونے کا شعور پیدا ہو اور وہ شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیں۔
- جماعت اپنے کارکنوں اور وابستگان کی روحانی، فکری اور علمی تربیت کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ جماعت رفاہی، فلاحی اور خدمتِ خلق کے کام بلا تفریق مذہب انجام دیتی ہے۔
- جماعت نے اسلامی نقطۂ نظر سے پرائمری اور ثانوی سطح کی درسی کتابیں تیار کی ہیں اور جز وقتی مکاتب اور دینی و عصری تعلیم کے بہت سے ادارے قائم کیے ہیں۔
- جماعت ملک و ملّت کی تعمیر، ان کی فلاح و بہبود اور ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتی ہے۔
- جماعت نے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مشترکہ پلیٹ فارمس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔
- جماعت نے ملک کی پندرہ (15) زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر بڑے پیمانے پر طبع کیا ہے اور اس کی جانب سے اخبارات و رسائل بھی نکل رہے ہیں۔
- جماعت نے اپنی متنوّع سرگرمیوں کی انجام دہی کے لیے مستقل ادارے قائم کیے ہیں، جو آزادانہ طور پر کام کر رہے ہیں۔
- جماعت سیاست کو دین کا ضروری اور لازمی جز سمجھتی ہے۔ جماعت جمہوریت اور سیکولرزم کے مثبت پہلوؤں کی تائید کرتی ہے۔

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

6.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت اسلامی کی تاسیس کس سنہ میں ہوئی تھی؟

1932.(a) 1935.(b) 1940.(c) 1941.(d)

2. مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مشہور کتاب 'الجہاد فی الاسلام' پہلے قسط وار کس جریدہ میں شائع ہوئی تھی؟

(a).دعوت (b).زندگی (c).الجمعیۃ (d).الانصاف

3. جماعت اسلامی ہند کے پہلے امیر کون ہیں؟

(a).مولانا صدرالدین اصلاحی (b).مولانا ابواللیث اصلاحی (c).مولانا امین احسن اصلاحی (d).مولانا محمد یوسف

4. جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے لیے کس شہر میں ارکانِ جماعت کا اجتماع ہوا تھا؟

(a).اعظم گڈھ (b).رام پور (c).الہ آباد (d).ملیح آباد

5. جماعت اسلامی ہند کی تشکیلِ نو کس سنہ میں ہوئی تھی؟

1945.(a) 1947.(b) 1948.(c) 1951.(d)

6. جماعت اسلامی ہند کے ذریعے قائم کردہ ابتدائی درس گاہ کا ناظم کس کو بنایا گیا تھا؟

(a).شفیع یونس (b).مائل خیر آبادی (c).ابوالمجاہد زاہد (d).افضل حسین

7. مولانا مودودیؒ کی دعوت پر جماعت کی تاسیس کے لیے لوگ کس شہر میں جمع ہوئے تھے؟

(a).پٹھان کوٹ (b).کراچی (c).لاہور (d).خیر آباد

8. جماعت اسلامی ہند کے اب تک کتنے امیر بنے؟

4.(a) 6.(b) 5.(c) 7.(d)

9. مولانا مودودیؒ نے تقسیم ملک سے قبل جماعت اسلامی کے ارکان کے سامنے آئندہ کام کرنے کا جو لائحۂ عمل پیش کیا تھا، وہ کتنے نکات پر مشتمل تھا؟

3.(a) 4.(b) 5.(c) 6.(d)

10. جماعت اسلامی ہند کا مرکز رام پور سے دہلی کس سنہ میں منتقل ہوا تھا؟

1971.(a) 1949.(b) 1955.(c) 1960.(d)

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کیسے ہوئی تھی؟
2. جماعت اسلامی ہند کے خدمتِ خلق کے کاموں پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا مودودیؒ نے جماعت کے وابستگان کے لیے تقسیمِ ملک کے بعد کا کیا لائحۂ عمل پیش کیا تھا؟
4. اصلاحِ معاشرہ کے لیے جماعت کی کیا سرگرمیاں ہیں؟
5. مسلمانوں کے مشترکہ پلیٹ فارمس کی تشکیل کے لیے جماعت نے کیا کوششیں کیں۔

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت اسلامی ہند کے نصب العین اور طریقہ کار پر روشنی ڈالیے۔
2. تعلیم کے میدان میں جماعت اسلامی ہند کی کیا خدمات ہیں؟
3. جمہوریت اور سیکولرازم کے بارے میں جماعت اسلامی ہند کا کیا نقطۂ نظر ہے۔

6.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جماعت اسلامی کی دعوت : مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی
2. تاریخ جماعت اسلامی : جناب آباد شاہ پوری
3. جماعت اسلامی کا مقصد اور طریقہ کار : مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی
4. تشکیل جماعت اسلامی ہند۔ کیوں اور کیسے؟ : مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی
5. مختصر تاریخ جماعت اسلامی ہند : جناب محمد شفیع مونس
6. جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات : جناب محمد اشفاق احمد
7. جماعت اسلامی ہند کی رفاہی خدمات : شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی ہند

اکائی 7: مرکزی جمعیت اہل حدیث

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام و تاریخی پس منظر

7.3 اغراض و مقاصد

7.4 مرکزی جمعیت اہل حدیث کا منہج اور تنظیم و تشکیل

7.5 مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی صوبائی شاخیں

7.6 مرکزی جمعیت اہل حدیث کے شعبہ جات اور اس کے امتیازات

7.6.1 شعبہ تنظیم

7.6.2 شعبہ دعوت و تبلیغ

7.6.3 شعبہ تعلیم و تربیت

7.6.4 شعبہ نشر و اشاعت

7.6.5 شعبہ مالیات

7.6.6 شعبہ احصائیات

7.6.7 شعبہ افتاء

7.6.8 شعبہ تعمیرات

7.6.9 شعبہ رفاہ عامہ و سماجی خدمات

7.7 قومی و ملی خدمات

7.8 مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا نصاب تعلیم

7.9 بیرون ملک میں سلفی جماعتوں کا مختصر تعارف

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

7.10 اکتسابی نتائج
7.11 نمونہ امتحانی سوالات
7.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

اس اکائی میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک مشہور و نمائندہ تحریک 'مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند' کا ایک ایسا تعارف پیش کیا جائے جو اس کے قیام اور پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کے اغراض و مقاصد، نصب العین، تشکیل و تنظیم، طریقہ کار، کارگزاریوں اور خدمات پر مشتمل ہو۔ نیز یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ کس طرح یہ تحریک انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی پر اثرانداز ہو رہی ہے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ جدید ہندوستان میں ابھرنے والی مشہور تحریک جمعیت اہل حدیث ہند سے نہ صرف واقف ہو سکیں بلکہ اس کا بخوبی تعارف حاصل کر لیں، ساتھ ہی وہ اس کے قیام و پس منظر، اغراض و مقاصد، منہج، تنظیم و تشکیل، کارگزاریوں اور ان کی خدمات اور کارناموں سے بھی متعارف ہو جائیں۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ جدید ہندوستان کے دوسرے تحریکات میں موازنہ و تفریق کر سکیں۔

7.2 مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام و تاریخی پس منظر

یہ جماعت بیسویں صدی کے آغاز میں منصہ شہود میں آئی۔ اس کے قیام کے محرکات میں جہاں مسلک اہل حدیث کے متبعین کی شیرازہ بندی مقصود تھی وہیں امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ ہند کے درمیان غیر اسلامی رسم و رواج بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسموں سے چھٹکارا دلا کر خالص کتاب و سنت کی تعلیمات پر گامزن کرنا تھا۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی شعاعیں پہلی بار عہد خلافت راشدہ میں ہندوستان میں پہونچیں، پھر محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ کو فتح کیا۔ فتح سندھ کے وقت اسلام اپنی خالص ترین شکل میں تھا، پھر رفتہ رفتہ بدعات اور غیر اسلامی رسوم پیدا ہوئیں اور جڑ پکڑتی گئیں حتیٰ کی مغل حکمراں اکبر کے دور تک تاریکی و گمراہی آخری حدوں کو

چھوگئی، یہ درحقیقت اسلامی ہند کی ضلالت کبریٰ کا دور تھا۔ اس دور میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (1564-1624) نمودار ہوئے اور اکبر کی بدعات اور تصوف کی گمراہیوں پر کاری ضرب لگائی۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بے لاگ تحقیق و تنقید سے اسلامی معاشرے واقتدار اور امت کے فکری زوال کے ایک ایک سبب کا کھوج لگایا اور ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے تمام ذرائع کی نشاندہی کر کے تجدید و احیائے دین کی داغ بیل ڈالی اور اپنے تلامذہ اور خواص کی ایک جماعت تیار کر دی جنہوں نے آپ کے بعد آپ کے تجدیدی کاز کو آگے بڑھایا۔ آپ کے تلامذہ وخواص میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا نصیر الدین منگلوری، شیخ ولی پھلتی، سید نصیر الدین دہلوی، مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں نے تحریک جہاد فی سبیل اللہ اور قتال کفار کو پورے ہندوستان میں برپا کر کے ایک خالص اسلامی حکومت کی بنیاد استوار کرنے کی بر پور کوشش کی، بلکہ یہ کہنا بیجانہ ہو گا کہ یہ جماعت اہل حدیث کا سب سے اہم کارنامہ تھا۔ اس کے بعد سید نذیر حسین محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی کی کوششوں کی بدولت کتاب وسنت کی تدریس و تالیف، نشر واشاعت اور دعوت و تبلیغ کی دھوم پورے ہندوستان میں مچ گئی، ان دونوں بزرگوں کی مساعی جمیلہ ہی کی وجہ سے آگے چل کر جمعیت اہل حدیث کی بناء پڑی۔

چونکہ فکری سطح پر حاملین اہل حدیث کی نمایندگی کرنے کے لیے کوئی پلیٹ فارم موجود نہیں تھا ہر کوئی انفرادی طور پر ملت کی دینی و دنیاوی رہنمائی کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا، نیز انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب سبھی مکتب فکر کے علماء نے اپنی اپنی جماعتیں اور پہچان بنالی تو اہل حدیث علماء نے بھی الگ جماعت کے قیام کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کے قیام کی جدوجہد شروع کی۔ ویسے تو اس تحریک کے اولین بانیوں میں عبد اللہ غازی پوری، عبد العزیز رحیم آبادی، محمد حسین پٹیالوی، محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا عبد السلام، حافظ عبد اللہ روپڑی، مولانا عبد الرحمان مبارکپوری، عبد التواب غزنوی اور قاضی محمد سلمان مبارکپوری وغیرہم کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں، لیکن جماعت اہل حدیث کو تنظیمی ڈھانچہ میں تبدیل کرنے کا اولین سہرا مولانا ثناء اللہ امرتسری کو جاتا ہے، جنھوں نے 5 اکتوبر 1906 میں اپنے موقر ہفت روزہ اخبار 'اہل حدیث' میں اس کے قیام پر زور دیتے ہوئے اس کو وقت کی اہم ضرورت بتایا چنانچہ ایک اعلان جاری کرتے ہوئے لکھا:

"اگر آپ حضرات اس تحریک کے موید ہیں تو بہت جلد اس کے متعلق اپنی آراء سے مطلع فرمائیں تاکہ آرہ کے جلسے میں جو شوال میں ہونے والا ہے جس میں علماء اہل حدیث کی خاصی جمعیت ہوتی ہے، یہ تجویز پیش ہو کر پاس ہو جائے اور مناسب قواعد وضوابط تیار ہو کر 'اہل حدیث کانفرنس' کی بنیاد رکھی جائے"۔

ہر شش جہات سے اس تحریک کی پر زور تائید ہوئی۔ چنانچہ مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) کے دسمبر 1906 کے سالانہ مذکرہ علمیہ کے اجتماع میں "آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس" کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس کانفرس کے پہلے صدر حافظ عبد اللہ غازی پوری، ناظم مولانا ثناء اللہ امرتسری اور خازن بیت المال علامہ شمس الحق ڈیانوی منتخب ہوئے۔ دریں اثناء 1947 میں تقسیم وطن کے نتیجہ میں اکابرین وکارپردازان کانفرنس کے پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے جماعت کی ساری بساط ہی الٹ گئی اور جماعتی شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ان حالات وظروف میں

مولانا عبدالوہاب آروی کی زیر قیادت کانفرنس دوبارہ متحرک ہوئی اور باضابطہ دعوتی سلسلہ جاری ہوگیا۔ بعد میں دستور جمعیت میں حذف واضافہ اور ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی۔ چنانچہ جنوری 1957 کو دہلی، بمقام پھاٹک حبش خان میں مجلس عاملہ کے ایک اہم اجلاس میں ''آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس'' کو ''مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند'' کے نام سے موسوم کر دیا گیا جو ہنوز اسی نام سے جاری ہے اور ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ موجودہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا صدر مقام دہلی ہے اس کے امیر مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی، ناظم عمومی مولانا محمد ہارون سنابلی اور ناظم مالیات وکیل پرویز ہیں۔

7.3 اغراض و مقاصد

دفعہ 5 مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد ہیں۔

(الف) دعوت و تبلیغ:

(1) مسلمانوں کو توحید خالص کو اپنانے پر آمادہ کرنے اور سنت کا شیدائی بنانے کے لیے تمام ممکنہ طریقے اختیار کرنا۔

(2) بدعات اور رسوم قبیحہ کو حکمت کے ساتھ مٹانے اور ان کی جگہ سنتوں کو رائج کرنے کی کوشش کرنا اور باطل تنظیموں اور تحریکوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اور ان کے دلائل و نظریات کی سنجیدگی، متانت اور علمی بنیادوں پر تردید کرنا۔

(3) غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کرنا جس سے ان کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔

(4) زندگی کے تمام شعبوں میں افراد جماعت اور ارکان جمعیت کی اس طرح تربیت کرنا کہ وہ اسلامی تعلیمات کا صحیح نمونہ اور مصداق ہوں۔

(5) مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھتے ہوئے باہمی اختلاف و نزاعات کو کتاب و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں دور کرنے کی جد وجہد کرنا اور اس کے لیے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے شرعی عدالتوں کا قیام۔

(6) مسلمانوں کو روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے دارالافتاء کا قیام۔

(ب) نشر و اشاعت:

(1) کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی کتب و رسائل کی تیاری اور ان کی ترویج و اشاعت۔

(2) کتاب و سنت اور مسلک و جماعت اہل حدیث کے خلاف لکھی جانے والی کتابوں اور تحریروں کا جائزہ اور اس کی تردید اور اس مقصد کے لیے افراد جماعت کی تربیت۔

(3) مسلمانوں میں رائج بدعات اور رسوم قبیحہ کی اصلاح و رد کے لیے عام فہم انداز میں صحیح دلائل کے ساتھ مختلف زبانوں میں رسائل و کتب تیار کرنا۔

(4)جمعیت کے اغراض ومقاصد کے تعارف اوراس کے نصب العین کی تکمیل کے لیے اخبارورسائل کی اشاعت اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال۔

(ج)تعلیم وتربیت:

(1)ہر سطح پر جماعتی مدارس کا قیام اور قائم شدہ مدارس کا تعاون اوران کی ترقی واصلاح کے لیے سعی کرنا۔

(2)مسلم طلبہ وطالبات کی تعلیم کے لیے ان کی راہنمائی اور بوقت ضرورت تعاون دینا۔

(3)جماعتی مدارس ومکاتب کے لیے اسلامی نظریہ تعلیم پر مبنی معیاری نصاب تیار کرنا، جو عصر حاضر کی تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

(4)افراد کی تربیت وتزکیہ کے لیے جماعت کے علماء کی خدمات حاصل کرنا۔

(5)ہر مسلم افراد کو خواندہ بنانے کی کوشش کرنااور دین کو علیٰ وجہ البصیرۃ سمجھنے پر زور دینا۔

(6)عصری مدارس وجامعات میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کے لیے اسلامی تعلیمات سے روشناس اوراسلامی احکام سے واقف کرانے کے لیے اقامت گاہوں اوراداروں کا قیام۔

(د)بیت المال اور شعبہ امداد باہمی کا قیام:

(1)جماعت کے افراد سے زکاۃ وعشر اور دیگر صدقات وعطیات کی وصولی اوراس کے مصارف پر ان کے استعمال کی کوشش کرنا۔

(2)غریب ومستحق افراد کی اعانت وامداد۔

(3)آمدنی کے وسائل کو بڑھانے اوران کو ترقی دینے کے لیے مختلف پروجیکٹ میں رقم لگانا۔

7.4 مرکزی جمعیت اہل حدیث کا منہج اور تنظیم وتشکیل

یہ جماعت اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اپنا ایک مخصوص لائحہ عمل رکھتی ہے اور اس سے انحراف کو جائزودرست نہیں سمجھتی۔ توحید خالص اورکتاب وسنت کے احکام کے سلسلے میں اس کا موقف بہت سخت ہے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دستوراساسی کے دفعہ 6 کے تحت جمعیت کا پالیسی یاطریقہ کار یہ ہے۔

1. جمعیت ہر فیصلہ طلب مسئلہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے گی اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے طرز عمل کو پیش نظر رکھے گی۔ وقتی مسائل اورامت سے متعلق مصالح کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھے گی۔
2. ملکی وملی مسائل میں اپنے اعتصام بالکتاب والسنہ کے امتیاز کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی، پالیسی اور طریقہ کار متعین کرنے کے ساتھ معاصر مسلم تنظیموں کے ساتھ تعاون کرے گی۔
3. مرکزی جمعیت اپنے مقصد اور نصب العین میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جو بھی ذرائع وتدابیر اختیار کرے گی وہ کتاب وسنت

کی واضح ہدایت کے ماتحت ہونگے۔

اس کے علاوہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی ہے جس کے مختلف مدارج ہیں۔ ان میں سے ایک مرحلہ رکنیت کا بھی ہے۔ اس کی رکنیت کے لیے شرط یہ ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی شہری جو عاقل بالغ اور مسلمان ہو اور جمعیت اہل حدیث کے عقیدے اور نصب العین سے اتفاق رکھتا ہو اس کا رکن بن سکتا ہے۔ رکن بننے کے بعد اس پر کئی طرح کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جس پر عمل درآمد اس کے لیے ضروری ہے۔ تنظیمی امور کو چلانے کے لیے اس جماعت کے افراد نے شورائی نظام کو اخذ کیا ہے باہمی مشورے سے تمام امور انجام دئے جاتے ہیں۔ مرکزی جمعیت کا تنظیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے۔

1. مقامی (دیہات وقصبات کی) جمعیتیں
2. شہری جمعیتیں
3. ضلعی جمعیتیں
4. صوبائی جمعیتیں
5. مرکزی جمعیت

اس کے علاوہ جماعت غرباء، جمعیت شبان، طلبہ اور خواتین کی ذیلی یونٹیں ہیں جس سے جمعیت کے اغراض ومقاصد کی تکمیل میں سہولت ہوتی ہے۔ یہ تمام ذیلی جمعیتیں مرکزی امیر اور ناظمی عمومی کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

7.5 مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی صوبائی شاخیں

جمعیت وجماعت کی حسن تشکیل اور اس کے عروج وزوال کا انحصار افراد پر ہوتا ہے، افراد جیسے ہونگے جمعیت وجماعت کی کارکردگی اور فعالیت بھی ویسے ہی ہوگی۔ حسن اتفاق سے جمعیت کو ایسے فعال وحساس اور سرگرم افراد کی قیادت نصیب رہی ہے جس سے کہ سلفی دعوت ہندوستان کے کونے کونے میں گونجنے لگی۔ کیا مشرق کیا مغرب کیا شمال کیا جنوب حتیٰ کہ جزائر انڈمان ونکوبار بھی کتاب وسنت کے نور سے جگمگا اٹھا۔ ہندوستان کے تقریبا تمام صوبوں میں جمعیت اہل حدیث کی ایک مستقل آفس اور ضلعی، شہری، مقامی، اور دیہی جمعیتیں ہیں، جمعیت اہل حدیث کی ریاستی سطح پر اکیس سے زائد شاخیں، ضلعی سطح پر دوسو اور مقامی اور دیہی سطح پر چالس ہزار سے زائد شاخیں ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔ تین کروڑ سے زائد افراد جماعت سے وابستہ اور منسلک ہیں اور دامے، درمے، قدمے سخنے کتاب وسنت کی ترویج وتبلیغ میں ساتھ ہی ملکی سطح پر ترقیاتی اور رفاہی کاموں میں مصروف عمل ہیں۔

7.6 مرکزی جمعیت اہل حدیث کے شعبہ جات اور اس کے امتیازات

رفقاء جمعیت اہل حدیث نے ابتداء ہی سے جمعیت کے مختلف کاموں کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رکھا ہے تاکہ اس کے انتظام وانصرام اور دیکھ ریکھ میں آسانی ہو۔ آزادی ہند کے بعد ان شعبوں نے مزید ترقی کی ہے۔ وہ شعبے یہ ہیں۔

7.6.1 شعبہ تنظیم

یہ شعبہ مرکزی جمعیت کا بہت ہی اہم شعبہ ہے، افراد جماعت کو جمعیت سے جوڑنے اوران کی کوششوں کو سمت دینے میں اس کا کلیدی کردار ہے اس شعبے کی فعالیت کا ہی نتیجہ ہے کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہندوستان کی سب سے منظم مسلم آرگنائزیشن بن گئی ہے اوراس پوزیشن میں ہوگئی ہے کہ ایک ہفتہ کی نوٹس پر بھی ہر صوبے سے افراد جماعت کو اکٹھا کر سکتی ہے، نیز اس شعبے کے تحت مختلف مقامات پر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے دعاۃ ومبلغین ارسال کر سکتی ہے۔

7.6.2 شعبہ دعوت وتبلیغ

یہ شعبہ مرکزی جمعیت کا اہم ترین اور غیر معمولی شعبہ ہے۔ اس شعبے کو ترجیحی طور پر فعال وسرگرم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ممکن وسائل کے ذریعہ معاشرے میں اسلامی بیداری اوراصلاح وتربیت کے عمل کو جاری کیا گیاہے۔ دعوتی کاموں کی وسعت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا دائرہ ہندوستان کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب سے لے کر جزائر انڈمان تک پہنچ چکا ہے۔

7.6.3 شعبہ تعلیم وتربیت

مرکزی جمعیت اہل حدیث نے تعلیم وتربیت کے فروغ کے لیے کثیر جہاتی پروگرام بناکر کاروان تعلیم وتربیت کو منظم طور پر آگے بڑھانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ نصاب تعلیم کی تیاری اور طباعت، مسابقات حفظ وتجوید وتفسیر قرآن کریم، دورات تدریبیہ برائے ائمہ، دعاۃ معلمین اور سیمینار، تعلیمی کانفرنسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں ذمہ داران جمعیت کی شرکت، عصری ودینی جامعات میں داخلے کی کوششیں اوراسکالرشپ، عصری یونیورسٹیوں کے مسلم طلبہ سے خصوصی ملاقاتیں۔ یہ سارے اہم نشاطات شعبہ تعلیم وتربیت کے تحت ہی انجام پاتے ہیں۔

شعبہ تعلیم وتربیت کے حوالے سے المعھد العالی للتخصص فی دراسات الاسلامیہ کا قیام مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ایک جراتمندانہ قدم ہے۔ اس میں دعاۃ، مدرسین اورافتاء وقضاء سے متعلق افراد تیار کئے جاتے ہیں۔ طلبہ کی ہمہ جہت ذہنی وفکری اور علمی ارتقاء کے لیے روایتی وجدید اسلوب ووسائل اختیار کیے جاتے ہیں، انھیں درسیات کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ المعھد العالی کے طلبہ اورافراد جماعت کی علمی ضرورتوں کے پیش نظر اہل حدیث کمپلکس میں شیخ الکل سید نزیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے منسوب ایک لائبریری قائم کی گئی۔ فی الوقت اس لائبریری میں عربی، اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ زبانوں کی پانچ ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں۔

7.6.4 شعبہ نشرواشاعت

اس شعبہ کے تحت متعدد دینی، دعوتی، جماعتی، تعلیمی اور تربیتی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ شعبہ نشرواشاعت کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ شعبہ جہاں کتابوں اور فولڈرز کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے وہاں صحافت کے میدان میں بھی غیر معمولی

خدمات انجام دے رہا ہے۔ جریدہ ترجمان (اردو) اصلاح سماج (ہندی) دی سمپل ٹروتھ (انگریزی) اور مجلہ الاستقامہ (عربی) بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ اوران کے اعلیٰ معیاراور پیشکش کی وجہ سے انہیں بڑی تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ایک اشاعتی ادارہ مکتبہ ترجمان کے نام سے ہے جو افراد جماعت کی اہم ضروریات کی بھرپور تکمیل کرتا ہے۔

اسلامی کتب کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے گزشتہ کچھ سالوں میں جمعیت کی جانب سے کتابوں کی اشاعت میں زبردست اضافہ دیکھنے میں آیا اور ان میں سے کئی کتابیں ایسی ہیں جو حوالے کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ کئی اہم کتابوں کا اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ جن میں متحدہ ہندوستان کے علماء اسلام کا اولین متفقہ فیصلہ، سیرت مستقیم اور اختلاف امت، خلافت وملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت، رویت ہلال، تحریک ختم نبوت، تاریخ اہل حدیث اور اس کے علاوہ 650 صفحات پر مشتمل اہلحدیث کے مدارس کی ڈائرکٹری بھی شائع کی گئی ہے۔ یہ تاریخ کے طلبہ کے لئے مراجع ومصادر کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

7.6.5 شعبہ مالیات

یہ حقیقت ہے کہ کسی نظام کو چلانے کے لیے مالیہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ مضبوط نہیں ہے تو ہزار خلوص کے باوجود بہت سارے کام تشنہ رہیں گے۔ چنانچہ اس شعبے کو مضبوط ومنظم بنانے کی حتی الوسع سعی کی گئی ہے، آمد وخرچ کے حسابات کو بہتر سے بہتر شکل میں مرتب کیا گیا، مختلف منصوبوں کے لیے بجٹ بنائے گئے اوران کی فراہمی کے لیے تگ ودو ہوتی رہتی ہے۔ اس شعبہ کے تحت سابقہ وحالیہ ادوار کے حسابات سی اے کے ذریعہ آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔

7.6.6 شعبہ احصائیات

شعبہ احصائیات جس کا دائرہ احصائیات مدارس تک محدود تھا اب اس کا دائرہ مساجد اوراسلامی مراکز تک پہنچ گیا ہے اور یہ شعبہ نہایت منظم انداز میں سرگرم عمل ہے اس کے تحت مدارس اہل حدیث، مساجد اہل حدیث اور تراجم علمائے اہل حدیث کی تدوین کا کام پائے تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

7.6.7 شعبہ افتاء

شعبہ افتاء موقر علماء ومفتیان عظام کی ایک ٹیم سے عبارت ہے۔ لوگ دینی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے متعلق شریعت کا موقف جاننے کے لیے یہاں استفتاء ارسال کرتے ہیں، جن کا تشفی بخش جواب دیا جاتا ہے اب تک ہزاروں فتاوے صادر ہو چکے ہیں، استفتاء کے نظام کو منظم کرنے کی غرض سے اہل حدیث منزل میں بکس برائے استفتاء بھی لگایا گیا ہے۔

7.6.8 شعبہ تعمیرات

کاموں کے ہوڑ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا شعبہ تعمیرات بھی پیچھے نہیں رہا ہے اس شعبے کے تحت بہت سے تعمیراتی سرگرمیاں عمل میں آہیں مثلاً اہل حدیث منزل کی از سرنو تعمیر، اہل حدیث کمپلکس ابوالفضل انکلیو اور المعھد العالی کی تعمیر۔

7.6.9 شعبہ رفاہ عامہ و سماجی خدمات

اس شعبے کے تحت اب تک غیر معمولی سماجی ورفاہی خدمات انجام پا چکے ہیں۔ مثلا فسادات زدگان، غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے تعاون، تباہ کن بیماریوں میں مبتلا افراد کی مدد، سیلاب زدگان کے مابین راحت کاری اوراسپتال اورذیلی ڈسپنسریاں کا قیام، مختلف علاقوں میں ٹیوب ویل کی تنصیب اور مساجد کی تعمیر وغیرہ۔

7.7 قومی وملی خدمات

مرکزی جمعیت اہل حدیث نہ صرف یہ کہ افراد جماعت کی دینی ودنیوی فلاح وبہبود کے لیے سرگرم عمل رہتنی ہے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر قومی وملی خدمات کے لیے بھی پابند عہد ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ قومی وملی اورانسانی خدمات بھی انجام دیتی رہتی ہے مثلا: اہم موضوعات پر سمپوزیموں کا انعقاد، نزاعی مسائل کا تصفیہ، ملی تنظیموں کے پروگراموں میں شرکت، ملی مسائل کے سلسلے میں حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں اس کے علاوہ نظام بیت المال قائم کرکے مستحقین کی امداد کرنا اس جماعت کا امتیاز رہا ہے۔

مجلس تحقیقی علمی

افراد جماعت کو علمی، فکری اور تحقیقی غذا فراہم کرنے کی غرض سے قائم یہ شعبہ نہایت فعالیت کے ساتھ خدمات انجام دے رہاہے۔اس شعبہ سے متعدد اہم علمی ودعوتی کتابوں کی تالیف اور ترجموں کے کام انجام پا چکے ہیں۔

ھیئۃ کبارالعلماء

دعوت وارشاد اور بحث وتحقیق کے عمل کو منظم اور فعال بنانے اوراس کے لیے جماعت کے مقتدر علماء کی خدمات حاصل کرنے کی غرض سے ھیئۃ کبارالعلماء کا قیام عمل میں آیا۔ ملی، سیاسی، سماجی اورر تعلیمی مسائل میں منہج سلف کے مطابق رہنمائی، نئے پیچیدہ مسائل پر مباحث تیار کروانا، اسلامی فقہ پر انسائیکلوپیڈیا تیار کروانا، عالم اسلام کے کبار علماء کے فتاوے وفیصلے جن کا تعلق موجودہ دور کے مختلف مسائل سے ہے جیسے سیاسی، سماجی، طبی وغیرہ اور جو منہج سلف کے مطابق ہوں ان کا ترجمہ کروانا، اعلیٰ معیار کی ٹیم تیار کرنا جو فقہی مسائل پر درک رکھتی ہو اس کمیٹی کے اہم مقاصد ہیں۔

میڈیا سیل

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند نے دیگر میدانوں میں قابل قدر پیش قدمی کے ساتھ میڈیا کے میدان میں بھی غیر معمولی پیش رفت کی ہے۔ مرکز میں میڈیا سیل کے نام سے ایک علاحدہ شعبہ ہے جو اخبارات پر نگاہ رکھتاہے، اگر کوئی قابل اعتراض بات ہوتی ہے تو اس کا جواب دیتاہے اوراہم خبروں کی کٹنگ بھی محفوظ رکھتاہے۔ فی الحال اس شعبے میں ایک درجن اردو، انگریزی اور ہندی کے قومی اخبارات منگائے جاتے ہیں۔ دیگر جماعتی وغیر جماعتی رسائل وجرائد اس کے علاوہ ہیں۔ پریس کانفرنسوں کا انعقاد، پریس ریلیز کا اجراء، مراسلہ نگاری، صحافیوں سے انفرادی ملاقاتیں، ذرائع ابلاغ میں اثر ورسوخ قائم کرنا اس شعبے کے اہم کارنامے ہیں۔ اب تک جماعتی وملی موضوعات پر متعدد

پریس کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں آچکا ہے، اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کوششوں کی وجہ سے ذرائع ابلاغ جمعیت و جماعت کے خلاف کچھ شائع کرنے میں بہت حد تک گریز کرنے لگے ہیں۔

7.8 مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا نصاب تعلیم

موجودہ دور میں مسلمان والدین اپنے بچوں کے لیے سیکولر تعلیم اور اسلامی علوم کے درمیان ایک معقول توازن تلاش کرنے کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو سائنس اور سماجی علوم کی بہترین تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اسلامی عقیدے کی تعلیم دینے کے لیے کوشاں ہیں۔۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اسلامی ماحول میں تعلیم حاصل کریں۔ اس مقصد کے لیے جمعیت نے مدارس اور انگلش میڈیم اسکولوں کے لیے ایک نیا نصاب تیار کیا ہے جس میں پرائمری سے لے کر پانچویں جماعت تک تمام سیکولر مضامین شامل ہیں۔ اسے مرتب کرتے وقت مختلف صوبوں کے پرائیوٹ اسکولوں اوران۔ سی۔ آر۔ ٹی کے نصاب تعلیم کو خاص دھیان میں رکھا گیا ہے۔ اس نصاب تعلیم میں بچوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں 10 مضامین کو شامل نصاب کیا گیا ہے جس میں دینیات، جنرل سائنس، اردو، انگلش، ہندی، سوشل اسٹڈیز، ریاضی، جسمانی صحت کی تعلیم، ڈرائنگ اور عربی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیمی نصاب میں قرآن وسنت کی تعلیم کو مرکزیت حاصل ہے، کسی ایک فقہی مسلک کی تعلیم کے بجائے فقہ اسلامی اور فقہ مقارن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ابتدائی متوسطہ اور ثانوی درجات میں جدید علوم کی متوازن نمائندگی ہے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی انفرادیت

1. اس جماعت کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ خالص توحید کی دعوت دیتے ہیں۔
2. زندگی کے تمام معاملات میں قرآن وحدیث کی تعلیمات کو اپنا سرچشمہ ہدایت سمجھتے ہیں۔
3. ان کی دعوت ایک سلفی دعوت ہے اس لیے کہ یہ اسلام کی اس پاک وصاف اور سادہ۔
4. تعلیم کی دعوت دیتے ہیں جو سلف صالحین نے امت کے سامنے پیش کی اور جو ہر قسم کی بدعات اور رسوم سے پاک ومنزہ تھی۔
5. یہ مذاہب اربعہ کو برحق مانتے ہیں اور اس مذہب کو پسند کرتے ہیں جو دلائل کے اعتبار سے سب سے زیادہ صحیح، قوی اور احوط ہو۔ یہ تقلید کے خلاف اور اجتہاد پر زور دیتے تھے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے سابق صدور / امراء 1947 سے لے کر اب تک آنے والے صدور / امیروں کے نام

1. حاجی محمد صالح (1944 - 1952)
2. مولانا عبدالوہاب اروی (1972-1972)
3. ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی (1972-1979)
4. مولانا عبدالوحید سلفی (1979-1989)

5. مولانا مختار احمد ندوی (1990-1997)
6. مولانا صفی الرحمن مبارکپوری (1998-2000)
7. حافظ محمد یحییٰ دہلوی (2000-2017)
8. مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی ((2017 سے تاحال)

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے سابق نظماء

1. مولانا ثناء اللہ امرتسری (1906-1947)
2. حافظ حمید اللہ دہلوی (1947-1950)
3. حافظ محمد صالح علیجان (1950-1956)
4. مولانا عبد الجلیل رحمانی (1956-1960)
5. مولانا داؤد راز (1960-1971)
6. مولانا عبد الحمید رحمانی (1971-1975)
7. مولانا عبد السلام رحمانی (1975-1978)
8. مولانا عطاء الرحمن مدنی (1978-1982)
9. مولانا انیس الرحمن اعظمی (1982-1985)
10. مولانا عبد الوہاب خلجی، قائم مقام سیکرٹری (1987-1990)
11. مولانا عبد الوہاب خلجی (1990-2001)
12. مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی (2001-2017)

1947 سے آل انڈیا اہلحدیث کانفرنسز

مرکزی جمعیت اہل حدیث اپنے قیام کے بعد سے اب تک 35 آل انڈیا اہل حدیث کانفرنسوں کا انعقاد کرا چکی ہے ۔ تاہم 1947 سے ملکی سطح پر 4 کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔

1. نوگڑہ (بستی) 19 نومبر 1961 مولانا عبد الوہاب اروی کی صدارت میں
2. بنگلور 5-6 مئی 1985 مولانا عبد الوحید سلفی کی صدارت میں
3. مئو 16 اپریل 1995 مولانا مختار احمد ندوی کی صدارت میں
4. پاکوڑ 13-15 مارچ 2004 حافظ محمد یحییٰ دہلوی کی صدارت میں

7.9 بیرون ملک میں سلفی جماعتوں کا مختصر تعارف

مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان

قیام پاکستان کے بعد اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اہل حدیث افراد کی کوئی نمائندہ جماعت ہو، تاکہ جماعت کے پلیٹ فارم سے کتاب وسنت کی ترویج کے لئے مشترکہ جدوجہد کی جاسکے۔ چنانچہ مولاناسید محمد داود غزنوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، پروفسر عبد القیوم اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی کوششوں سے 24 جولائی 1947 کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کی بلڈنگ میں تاسیس عمل میں آئی۔ تنظیم کا نام "مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان" رکھا گیا۔ ابتدائی طور پر تین عہدیداران کا تقرر عمل میں آیا، مولاناسید داوٗد غزنوی صدر، پروفسر عبد القیوم ناظم اعلیٰ اور میاں عبد المجید ناظم مالیات منتخب ہوئے۔

موجودہ مرکزی جمعیت کی قیادت مستند زعماء اور مستعد علماء کے ہاتھوں میں ہے۔ پروفسر ساجد میر امیر جب کہ ناظم اعلیٰ سینیٹر ڈاکٹر عبد الکریم ہیں۔ سیاسی طور پر یہ دائیں بازو کی جماعت ہے اور پاکستان مسلم لیگ کی حمایتی جماعت سمجھی جاتی ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی اہم رکن جماعت ہے جو ملک کے تمام صوبوں میں اپنا کم یا زیادہ وجود رکھتی ہے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث بنگلہ دیش

رسوم وبدعات اور پیر پرستی کی آماجگاہ بنگال میں شاہ اسماعیل شہید کا پیغام جہاد اور شمع توحید لے کر مولاناولایت علی اور مولاناعنایت علی پہنچے تو حاکم پور کو مرکز بنایا۔ کتاب وسنت کی تبلیغ کا اہتمام کیا۔ مساجد کی قلت تھی مساجد کی بنیاد ڈالی اور بیت المال قائم کیا جس سے سرحدی مجاہدین کی امداد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس دور میں اہل حدیث جماعت نے دس ہزار روپے صرف کر کے کلکتہ میں مطبع قائم کیا جس میں شاہ ولی اللہ کی تصانیف، شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن پاک، شاہ اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان، مولاناولایت علی کی عمل بالحدیث اور مولانا بدیع الزمان کی تقویۃ المسلمین جیسی کتابیں شائع کی گئیں۔

لیاقت پوری علماء کے بعد سید میاں نذیر محدث دہلوی کے شاگردوں نے پھر اس طرح چراغ سے چراغ جلایا کہ تحریک اہل حدیث عوامی شکل اختیار کر گئی۔

بنگال میں فکر محدثین کی ترویج میں مولانا عبد اللہ الکافی کی خدمات جلیلہ بھی کسی طور پر فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ وہ بہت بڑے بلند پایہ شخص اور محقق عالم دین تھے۔ انہوں نے 1924 میں "سیتاگری" کے نام سے اخبار جاری کیا۔ ان کی قیادت میں بنگال کے مختلف مقامات پر بہت سے جلسوں کا انعقاد ہوا۔ 1946 میں ہاراگیچ (رنگپور) میں ایک بڑی کانفرنس ہوئی، جس میں کل بنگال وآسام جمعیت اہل حدیث کا وجود عمل میں آیا۔ اس جمعیت نے مشرقی بنگال کے ستر لاکھ اہل حدیث افراد کو تنظیم میں منسلک کیا۔ جماعتی رابطہ اور مسلکی ترویج کے لئے ہفت روزہ "عرفات" اور ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا اجرا کیا۔ اس جمعیت نے جماعتی تنظیم اور مسلکی اشاعت کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں اور یہی جمعیت قیام پاکستان کے بعد جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان کے قالب میں ڈھل گئی۔ 1972 میں پاکستان

کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا تو اس تحریک کا نام جمعیت اہل حدیث بنگلہ دیش رکھا گیا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث نیپال

مرکزی جمعیت اہل حدیث نیپال کی تاسیس 1989 میں، جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر نیپال میں، خطیب الاسلام مولانا عبد الرؤف رحمانی کی کوششوں سے عمل میں آئی اور اتفاق رائے سے پہلے امیر جمعیت بھی منتخب ہوئے۔ آپ کی انتھک کوششوں سے جمعیت اہل حدیث نیپال ملک وبیرون ملک میں متعارف ہوئی اور دعوت و تبلیغ واصلاح عقیدہ کا کام منظم ڈھنگ سے انجام پانے لگا۔ آپ نے تقریبا دس سال تک مرکزی جمعیت اہل حدیث نیپال کے امیر کی حیثیت سے قیادت فرمائی۔

یوں تو جمعیت اہل حدیث نیپال ملک کے 75 اضلاع میں سے صرف 20 اضلاع میں اپنا باقاعدہ وجود رکھتی ہے، لیکن اس کے اثرات پورے ملک میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان 20 اضلاع میں صرف 13 اضلاع میں باقاعدہ ضلعی سطح پر انتخاب کرا کے ضلعی جمعیتوں کے نظام اپنے دعوتی، تبلیغی واصلاحی فریضے کی ادائیگی میں مصروف عمل ہیں۔

موجودہ عہدے داران: مولانا عبد الحی محمد حنیف مدنی امیر، مولانا محمد خالد مدنی نائب امیر، مولانا محمد علی سلفی نائب امیر، مولانا عزیر الرحمان تربت مدنی ناظم اعلیٰ، مولانا جمال احمد شاہ نائب ناظم، مولانا ولی اللہ رائی مدنی نائب ناظم، مولانا طفیل احمد مدنی خازن۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

برطانیہ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام 1975 میں عمل میں آیا۔ جمعیت کے بانی امیر مولانا فضل کریم عاصم نے جمعیت کے قیام کے لئے انتھک محنت کی۔ مختلف شہروں کا دورہ کرکے اہل حدیث اکائیوں کو اکٹھا کرکے ایک مربوط اور مضبوط تنظیم تشکیل دی۔ بعد ازاں مولانا محمود احمد میرپوری اس قافلہ میں آملے اور بطور ناظم اعلیٰ ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مولانا میرپوری مرحوم متدین عالم دین اور صاحب اسلوب اہل قلم تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے ذریعے مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کو منظم جماعت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ساتھ مولانا عبد الکریم ثاقب اور مولانا شعیب احمد و دیگر رفقاء کار کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔

مذکورین مرحومین اور موجود دین علماء دین متین نے برطانیہ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان دنوں مولانا محمد میرپوری امیر، مولانا محمد حفیظ اللہ خان نائب امیر، مولانا شعیب احمد میرپوری نائب امیر، حافظ حبیب الرحمان حبیب ناظم اعلیٰ، مولانا شفیق الرحمان شاہین نائب ناظم، بردر افتخار احمد خازن، بردر عجائب خان نائب خازن اور دیگر عہدیداران اپنے رفقائے کار کے ہمراہ برطانیہ میں مرکزی جمعیت کو منظم کرنے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔ جمعیت کا صدر مقام برمنگھم میں ہے جب کہ ملک بھر میں 40 شاخیں مصروف عمل ہیں۔

7.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام 1906 میں مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) میں ہوا۔
- جماعت اہل حدیث کو تنظیمی ڈھانچہ میں تبدیل کرنے کا اولین سہرا مولانا ثناء اللہ امرتسری کو جاتا ہے۔
- جماعت اہل حدیث کے اولین بانیوں میں عبداللہ غازی پوری، عبدالعزیز رحیم آبادی اور محمد حسین پٹیالوی وغیرھم کے اسماء قابل ذکر ہیں۔
- مرکزی جمعیت اہل حدیث ابتداء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے موسوم تھا
- 1957 میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے نام سے موسوم کیا گیا۔
- مرکزی جمعیت اہل حدیث کے پہلے امیر حافظ عبداللہ غازی پوری، ناظم عمومی مولانا ثناء اللہ امرتسری، اور خازن بیت المال علامہ شمس الحق ڈیالوی تھے۔
- مرکزی جمعیت اہل حدیث کے موجودہ امیر مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی، ناظم عمومی مولانا محمد ہارون سنابلی اور ناظم مالیات وکیل پرویز ہیں۔
- موجودہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا صدر مقام دہلی ہے۔
- مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دعوت خالصتا توحید کی دعوت ہے۔
- یہ ایک سلفی دعوت ہے۔
- مرکزی جمعیت اہل حدیث قرآن وحدیث کی تعلیمات کو اپنا سرچشمہ ہدایت سمجھتے ہیں۔
- یہ مذہب اربعہ کو برحق مانتے ہیں اور اس مذہب کو پسند کرتے ہیں جو دلائل کے اعتبار سے سب سے زیادہ قوی، احوط اور صحیح ہو۔
- یہ تقلید کے خلاف اور اجتہاد پر زور دیتے تھے۔

7.11 نمونہ امتحانی سوالات

7.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تاسیس کب عمل میں آئی۔

(a).1900 (b).1905 (c).1910 (d).1906

2. جماعت اہل حدیث کو تنظیمی ڈھانچہ میں تبدیل کرنے کا اولین سہرا کس کو جاتا ہے؟

(a).مولانا عبدالوہاب (b).مولانا ثناء اللہ امرتسری (c).محمد ابراہیم سیالکوٹی (d).عبداللہ غازی پوری

3. مرکزی جمعیت اہل حدیث ابتدا میں کس نام سے موسوم تھا۔

(a).جماعت الشبان (b).جماعت غرباء (c).جماعت الدعوہ (d).آل انڈیا حدیث کانفرنس

4. آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے نام سے کب موسوم کیا گیا؟

1950.(a) 1957.(b) 1955.(c) 1960.(d)

5. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے پہلے امیر کون تھے۔

(a).عبداللہ غازی پوری (b).علامہ شمس الحق ڈیالوی (c).مولانا ثناء اللہ امرتسری (d).مولانا ابراہیم سیالکوٹی

6. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے پہلے ناظم کون تھے۔

(a) .مولانا ثناء اللہ امرتسری (b).مولانا عبدالسلام (c).حافظ عبداللہ روپڑی (d).مولانا عبدالرحمان مبارک

7. مرکزی جمعیت اہل حدیث کا صدر مقام کہاں پر ہے؟

(a).بنارس (b).دہلی (c).ممبئ (d).حیدرآباد

8. ہفت روزہ اخبار 'اہل حدیث' کے ایڈیٹر کون تھے؟۔

(a) .اصغر علی امام مہدی (b) .مولانا عبدالسلام (c).مولانا ثناء اللہ امرتسری (d) .عبداللہ غازی پوری

9. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے موجودہ امیر کون ہیں؟

(a).عبداللہ غازی پوری (b).اصغر علی امام مہدی (c).مولانا ہارون سنابلی (d).حافظ عبداللہ روپڑی

10. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے موجودہ خازن بیت المال کون ہیں؟

(a).وکیل پرویز (b).اصغر علی امام مہدی (c).مولانا ہارون سنابلی (d).مولانا عبداللہ رحمانی

7.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالیں۔
2. مرکزی جمعیت اہل حدیث کا منہج اور تنظیم و تشکیل کو مختصراً ذکر کریں۔
3. مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے نصاب تعلیم کو قلم بند کریں۔
4. مرکزی جمعیت اہل حدیث کی انفرادیت پر روشنی ڈالیں۔
5. مرکزی جمعیت اہل حدیث کی رفاہی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

7.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے قیام و تاریخی پس منظر پر تفصیلی گفتگو کریں۔

2. مرکزی جمعیت اہل حدیث کے شعبہ جات اوراس کے امتیازات پر روشنی ڈالیں۔
3. بیرون ملک سلفی جماعتوں کا تعارف کرائیں۔

7.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	اہل حدیث منزل بہ منزل	:	پروفسر ڈاکٹر عبد الراشد
2.	برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت	:	مولانا محمد اسحاق بھٹی
3.	تحریک اہل حدیث کا تاریخی پس منظر	:	ممتاز احمد عبد اللطیف
4.	تحریک اہل حدیث تاریخ کے آئینہ میں	:	قاضی محمد اسلم سیف
5.	تاریخ اہل حدیث	:	حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی
6.	تحریک اہل حدیث خدمات وکارنامے	:	پروفسر عبد القیوم
7.	یادگار مجلہ اہل حدیث	:	ترتیب اصغر علی امام مہدی، خالد حنیف صدیقی
8.	اہل حدیث کا تعارف	:	ابو حماد عبد الغفار سلفی
9.	ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات	:	مولانا ابو یحیی خاں نوشہروی
10.	تاریخ اہل حدیث	:	ڈاکٹر محمد منیر زبیر الراعی السلفی

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 8: شیعہ کانفرنس اور مسلم پرسنل لاء بورڈ

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 آل انڈیا شیعہ کانفرنس

8.2.1 اغراض و مقاصد

8.2.2 خدمات و کارنامے

8.3 آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

8.3.1 اغراض و مقاصد

8.3.2 نمایاں کارنامے اور خدمات

8.4 کلیدی الفاظ

8.5 اکتسابی نتائج

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

مذہبی اور دینی انجمنوں یا سماجی تنظیموں کا قیام اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ متعلقہ مذہب اور سماج و معاشرے کے لوگوں نے اپنے سماج و معاشرے کی ترقی اور مضبوطی کے لیے ایک منظم قدم اٹھایا ہے جس کے ذریعہ اپنے سماج و معاشرے کے حالات کو متحد ہو کر

تنظیم اور کمیٹی کی صورت میں سدھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس باہمی اتحاد و اتفاق کا نتیجہ بھی بہت جلد کامیابی کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں وقت کی سماجی و سیاسی کروٹوں کو محسوس کرتے ہوئے عیسائیوں اور دیگر مذاہب نے انجمنوں اور تنظیموں کا قیام کر کے اپنے فرقے اور مذہب کو ترقی کی راہ میں ہمہ جہت منظم کرنے کی کوشش کی ہے وہیں سنی اور شیعہ مسلمان بھی اس معاملہ میں کسی سے کم نظر نہیں آتے اور انھوں نے بھی مذہبی، سماجی، اقتصادی اور علمی ترقی کی راہ کو مد نظر رکھتے ہوئے تنظیموں اور انجمنوں کا قیام کیا ہے اور اپنی قوم کو ہمہ جہت ترقی کی راہ میں منظم کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی منظم کمیٹی کے ذریعہ اپنے حقوق کی آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ انہیں متنظیموں میں ایک آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور دوسری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ہے جن کا دائرہ ہندوستان کے تمام علاقوں پر محیط رہا ہے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام کے بارے میں بتا سکیں گے ؟
- آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اغراض و مقاصد سے واقف ہو سکیں گے۔
- آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نمایاں کارنامے اور خدمات پر گفتگو کر سکیں۔
- آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی نمایاں کارکردگی اور خدمات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

8.2 آل انڈیا شیعہ کانفرنس

ہندوستان میں شیعوں کی سب سے بڑی اور تاثیر گذار تنظیم ”آل انڈیا شیعہ کانفرنس“ رہی ہے۔ یہ تنظیم ”انجمن صدرالصدور یا امامیہ کانفرنس“ نام سے سنہ 1901ء میں سید آقا حسن نقوی کی سرپرستی میں قائم ہوئی۔ اس کانفرنس کے نام کے بارے میں لوگوں کی متعدد رائے تھی بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کا نام امامیہ کانفرنس ہی رہے لیکن اکثر لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ ایسا نام رکھا جائے تا کہ اسماعیلی اور بوہرہ شیعہ بلکہ ہندوستان میں موجود تمام شیعی فرقہ بھی اس میں شامل ہو سکیں لہذا 1907ء میں اس کا نام بدل کر ”آل انڈیا شیعہ کانفرنس“ کر دیا گیا۔ اگرچہ 1901ء سے لے کر 1907ء تک کچھ باتوں کو لے کر علماء میں اختلاف نظر تھا یہاں تک کہ سید محمد حسین ابن سید بندہ حسین اور سید آقا حسن کو کانفرنس کی سماجی اور علمی کارکردگی اور اس کی ضرورت کے متعلق فتوا بھی دینا پڑا۔ بہر حال ماہ اکتوبر 1907 سے باقاعدہ طور پر اس کانفرنس کا آغاز ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے بلائے گئے تقریبا 450 علما و دانشمندان اور نواب و راجہ کے باہمی اتفاق و اتحاد سے ہوا اور اس کا پہلا جلسہ ”رفاہ عام“ لکھنو میں منعقد ہوا جس کے پہلے صدر سید آقا حسن نقوی قرار پائے۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ 1901 سے لے کر 1910 تک کانفرنس کی جانب سے یہ بھی جاننے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں شیعوں کی علمی، اقتصادی، سماجی حالات کیسے ہیں اور کس علاقہ میں کتنے شیعہ رہتے ہیں؟ لہذا اس کام کی انجام دہی کے لیے کانفرنس کی جانب سے مختلف علاقوں مثلا بارہ بنکی،

جونپور، غازیپور، کانپور، بنارس، رائے بریلی، حضرت پور، رسولپور، کنتور، جرول، سنڈیلہ، بلگرام میں نمائندے بھیجے گئے۔ ان نمائندوں کا کام شیعہ کے حالات سے متعلق رپورٹ تیار کرنا اور وہاں کے حالات کو سدھارنے کے لیے اسی علاقے میں ایک انجمن بنانا جو کانفرنس سے رابطہ میں رہ کر علاقے کے لیے فلاح و بہبود کا کام کرتی رہے اور انجمن کے موجود ہونے کی صورت میں اس انجمن کو کانفرنس سے جوڑنا اور ذمہ داری دینا تھا، جس کے نتیجہ میں کانفرنس کی کارکردگی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا چلا گیا اور بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے آخر تک انجمن جعفریہ بارہا، انجمن ناصر الایمان و انجمن سادات امروہہ، انجمن امامیہ مچھلی شہر، انجمن امامیہ سوسائٹی بریلی، انجمن ناصریہ بجنور، انجمن رفاہ الاسلام دادونپور، انجمن شیعہ بدایوں، انجمن امامیہ شاہ گنج آگرہ، انجمن مہدیہ غازیپور، انجمن سرائمیر اعظم گڑھ، شیعہ ینگ من ایسوسی ایشن ردولی، انجمن اصلاح اثناعشری میرٹھ، انجمن حسینیہ الہ آباد، انجمن کاظمیہ جرول، انجمن اثنا عشریہ ہردوئی، انجمن مرتضویہ امرتسر، انجمن محمدی مٹیابرج، انجمن حفاظت اوقاف بنگال، انجمن شیعۃ الصفا سونی پت، انجمن موئد شیعہ کانفرنس حیدرآباد وغیرہ سے رابطہ برقرار کیا گیا جس کے نتیجے میں 1910ء تک ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں سے 5000 رکن ہوگئے تھے جس میں ہر سال مزید اضافہ ہوتا رہا۔ اس کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہر سال کسی نہ کسی شہر میں منعقد ہوتا رہا جس کا سلسلہ تقریباً ستر سے اسی سال تک باقاعدگی سے جاری رہا اس کے بعد اس میں سستی رفتاری آگئی اور کہنے کو آج بھی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا دفتر موجود ہے لیکن اب پہلے والی بات نہیں رہ گئی ہے۔

8.2.1 اغراض و مقاصد

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے مندرجہ ذیل اہم اغراض و مقاصد تھے:

1. شیعہ قوم کو سماجی، اقتصادی اور علمی پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ میں مضبوط کرنا تھا۔
2. ہندوستان کے تمام شیعوں کے اخلاقی، تمدنی اور مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے امکانی جدوجہد کرنا اور ایسے تدابیر عمل میں لانا جو منافی شرع نہ ہوں۔
3. فرقہ شیعہ میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا اور دیگر فرق اسلامی اور اقوام معاصر سے مشترکہ ضروریات میں ہم آہنگ رہنا اور اتحاد عمل کی سعی کرنا۔
4. شیعوں کے تمدنی مذہبی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کی کوشش کرنا۔
5. شیعہ اوقاف کی اصلاح اور نگرانی کرنا۔
6. ملک کے متعدد مقامات پر سالانہ اجلاس منعقد کرنا اور ان اجلاسوں میں مقامی ضروریات کو بالخصوص پیش نظر رکھتے ہوئے مناسب اقدامات تجویز کرنا۔
7. کانفرنس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔
8. شروعات میں اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ صرف شیعہ قوم کی ہر میدان میں فلاح و بہبود ہی مد نظر تھی۔ لہذا ہر سال اس انجمن کا ایک جلسہ ہندوستان کے کسی شہر میں منعقد کیا جاتا تھا اور گزشتہ کارکردگی پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار

کیا جاتا تھا۔

8.2.2 خدمات و کارنامے

1. کانفرنس کے قیام کے فوراً بعد اس کا سب سے اہم قدم موقوفات کے متعلق تھا لہٰذا آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے شیعہ موقوفات کو منظم کرنے اور اسے ہر طرح کی بد نظمی سے تحفظ کے لیے "صیغہ وقف" نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے شیعہ موقوفات کی ایک لسٹ تیار کی اور ان شہروں اور قصبات میں موجود اپنے اراکین سے رابطہ کر کے شیعہ موقوفات کی ساری تفصیلات فراہم کرنے کی مہم چلائی اور اس کے لیے اپنے نمائندوں کو ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے رائے بریلی، بدایوں، بہرائچ، مرادآباد، نگینہ، علی گڑھ، آگرہ، بنگال، دہلی، پنجاب، سندھ، لاہور، کلکتہ، سہارنپور، بہار وغیرہ میں بھیجے گئے جن کی پہلی تاکید یہ تھی کہ موقوفات کو منظم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور کہیں پر موقوفات کو لے کر کسی طرح کا کوئی فساد اور گڑبڑی ہے تو اس کو دور کیا جائے اور اگر کوئی مداخلت کرے تو حکومت کا سہارا بھی لیا جائے یا اخبار میں متولیوں کی گڑبڑی کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ تمام افراد مل کر ایسے گڑبڑی کرنے والوں کا مقابلہ کریں۔ کانفرنس نے ان حسین آباد ٹرسٹ جیسے شخصی موقوفات پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ اس کا حساب و کتاب بھی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ اس کی درآمد سے شیعہ بچوں کے لیے اسکول اور یتیم خانہ اور مذہبی عمارتوں کی تعمیر کرائی جا سکے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود موقوفات کے حوالے کانفرنس کو بہت سی مشکلات سامنا کرنا پڑا۔
2. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی اہم خدمات میں ایک کارنامہ شیعہ یتیم خانہ کا قیام ہے۔ شیعہ یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے 1912ء کو لکھنو میں شیعہ یتیم خانے کی تاسیس عمل میں آئی اور ایک عالیشان عمارت تعمیر ہوئی جس میں دو سال کے اندر 200 یتیموں کی تربیت و پرورش کا باقاعدہ انتظام ہونے لگا اور کچھ عرصے بعد اس میں صنعت و حرفت اور سلائی و کڑھائی کے شعبے بھی اس غرض سے کھولے گئے تاکہ یتیم بچہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی زندگی بہتر طریقے سے گذار سکیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ یتیم خانہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اپنی اسی عالیشان عمارت میں آج تک برقرار ہے۔
3. یتیم خانہ کے ایک سال بعد یعنی 1913ء میں شیعہ بچوں کے رہنے کی سہولت کے لیے "شیعہ بورڈنگ ہاوس" کا قیام عمل میں آیا۔
4. شیعہ کانفرنس نے شیعہ بیوہ عورتوں کے لیے گھر اور مکان مہیا کرنے کی تجویز پیش کی تھی جسے 1916ء میں عمل میں لایا گیا۔
5. شیعہ غریب خانوادے اور طالب علموں کے لیے 1917ء میں "وظائف فنڈ (Wazifa Fund)" کا قیام عمل میں لایا گیا۔
6. شیعہ کانفرنس نے انگریزی طرز تعلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے شیعہ بچوں کی تعلیم کے لیے 1917ء میں "شیعہ کالج" کی تجویز پیش کی جس کا افتتاح 1919ء میں علما و نوابین کی موجودگی میں ڈالی گنج لکھنو میں کیا گیا۔ تاسیس سے لے کر 1925ء تک یہ کالج آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ماتحت کام کرتا رہا لیکن کچھ اختلافات کے سبب 1925ء کے بمبئی میں ہونے والے شیعہ کانفرنس کے اٹھارہویں میں یہ کانفرنس کے اہم اراکین کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ آج سے شیعہ کالج، کانفرنس کے ماتحت نہیں رہے گا۔

7. شیعہ کانفرنس نے شیعہ عقائد اور دینی و مذہبی باتوں کی اشاعت کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنا ایک پریس اور مجلہ ہونا چاہیے تاکہ بورڈ کی تمامتر سرگرمیوں کی اشاعت کے علاوہ شیعہ دینی و مذہبی اعتقادات کو منظر عام پر لایا جاسکے لہذا 1925ء کو سرفراز پریس کا قیام عمل میں آیا اور پھر "سرفراز" نامی ایک ہفتہ وار مجلہ کا بھی اجرا کیا گیا جو باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے متعدد شمارے کانفرنس سے متعلق بھی شائع ہوئے۔ یہ رسالہ اپنے آغاز سے لے کر بیسوی صدی کی ستر اور اسی (80) کی دہائیوں تک مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔

8. شیعہ مدارس کی امداد کے لیے اور شیعہ عوام کے روزگار کے لیے شیعہ کانفرنس کی طرف سے لکھنؤ میں شکر کی فیکٹری کھولی گئی تھی البتہ شکر فیکٹری کا یہ کام دیرپا نہیں رہا اور بہت جلد معطل ہوگئی۔

9. 1928ء میں جناب صفی لکھنوی کی یاد میں "دارالمطالعہ" کے نام سے ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کیا گیا جو بعد میں "قومی گھر پبلک لائبریری" کے نام سے مشہور ہوا۔

10. 1930ء میں شیعہ کانفرنس کی نظارت میں اتحاد بین المسلمین کے مقصد اور سیاسی کاموں کی انجام دہی کی غرض سے "آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا۔

11. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی مذکورہ کارکردگی کے علاوہ شیعہ ڈائرکٹری، شیعہ بینک، شیعہ مردم شماری، شیعہ یتیم خانہ برائے نسواں بھی کانفرنس کی دستورات میں شامل تھے مگر ان کاموں کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ جناب مولانا کلب عابد مرحوم کے بقول اگرچہ مدرسۃ الواعظین، انجمن وظیفہ سادات اور امامیہ مشن ایک مستقل ادارے ہیں لیکن یہ بھی اسی کانفرنس کی ہی شاخ تھے۔

8.3 آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مسلم پرسنل لا یعنی مسلمانوں کا شخصی قانون۔ اس سے مراد وہ ایک مکمل قانون شریعت جو قرآن و سنت، اجماع اور اجتہاد ائمہ سے ثابت ہو یا وہ مخصوص قانون جس کو انڈین شریعت ایکٹ 1937ء کی دفعہ 2 میں "مسلم پرسنل لا" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانان ہند کے لیے نہایت اہم ہے بلکہ اسی سے ان کا ملی اور مذہبی وجود اور بقا متعلق ہے۔ انہیں قوانین کے تحفظ کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا جو مسلمانان ہند کا سب سے زیادہ نمائندہ اور باوقار متحدہ پلیٹ فارم ہے۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے ختم ہونے کے بعد ابتداء ہی سے مسلمان علما و دانشوروں کی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کو پرسنل لا کے معاملہ میں قانون شریعت پر عمل کرنے کی آزادی حاصل رہے لہذا ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں علما کی جدوجہد سے "شریعت اپیلی کیشن ایکٹ 1937ء" بنا جس میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ پرسنل لا سے متعلق مسائل میں اگر مقدمہ کے دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان پر شرعی قوانین کا اطلاق کیا جائے گا پھر 1939ء میں علما کی کوششوں سے "انفساخ نکاح" سے متعلق قانون پاس ہوا جس میں فقہ مالکی سے استفادہ کرتے ہوئے پریشان حال خواتین کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

آزادی کے بعد ملک کے دستور میں اقلیتوں کے لیے مذہب پر عقیدہ رکھنے، مذہب پر عمل کرنے اور مذہب کی تبلیغ کرنے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے، مذہب پر عمل کرنے میں یقینی طور پر مسلم پرسنل لا شامل ہے چنانچہ معزز عدالتیں بھی اس کو تسلیم کرتی رہی ہیں لیکن دستور کے رہنما اصول میں جو ہدایات شامل کی گئیں ان میں یہ بات بھی تھی کہ بتدریج ملک میں "یکساں سول کوڈ" نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ حالانکہ دستور ساز کونسل کے بعض مسلم ممبران نے اس پر اعتراض بھی کیا مگر اسے قبول نہ کیا گیا اور اس وقت حالات ایسے نہیں تھے کہ اس کے خلاف کوئی تحریک چلائی جائے اس لیے یہ دفعہ ویسے ہی برقرار رہی پھر آخر کچھ عرصہ بعد محسوس ہونے لگا کہ حکومت کے تیور اچھے نہیں ہیں اور وہ مسلمانوں کو ان کے شرعی قوانین سے محروم کرنے کے درپے ہے۔ اس کا کچھ اندازہ تو اسی وقت ہو چکا تھا جب 1950ء ہندو کوڈ بل پیش کرتے ہوئے مرکزی وزیر قانون مسٹر یا ئسکر نے کہا تھا کہ ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائے گی پھر 1963ء میں مرکزی حکومت نے مسلم پرسنل لا میں "اصلاح" کے لیے مستقل کمیشن قائم کیا جس نے حکومت کے منفی رویہ کو اور واضح کر دیا اور اس کا کھل کر اظہار اس وقت ہوا جب 1972ء میں متبنیٰ کے لیے ایسا قانون لانے کی کوشش کی گئی کہ اسے حقیقی بیٹے کی حیثیت حاصل ہو اور مسلمانوں پر بھی اس کا اطلاق ہو۔

اس پس منظر میں مولانا سید منت اللہ رحمانی نے 28 جولائی 1963ء کو "انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ" میں بہار اسٹیٹ "مسلم پرسنل لا کانفرنس" طلب کی۔ امارت شرعیہ بہار اس کی داعی تھی۔ ملک کی دو بڑی تنظیموں یعنی جمعیۃ علمائے ہند اور جماعت اسلامی ہند کے اس وقت کے سربراہان مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کے علاوہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا عبد الرؤف اور جناب منظور احسن اعجازی نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ مولانا عثمانی نے صدارت کی اور مولانا ندوی نے افتتاح کیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کی یہ پہلی مشترکہ آواز تھی جو ملک کے ایک کونہ سے بلند ہوئی پھر مولانا سید منت اللہ رحمانی کی تحریک پر 13 و 14 مارچ 1972ء کو مولانا قاری محمد طیب نے دیوبند میں مسلم پرسنل لا کے موضوع پر ایک کل جماعتی اجلاس منعقد کیا۔ اجلاس کے شرکا میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ مفتی عتیق الرحمن عثمانی (صدر مسلم مجلس مشاورت) مولانا سید محمد اسعد مدنی (ناظم جمعیۃ علمائے ہند) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی (قاضی شریعت بہار و اڑیسہ و جھارکھنڈ) ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مولانا احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر طاہر محمود، مولانا عامر عثمانی وغیرہ شریک ہوئے۔ اس نشست میں طے ہوا کہ چونکہ مسلم پرسنل لا کی زیادہ تر آواز بمبئی سے اٹھ رہی ہے اس لیے یہیں اس موضوع پر ایک کنونشن منعقد کیا جائے۔ چنانچہ 27 و 28 دسمبر 1972ء کو یہ تاریخ ساز کنونشن منعقد ہوا جس کو مسلمانان ہند کے تمام مکاتب فکر کی بھرپور تائید حاصل تھی۔ اس اجلاس میں باتفاق رائے "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور سات اپریل 1973ء کو اجلاس حیدرآباد میں بورڈ کی باقاعدہ طور پر تشکیل عمل میں آئی۔

مولانا قاری محمد طیب بورڈ کے پہلے صدر اور مولانا سید منت اللہ رحمانی بورڈ کے پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ 17 جولائی 1983ء کو قاری محمد طیب کی وفات کے بعد 28 دسمبر 1983ء کو چنئی کے اجلاس میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو بورڈ کا دوسرا صدر منتخب کیا گیا اور ان کے انتقال کے بعد 23 اپریل 2000ء کو لکھنؤ کے ایک خصوصی اجلاس میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کو

بورڈ کا تیسرا صدر منتخب کیا گیا اور مولانا قاسمی کی وفات کے بعد 23 جون 2002ء کو حیدرآباد کے اجلاس میں موجودہ صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا بحیثیت صدر انتخاب عمل میں آیا۔ مختلف اوقات میں دیوبندی حلقہ سے حضرت مولانا ابوالسعود احمد، بریلوی مکتبہ فکر سے حضرت مولانا مفتی برہان الحق جبل پوری، حضرت مولانا مظفر حسین کچھوچھوی، حضرت مولانا محمد محمد الحسینی (سجادہ نشیں گلبرگہ شریف)، شیعہ مکتبہ فکر سے مولانا کلب عابد اور مولانا ڈاکٹر کلب صادق، اہل حدیث حلقہ سے حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی، حضرت مولانا مختار احمد ندوی، جماعت اسلامی سے حضرت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا محمد یوسف اور مولانا سراج الحسن بورڈ کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پہلے جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی (جن کا بورڈ کی تاسیس میں بنیادی حصہ رہا ہے) کی 19 مارچ 1991ء کو وفات ہوئی اور مئی 1991ء میں موجودہ جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید نظام الدین بورڈ کے دوسرے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ سابق میں جناب محمد یوسف پٹیل بورڈ کے سکریٹری رہ چکے ہیں اور اس وقت سکریٹریز کی حیثیت سے جناب محمد عبدالرحیم قریشی، جناب عبدالستار یوسف شیخ، حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ 1973ء سے 1983ء تک مصطفیٰ فقیہ پھر 1983ء سے 2004ء تک مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور) بورڈ کے خازن رہے اور 2005ء سے پروفیسر ریاض عمر (دہلی) سے یہ خدمت اب تک متعلق ہے۔

8.3.1 اغراض و مقاصد

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

1. ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے موثر تدابیر اختیار کرنا۔
2. بالواسطہ، بلاواسطہ یا متوازی قانون سازی جس سے قانون شریعت میں مداخلت ہوتی، عام ازیں کہ وہ قوانین پارلیمنٹ یا ریاستی مجالس قانون ساز میں وضع کیے جا چکے ہوں یا آئندہ وضع کئے جانے والے ہوں یا اس طرح کے عدالتی فیصلے جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ذریعہ بنتے ہوں انہیں ختم کرانے یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی جدوجہد کرنا۔
3. مسلمانوں کو عائلی و معاشرتی زندگی کے بارے میں شرعی احکام و آداب، حقوق و فرائض اور اختیارات و حدود سے واقف کرانا اور اس سلسلہ میں ضروری لٹریچر کی اشاعت کرنا۔
4. شریعت اسلامی کے عائلی قوانین کی اشاعت اور مسلمانوں پر ان کے نفاذ کے لیے ہمہ گیر خاکہ تیار کرنا۔
5. مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک کے لیے بوقت ضرورت "مجلس عمل" بنانا جس کے ذریعہ بورڈ کے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی خاطر پورے ملک میں جدوجہد منظم کی جاسکے۔
6. علما اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک مستقل کمیٹی کے ذریعہ مرکزی یا ریاستی حکومتوں یا دوسرے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ذریعہ نافذ کردہ قوانین اور گشتی احکام یا ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے والے مسودات قانون (بل) کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے رہنا۔

7. مسلمانوں کے تمام فقہی مسلکوں اور فرقوں کے مابین خیر سگالی، اخوت اور باہمی اشتراک وتعاون کے جذبات کی نشوونما کرنا۔
8. ہندوستان میں نافذ ''محمڈن لا'' کا شریعت اسلامی کی روشنی میں جائزہ لینا اور نئے مسائل کے پیش مسلمانوں کے مختلف فقہی مسالک کے تحقیقی مطالعہ اہتمام کرنا اور شریعت اسلامی کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے کتاب وسنت کی اساس پر ماہرین شریعت اور فقہ اسلامی کی رہنمائی میں پیش آمدہ مسائل کا مناسب حل تلاش کرنا۔
9. بورڈ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے وفود ترتیب دینا، اسٹڈی ٹیم تشکیل دینا، سیمینار، سمپوزیم، خطابات، اجتماعات، دوروں اور کانفرنسوں کا انتظام کرنا نیز ضروری لٹریچر کی اشاعت اور بوقت ضرورت اخبارات و رسائل اور خبر ناموں وغیرہ کا اجرا اور اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے دیگر ضروری امور انجام دینا۔
10. مسلم پرسنل لا بورڈ کا بحیثیت ادارۂ انتخابی سیاست سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

8.3.2 نمایاں کارنامے اور خدمات

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے چالیس سالہ عہد میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کو اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

1. 23 مئی 1972ء کو پارلیمنٹ میں ہندو قانون تبنیت ونفقہ 1965ء کی جگہ نئے قانون کا بل پیش کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے بشمول تمام شہریوں پر اس کا اطلاق ہو۔ بورڈ نے اس کے خلاف اول روز سے تحریک چلائی اور بالآخر 19 جولائی 1978ء کو جنتا پارٹی کی حکومت نے اس بل کو واپس لے لیا پھر کانگریس کی حکومت واپس آنے کے بعد 16 دسمبر 1980ء کو دوبارہ یہ بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا لیکن بورڈ کی کوشش سے مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔
2. جون 1975ء میں اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کر دی جس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ آنجہانی سنجے گاندھی نے جبری طور پر نس بندی کی مہم چلائی جس کا خاص نشانہ مسلمان تھے۔ اس وقت حکومت کے کسی فیصلہ کے خلاف زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی پھر بھی ایسے حالات میں 17 و 18 اپریل 1976ء کو بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں جبری نس بندی کے خلاف تجویز منظور کی گئی۔ پریس نے ان تجاویز کو شائع کرنے سے انکار کر دیا لیکن بورڈ نے ورقیہ شائع کر کے ملک کے کونے کونے تک اسے پہنچایا۔ نیز اسی ماحول میں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے نام سے رسالہ تالیف کیا جو اردو، ہندی اور انگریزی میں بڑی تعداد میں شائع کیا گیا اور اس کی تقسیم عمل میں آئی۔
3. اکتوبر 1978ء میں الہ آباد ہائیکورٹ کے لکھنؤ بینچ نے ایک ایسا فیصلہ دیا جس کے تحت لکھنؤ کی دو مسجدوں، ایک قبرستان اور جئے پور کی ایک مسجد کو وہاں کی میونسپل کارپوریشن نے ایکوائر کر لیا۔ بورڈ کی کوششوں سے یہ قبرستان اور مسجدیں مسلمان کو واپس کر دی گئیں۔
4. نیو سی، آر، پی، سی کی دفعہ 125 میں یہ بات کہی گئی ہے کہ طلاق کے بعد بھی جب تک مطلقہ کا دوسرا نکاح نہ ہو جائے، وہ نفقہ کی

حقدار رہے گی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے مطالبہ پر دفعہ 127 کا اضافہ کیا گیا جس کی رو سے طلاق دینے والا شوہر اگر واجبات ادا کردتے تو پھر نفقہ منسوخ ہو جائے گا۔ یہ ایک حد تک دفعہ 125 کے مضر اثرات کا ازالہ کرتی ہے مگر مختلف عدالتوں کے فیصلوں نے اس ترمیم کو بے اثر کر کے رکھ دیا۔ بالآخر بورڈ نے اس سلسلہ میں زبردست مہم چلائی اور 6 مئی 1986ء کو "قانون حقوق مسلم مطلقہ" پاس ہوا جو بورڈ کی ایک بڑی کامیابی تھی مگر افسوس کہ تعبیر کے نقائص کی وجہ سے یہ قانون سازی بھی بے فائدہ رہی جس کی اصلاح کے لیے جدوجہد جاری ہے۔

5. اپریل 1980ء میں ایک ایسا قانون بنا جس کے تحت ایسی تمام جائدادوں پر انکم ٹیکس عائد ہوتا تھا جن میں 1973ء کے بعد آمدنی میں اضافہ ہوا تھا سوائے اس کے کہ اس اضافہ شدہ جائداد کو فروخت کر کے اس کی رقم کسی نیشلائزڈ بینک میں فکس ڈپازٹ کر دی جائے۔ بورڈ نے اس کے خلاف سخت جدوجہد کی اور بالآخر اس میں کامیابی مل گئی۔

6. بورڈ عرصہ سے اس بات کے لیے کوشاں رہا ہے کہ قانون وقف کو ایسا بنایا جائے کہ وقف کا تحفظ آسان ہو سکے اور وہ با اختیار ادارہ ہو لیکن 1984ء میں حکومت نے اچانک ایسا بل پیش کر دیا جو اوقافی جائدادوں کے لیے نہایت نقصان دہ تھا۔ اس کے بعد وقف ایکٹ 1995ء بنایا گیا جس میں بورڈ کی کئی تجاویز شامل کی گئیں لیکن افسوس کہ وقف بل 2010ء بھی نہایت عجلت میں لوک سبھا سے پاس کرالیا گیا جس میں بہت ساری خامیاں ہیں اور بورڈ اس میں ترمیم کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔

7. 1986ء میں غلط طور پر بابری مسجد کا تالہ کھلوا دیا گیا اور 1948ء میں رکھے گئے بتوں کی عام پوجا شروع ہو گئی۔ اس مسئلہ کے لیے ایکشن کمیٹیاں قائم ہوئیں لیکن یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں بعض خدا ناترس افراد ہندو فرقہ پرست تنظیموں سے مسجد کا سودا نہ کر لیں لہٰذا حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے تین دسمبر 1990ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور عاملہ نے طے کر دیا کہ یہ جگہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہے۔ نہ اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے، نہ اس کی خرید و فروخت کی جاسکتی ہے، نہ کسی مصالحت کی بنیاد پر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالہ کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی حکومت اس سے انکار کر سکتی ہے۔ 6 دسمبر 1992ء کو مسجد شہید کر دی گئی اور اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبہ پر بورڈ نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ بورڈ اراضی بابری مسجد کی حقیت اور انہدام مسجد سے متعلق مقدمات کی پیروی کرتا رہا۔ 2019ء میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کو لے کر حتمی فیصلہ آجانے کے بعد بورڈ کی طرف سے یہ بیان جاری کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ بابری مسجد کی جگہ عرش تا فرش قیامت تک کے لیے مسجد کے حکم میں ہے اور بورڈ کا یہ بھی متفقہ فیصلہ ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو منظور ہو گا۔

8. حکومت دینی مدارس کے نظام میں دخیل ہونے کے لیے طویل عرصہ سے کوشاں ہے چنانچہ 2006ء میں اس نے "مرکزی مدرسہ بورڈ" کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ مدارس گورنمنٹ سے مربوط ہو جائیں۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ہمیشہ اس سے اختلاف کیا اور حکومت سے نمائندگی کی چنانچہ بالآخر حکومت سرکاری مدرسہ بورڈ کی تجویز سے دستبردار ہو گئی مگر موجودہ حکومت پھر اس کے

فراق میں ہے۔

9. بعض ریاستوں میں "وندے ماترم" اور "سوریہ نمسکار" نافذ کرنے کی بات کہی گئی تو بورڈ نے اس کی مخالفت کی جس کے بہتر اثرات مرتب ہوئے۔

10. بورڈ کے علمی کارناموں میں ایک "مجموعہ قوانین اسلامی" کی ترتیب و اشاعت ہے۔ شاہ بانو مقدمہ کے موقع پر ایک ایسے مجموعے کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی جس میں دفعہ وار اسلام کے عائلی قوانین ذکر کیے جائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنے خصوصی رہنمائی اور نگرانی میں اس کی ترتیب کا کام شروع کرایا اور چند علما و ماہرین قانون کے تعاون سے 1999ء میں اس کی ترتیب مکمل ہوئی پھر نظر ثانی وغیرہ کے بعد 19، اگست 2001ء کو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے اس کی رسم اجرا انجام دی۔ اس کے کئی اڈیشن بھی نکل چکے ہیں اور مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

11. حکومت کافی عرصہ پہلے نکاح کے لازمی رجسٹریشن کا قانون لانے کے لیے کوشاں تھی لہذا بورڈ نے کافی پہلے طے کیا تھا کہ وہ خود ایک "نکاح نامہ" مرتب کرے اور مسلمانوں میں اسے رواج دینے کی کوشش کی جائے چنانچہ نکاح نامہ مرتب ہوا اور اجلاس بھوپال 2005ء میں اسے منظوری دی گئی۔ نکاح کی تفصیلات کے اندراج کے علاوہ اس نکاح نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر زوجین اس پر دستخط کر دیں تو انہیں ازدواجی نزاعات حل کرنے کے لیے عدالتوں میں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور دارالقضا یا شرعی پنچایت کے ذریعہ ان کے اختلافات حل ہو جائیں گے۔

12. بورڈ کے ماتحت اب تک تقریبا دو درجن دارالقضا قائم ہو چکے ہیں جس کے لیے ایک مستقل کمیٹی بھی ہے۔ اس کمیٹی کے پہلے کنوینر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا عتیق احمد بستوی کنوینر رہے۔

13. بورڈ نے اصلاح معاشرہ کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کیا ہے جس کی جانب سے اصلاح معاشرہ کی غرض سے بہت سے رسائل شائع کیے گئے اور اجتماعات کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔

14. 2005ء میں "تفہیم شریعت" کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تا کہ لوگ قانون شریعت کی روح سے واقف ہو سکیں اور ان کی غلط فہمیاں دور ہوں لہذا مسلم و غیر مسلم قانون دانوں کو شریعت کے احکام اور ان احکام کی حکمتوں سے واقف کرانے کے لیے مذکورہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے تحت پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

15. بورڈ کی ایک اہم ترین کمیٹی "لیگل کمیٹی" ہے جو شریعت پر اثر انداز ہونے والے عدالتی فیصلوں اور پارلمینٹ سے پاس ہونے والے ایسے قوانین پر نظر رکھتی ہے جو مسلم پرسنل لا پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بورڈ جن مقدمات کی پیروی کر رہا ہے ان کے لیے شرعی اور قانونی امداد فراہم کرتی ہے۔ اس کمیٹی میں وکلا بھی ہین اور علما بھی ہیں۔

16. مسلم پرسنل لا سے متعلق مسائل زیادہ تر خواتین سے مربوط ہیں اس لیے مسلم خواتین کو باشعور بنانے اور شرعی احکام سے واقف کرانے کو بورڈ نے شروع سے خصوصی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اجلاس کانپور 1989ء میں بورڈ نے "مسلم خواتین سیل" قائم کرنے

کا فیصلہ کیا اور اس سال کو "سال خواتین" کی حیثیت سے منایا۔ مختلف شہروں میں اس سیل کے تحت خواتین کے اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

17. بورڈ رائے عامہ کو بیدار کرنے، لوگوں میں شعور پیدا کرنے اور مسلم پرسنل لا کی اہمیت اور افادیت سے واقف کرانے کے لیے اردو، انگریزی اور ہندوستان کی مختلف مقامی زبانوں میں لٹریچر کی اشاعت پر توجہ دیتا رہا ہے چنانچہ اب تک بورڈ سے بحیثیت مجموعی تین درجن کے قریب کتابیں اور رسائل شائع ہو چکے ہیں۔

18. بورڈ مسلمانوں کو اپنی کارکردگی سے مطلع رکھنے اور مسلمانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے 2005ء سے مسلسل پابندی کے ساتھ سہ ماہی خبر نامہ شائع کر رہا ہے جس میں بورڈ کی خدمات کے علاوہ مسلم پرسنل لا سے متعلق اہم مضامین شامل اشاعت ہوتے ہیں۔

19. بورڈ اپنی تحریک کو آگے بڑھانے اور اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ملک کے بڑے شہروں میں اجلاس عام بھی منعقد کرتا رہا ہے چنانچہ 21/ سے زیادہ اجلاس منعقد ہو چکے ہیں اور 90 سے زیادہ مجلس عاملہ کی مشاورتی نشستیں منعقد ہوئی ہیں۔

20. یہ تو مسلم پرسنل لا بورڈ کی ان خدمات کا مختصر تذکرہ ہے جو محدود اور متعین طور پر انجام پائی ہیں لیکن بورڈ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق اور مشترکہ ایجنڈہ کے لیے اشتراک و تعاون کا مزاج پیدا کیا ہے۔ ان کے اندر اپنی مذہبی شناخت اور تہذیبی تشخص کے جذبہ کو پروان چڑھایا ہے۔

8.4 کلیدی الفاظ

جدوجہد	کوشش کرنا
اوقاف	وقف کی جمع اوقاف ہے جس۔
انفساخ نکاح	نکاح کا ٹوٹ جانا
خیر سگالی	خیر خواہی اور بھلائی
تبنیت	منہ بولا بیٹے یا پالی ہوئی اولاد کا مسئلہ
نفقہ	خرچہ اٹھانا
دخیل	شامل و داخل کرنا
متوازی	برابر
وضع	بنانا
ورقیہ شائع کرنا	کچھ اوراق پر مشتمل مطالب کی اشاعت
باہمی اشتراک	سبھی کی شرکت کے ساتھ

8.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- ہندوستان میں برطانوی حکومت کے وقت دیگر فرقوں اور مذاہب کی طرح شیعہ فرقوں نے بھی اپنے مذہب کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا قیام کیا اور اسی طرح ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمانان ہند نے اپنی ہندوستانی قوانین کے مد نظر اسلامی احکامات اور قوانین پر آزادی کے ساتھ عمل کرنا اور لوگوں کو اس بات کی طرف آگاہ کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔
- آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اہم مقاصد یہ تھے کہ شیعہ فرقے کو تعلیم، روزگار، صنعت و حرفت غرض ہر شعبے میں ترقی کی راہ پر گامزن کرنا اور ساتھ ہی یتیموں اور بیواؤں اور غریبوں کی مختلف صورت میں امداد کرنا اور شیعوں سے متعلق آثار قدیمہ اور اوقاف کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا وغیرہ۔
- آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقاصد میں بنیادی طور پر دو باتیں شامل ہیں:

1۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس معاملہ میں اور باشعور رکھنا نیز پارلیمنٹ صوبائی مجلس ساز قانونی اور عدلیہ میں زیر بحث آنے والے ایسے تمام قوانین اور اس کی تشریح پر نگاہ رکھنا جس سے بالواسطہ یا براہ راست مسلم پرسنل لا متاثر ہوتا ہو نیز مثبت انداز میں محڈن لا کا جائزہ لینا اور مختلف دبستان فقہ سے استفادہ کرتے ہوئے مناسب حدود میں واقعی دشواریوں کو علما، ماہرین شریعت اور علوم اسلامیہ پر گہری بصیرت رکھنے والے اہل علم کے باہمی مشورہ سے حل کرنا۔

2۔ مسلمانوں کو عائلی و معاشرتی زندگی کے بارے میں شرعی احکام و آداب، حقوق و فرائض اور اختیارات سے واقف کرانا اور اس سلسلہ میں ضروری لٹریچر کی اشاعت کرنا، مسلمانوں کو مختلف مکاتب فکر اور فرقوں کے مابین خیر سگالی اور باہمی اشتراک و تعاون کے جذبہ کی نشو و نما اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کو پروان چڑھانا۔

- آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے شیعوں کے فلاح و بہبود اور ترقی کی راہ میں بہت سی خدمات انجام دی ہیں جن میں صیغہ وقف، یتیم خانہ، شیعہ بورڈنگ ہاؤس، وظائف فنڈ، شیعہ کالج، دارالمطالعہ وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ شیعہ متون کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے سرفراز پریس اور مجلہ سرفراز کا قیام عمل میں آیا۔
- آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے قیام کے بعد سے لے کر اب تک مسلمانان ہند کے لیے بہت سے کارہائے نمایاں خدمتیں انجام دی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ بورڈ کی کوششوں سے قانون تبنیت و نفقہ سے مستثنیٰ رکھا گیا اور ۱۹۷۶ء میں جبری نس بندی کے خلاف تجویز پیش کی گئی اور متعدد مقامات پر مساجد و قبرستان کے حوالے سے اہم کام انجام دیئے گئے۔ اس کے علاوہ قانون وقف، دینی مدارس میں حکومت کی دخل اندازی، بابری مسجد معاملہ، انفساخ نکاح، تین طلاق وغیرہ کے حوالے سے بورڈ

نے تاثیر گزار کارنامے انجام دیئے ہیں اور ساتھ ہی اصلاح معاشرہ کے لیے کمیٹیوں کا قیام اور ہندوستان کی مختلف جگہوں پر دارالقضا کا قیام بھی بورڈ کے توسط سے انجام پایا ہے۔

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا قیام کب عمل میں آیا؟

1901.(a) 1902.(b) 1906.(c) 1907.(d)

2. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام کب عمل میں آیا؟

1970.(a) 1971.(b) 1972.(c) 1973.(d)

3. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے پہلے صدر کون تھے؟

(a).سید آقا حسن نقوی (b).سید بندہ حسین (c).سید محمد حسین (d).سید حسن آقا

4. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پہلے صدر کا نام کیا تھا؟

(a).مولانا سید ابوالحسن ندوی (b).مولانا منت اللہ رحمانی (c).مولانا قاری محمد طیب (d).مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

5. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پہلا جلسہ کس جگہ ہوا تھا؟

(a).کانپور (b).لکھنؤ (c).دہلی (d).ممبئی

6. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا پہلا جلسہ کہاں ہوا تھا؟

(a).بہار (b).اتر پردیش (c).حیدرآباد (d).ممبئی

7. شیعہ یتیم خانہ کا قیام کس سنہ میں عمل میں آیا؟

1912.(a) 1913.(b) 1914.(c) 1915.(d)

8. کس بورڈ کے تحت ہندوستان میں تقریباً دو درجن دار القضا کا قیام عمل میں آچکا ہے؟

(a).آل انڈیا شیعہ کانفرنس (b).آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ (c).جماعت اسلامی ہند (d).دارالعلوم دیوبند

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا قیام کب اور کیسے ہوا؟ نوٹ لکھیے۔
2. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کیسے عمل میں آئی؟ نوٹ لکھیے۔

3. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ماتحت ہونے والے دو نمایاں کارناموں پر نوٹ لکھیے۔
4. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ماتحت ہونے والے دو نمایاں کارناموں پر نوٹ لکھیے۔
5. آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کے نمایاں مقاصد کیا تھے؟ نوٹ لکھیے۔

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نمایاں خدمات پر تبصرہ کیجیے۔
3. آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اغراض و مقاصد پر تبصرہ کیجیے۔

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. شیعہ کانفرنس کے واقعات : سید مصطفی حسین، مطبوعہ گلشن فیض پریس لکھنؤ، ۱۹۰۷ء
2. ہندوستان میں شیعوں کی مجمل تاریخ اور بنای شیعہ کانفرنس : ممتاز حسین جونپوری، نظامی پریس لکھنو ۱۹۳۶ء
3. دستورالعمل آل انڈیا شیعہ کانفرنس لکھنو : سید محمد رضا نقوی، مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء
4. شیعہ اور مسلم لیگ یا کانگریس : مرزا جعفر حسین
5. دستور اساسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
6. آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: خدمات اور سرگرمیاں
7. اخبار شیعہ اثنا عشری (دہلی)، ماہ اپریل و مئی و نومبر 1907ء و ماہ اکتوبر 1908ء و ماہ اکتوبر 1910ء۔
8. مجلہ سرفراز، (کانفرنس نمبر) دسمبر 1961 لکھنؤ (خصوصی شمارہ کانفرنس) جون 1964ء لکھنؤ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 9: تعلیمی ادارہ: دارالعلوم دیوبند

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 دارالعلوم دیوبند کا قیام اور اس کا پس منظر

9.3 دارالعلوم دیوبند کے اہداف و مقاصد اور اس کا دستور العمل

9.4 نصاب و نظام تعلیم

9.5 دارالعلوم دیوبند کی فکری مسلک و منہج

9.6 دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور سرگرمیاں

9.6.1 علوم اسلامیہ کی ترویج میں دارالعلوم دیوبند کا حصہ

9.6.2 قومی وسیاسی خدمات

9.6.3 ملی وسماجی خدمات

9.6.4 لسانی وادبی خدمات

9.6.5 نامور فضلائے دیوبند

9.7 دارالعلوم دیوبند کے منہج پر قائم اہم مدارس

9.8 قومی و بین الاقوامی سطح پر دارالعلوم دیوبند کے اثرات

9.9 اکتسابی نتائج

9.10 نمونہ امتحانی سوالات

9.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

9.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اس اکائی میں دارالعلوم دیوبند کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا پس منظر اور اس کے محرکات کیا تھے؟ خصوصا برصغیر ہند میں اسلامی علوم کی اشاعت و تدوین میں اس کی کیا خدمات ہیں؟ اس کا فکری منہج کیا ہے اور وہ کس طرح دوسروں سے مختلف ہے؟ اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس کے اثرات اور اس کے طرز پر چلنے والے اہم مدارس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اس لائق ہو سکیں گے کہ وہ ایک تعلیمی اور فکری ادارے کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور اس کے فکری منہج سے واقف ہو سکیں۔ اور یہ جان سکیں کہ برطانوی استعمار نے اسلامی ثقافت کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس ادارے نے کس طرح اس کی تلافی کی کوشش کی۔ ان کو اس کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کون سے اوصاف و خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے اداروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

9.2 دارالعلوم دیوبند کا قیام اور اس کا پس منظر

1857 میں سقوط دہلی کے بعد کا زمانہ برصغیر ہند میں اسلامی تاریخ کا سب سے حساس مرحلہ تھا۔ تعلیم کے تعلق سے مسلمانوں کو ایسا درمیانی اور معتدل موقف اپنانا تھا، جس کی بنیاد پر وہ جدید علوم کے قافلے میں شامل بھی ہو سکیں اور دوسری طرف وہ اپنے مذہب و ثقافت کو بھی محفوظ رکھ سکیں ۔ چناں چہ اس صورت حال کے مداوا کے لیے مسلم اہل علم و فکر کے دو طبقے وجود میں آئے۔ ایک کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنا تھا تاکہ مسلمان مغربی اقوام کے شانہ بشانہ تمدنی ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکیں جب کہ دوسرے طبقے کا مقصد اس خطے میں سرمایۂ دین کی حفاظت تھا۔ اس کی نظر میں فاتح مسلم قوم ایک اجنبی قوم کے ہاتھوں شکست کھا کر اپنا سیاسی اقتدار اور جاہ وجلال تو کھو ہی چکی تھی، لیکن اب اس کے دین کا ڈھانچہ بھی طوفان کی زد میں تھا۔ پہلے طبقے کی نمائندگی کرنے والے سرسید احمد خاں (1817-1898) اور ان کے رفقا تھے اور دوسرے طبقے کی نمائندگی کرنے والے علمائے دیوبند۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ 1875ء میں اور دار العلوم دیوبند 1866 میں وجود میں آیا۔ علی گڑھ تحریک کے قافلہ سالار سرسید احمد خاں مسلمانوں کے حقیقی بہی خواہ، ایک بڑا دماغ اور آہنی عزم رکھنے والے شخص تھے۔ وہ بلاشبہ مسلمانوں کو اس درمیانی راستے کی طرف رہنمائی کر رہے تھے جس پر چل کر وہ ماضی سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے حال سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرے طبقے کی نمائندگی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ علما نے کی۔

برطانوی حکومت 1857 کی بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ہی سمجھتی تھی۔ اس لیے ان کے ظلم و ستم کی اصل زد بھی انھی پر پڑی۔ قتل اور پھانسی کے علاوہ بہت سے اہم علما و اہل دانش کو قید کر کے جزیرۂ انڈومان بھیج دیا گیا۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے علم و دانش کی محفلیں آراستہ تھیں۔ ان کے بے دست و پا ہونے سے یہ محفلیں اجڑ کر رہ گئیں۔ اوقاف پہلے ہی ختم کیے جا چکے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورتحال اس صورتحال کے مشابہ تھی جو اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر تاتاریوں کے عالم اسلام کے قلب پر حملے اور تباہی سے پیدا ہوئی تھی۔ کم از کم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت وہی نقشہ تھا۔ اس قتل و خوں ریزی اور عوامی سطح پر مسلمانوں کی داروگیر کے علاوہ حساس اور دین کا درد رکھنے والے طبقات کے لیے سب سے روح فرسا امر عیسائی مبشرین کی ہندوستان میں نہایت جارحانہ انداز میں کی جانے والی تبلیغی کاوشیں تھیں۔ 1857 میں انگریزی حکومت کی فتح کو وہ عیسائیت کی فتح کی صورت میں دیکھ رہے تھے۔ دیوبند کے علما کی ایک جماعت 1857 کی بغاوت میں شاملی کے میدان میں انگریزی سپاہیوں سے روبرو ہو چکی تھی اور اسے اپنی شکست کے نتیجے میں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار بھی باقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ میدان کار کو تبدیل کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ احیائے دین کی سرگرمیوں میں مشغول ہو جائے۔ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی صورت حال کا اندازہ برطانوی حکومت کے مشہور اہلکار ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کے اعتراف سے کیا جا سکتا ہے کہ: "ہمارے طریق تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لیے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے"۔ (The Indian Mussalmans,p.252)

ان خارجی وجوہات کے علاوہ ایک اہم داخلی وجہ خود مسلمانوں کا دینی و اخلاقی زوال تھا، جو دور مغلیہ کے آخر سے روز افزوں اور ہمہ گیر ہوتا چلا گیا تھا۔ علما و مصلحین کی کمی تو کبھی نہیں رہی لیکن اخلاقی انحطاط نے جس شدید مرض کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کے لیے افراد کے بجائے پوری جماعت اور تحریک کی سطح پر کوششوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ دیوبند تحریک نے صرف دینی تعلیم کی اشاعت کو ہی اپنا مقصود نہیں بنایا بلکہ سماجی اصلاح بھی اس کے پیش نظر رہی۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مرتب سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

"چنانچہ اس وقت بنیادی طور پر اس نقطہ نظر کو اپنایا گیا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی و علمی درسگاہ کا قیام ضروری ہے۔ اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقائے خاص: مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا فضل الرحمن صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونا چاہئے"۔ ا (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج، 1 / ص، 169) دارالعلوم دیوبند کے قیام کے فیصلے کے بعد 30 مئی 1866 کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں نہایت سادہ انداز میں ایک استاذ اور ایک طالب علم سے ایک دینی مدرسے کا افتتاح عمل میں آگیا، جسے شروع میں "مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی" سے اور بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے موسوم کیا گیا۔ طلبہ میں اضافہ ہونے پر اسے شہر کی جامع مسجد میں منتقل کیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد مدرسے کی باضابطہ عمارت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ابتدا میں دار العلوم دیوبند میں ہندو بچے بھی پڑھتے تھے۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ہے: "دار العلوم میں ہندو بچوں کی تعلیم کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ جب برطانوی حکومت نے سرکاری ملازموں کے لیے سرکاری اسکولوں کی سند کو ضروری قرار دے دیا تو سرکاری ملازتوں کے خواہش مند مسلم بچوں کی طرح ہندو بچوں کی تعلیم کا رخ بھی سرکاری اسکولوں

کی طرف پھر گیا"۔(ایضا،ص،194)

9.3 دارالعلوم دیوبند کے اہداف و مقاصد اور اس کا دستور العمل

دار لعلوم کے اہداف و مقاصد میں سب سے اہم ایک ایسی نسل تشکیل دینا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعماری سازشوں اور منصوبہ بندیوں کو ناکام بنا سکے۔ 1834 میں لارڈ میکالے Lord Thomas Babington Macaulay وفات:1892) نے حکومت کے سامنے اپنی مشہور تعلیمی رپورٹ (Minute) پیش کی تھی جس میں اس نے ہندوستان میں برطانوی تعلیمی پالیسی کو ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

"ہمیں اس وقت بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ ایک ایسے طبقے کو وجود میں لائیں جو ہمارے اور کروڑوں پر مشتمل ہندوستانی آبادی جس پر ہماری حکم رانی ہے، کے درمیان ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکے۔ یہ ایسا طبقہ ہو جو اپنے خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے ذوق، آرا، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز (English) ہو۔ اس طبقے کو ہم یہ ذمہ داری سونپ سکتے ہیں کہ وہ ملک کی عمومی یا عوامی زبانوں کی تراش خراش کرے۔ ان زبانوں کو مغربی زبانوں کی اصطلاحات سے مالامال کرنے کی کوشش کرے۔ انہیں اس لائق بنائے کہ وہ ملک کی عظیم آبادی تک علم کو پہنچانے کا ذریعہ بن سکیں"۔ یہ بلاشبہ ایک بڑا چیلنج تھا۔ دیوبند کی تعلیمی تحریک دراصل اسی چیلنج کا جواب دینے کی کوشش تھی اور اس نے اس نے اپنے بنیادی مقاصد میں سر فہرست جگہ دی۔

بانی دار العلوم نے اس ادارے کو چلانے کے لیے چند بنیادی اصول مقرر کیے جنہیں "اصول ہشتگانہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت یا جاگیرداروں اور نوابوں سے مالی اعانت نہ لی جائے اور اس کے اخراجات کے حوالے سے محض عوامی چندوں پر انحصار کیا جائے۔ بانی دیوبند کا کہنا تھا کہ: "اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ ان شاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا"۔ چندوں میں بھی ایسے لوگوں کے چندے کو ترجیح دی جائے جن کا مقصد شہرت اور ناموری حاصل کرنا نہ ہو۔ ادارے کو باہمی مشورے (شوری) کی بنیاد پر چلایا جائے اور اپنی انفرادی رائے پر اصرار نہ کیا جائے ورنہ "مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا"۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند ص،153-154)

دارالعلوم کے قیام کے مقاصد خود اس کے بانیان و اسلاف کے پیش نظر کیا تھے؟ اس کی تفصیل خود دارالعلوم کے قدیم دستور اساسی میں موجود ہے وہ یہ ہے:

قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا۔ رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔☆ اعمال و اخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی

زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔ ☆اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔ ☆حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔ ☆علوم دینیہ کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند ج،1 ص،142)

دارالعلوم کے سابق مہتمم مولانا قاری طیب نے دارالعلوم کے مقاصد کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:

اول، مذہبیت: دارالعلوم مذہبی قوت کا سرچشمہ ہے اور اول سے آخر تک اسلام کے دستور و آئین کا پابند ہے... دوم: آزادی: جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دارالعلوم مکمل طور پر بیرونی غلامی کے خلاف ہے۔ اس کا نظام تعلیم و تربیت اس کا نظام مالیات اور اس کا نظام اجتماعی سر تاسر آزاد ہے... سوم: سادگی اور محنت پسندی: جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے علما اور فضلا جہاد زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کے عادی ہیں۔ چہارم: کردار (بلند اخلاق): جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے طلبہ اس کردار بلند کا نمونہ کامل ہیں جس کو انھوں نے اپنے اکابر سے پایا ہے۔ یہ کردار سر تاسر روحانی ہے۔ پنجم: علمی اور تعلیمی وابستگی: یہ وہ خصوصیت ہے جسے دارالعلوم کو دیکھنے والا اولین لمحات میں محسوس کر سکتا ہے۔ یہ نہ کہنے کی بات ہے اور نہ سننے سے متعلق ہے"۔(ایضا، ص،144)

9.4 نصاب و نظام تعلیم

ہندوستان میں سب سے زیادہ بڑی تعداد دیوبندی منہج پر چلنے والے مدارس کی ہے۔ شاید اس میں دیوبند کی اس خصوصیت کو دخل ہے کہ دور جدید میں برصغیر میں آزاد مدارس کے قیام کی تحریک اس کے ذریعہ شروع ہوئی۔ اس اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کو ام المدارس اور قیام مدارس کی تحریک کا قافلہ سالار ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام سے قبل ہندوستان کے تین مقامات کو علمی مرکزیت حاصل تھی: دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد۔ اگرچہ ان تینوں مراکز کے نصاب کی بنیادی قدر مشترک تھی، تاہم ان کی اپنی خصوصیات اور ترجیحات تھیں۔ دہلی میں تفسیر و حدیث توجہ کا مرکز تھی جس میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خانوادے کو دخل تھا، لکھنؤ میں فقہ و اصول فقہ کو اصل اہمیت حاصل تھی جبکہ خیر آباد کی علمی مجلسوں میں معقولات یعنی منطق و فلسفے کی گونج تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت ان مقامات کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی لیکن ان کی یہ خصوصیات حلقہائے علم کے درس میں موجود تھیں۔ دارالعلوم دیوبند نے درس نظامی کو اپنے نصاب کی بنیاد بنایا اور اسی کے ساتھ ان تینوں مقامات کی امتیازی خصوصیات کو اپنے نصاب میں سمونے کی کوشش کی۔ پھر دیوبند کے نصاب میں وقفے وقفے سے کچھ تبدیلیاں بھی کی جاتی رہیں، لیکن اصل ڈھانچہ اور بنیادی مشمولات یکساں رہے۔ چوں کہ انگریزی حکومت میں دینی تعلیم کا نظام تہ و بالا ہو چکا تھا، اس لیے بانی دارالعلوم کا خیال تھا کہ فی الحال صرف دینی علوم پر مشتمل نصاب کو نظام تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔ اس لیے کہ جدید علوم کی کفالت و انتظام کے لیے سرکاری مدارس کافی ہیں۔ جیسا کہ ان کے اس اقتباس سے ظاہر ہے:

"آج کل تعلیم علوم جدیدہ بوجہ کثرت مدارس سرکاری، ترقی پر ہے۔ ہاں علوم قدیمہ کا ایسا تنزل ہوا کہ کبھی نہ ہوا ہو گا۔ ایسے وقت

میں رعایا کا مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ واستعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے، ضروری سمجھا گیا"۔(تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد 1، ص:268)بظاہر بانی دار العلوم کے پیش نظر یہ منصوبہ نہیں تھا کہ ہمیشہ کے لیے عصری علوم کو ادارے کے نصاب سے خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالعموم تصور پایا جاتا ہے۔

دارالعلوم کا موجودہ نصاب چار طبقات: ابتدائی، متوسط، اعلیٰ اور تکمیل پر مشتمل ہے۔ ان میں تکمیل کے درجے کا نصاب لازمی نہیں ہے۔ تعلیم کی کل مدت آٹھ سال ہے جس کی تکمیل کے بعد فضیلت کی سند دی جاتی ہے۔ اس آٹھ سالہ نصاب میں تقریباً پندرہ علوم و فنون اور مضامین شامل ہیں۔ جن میں علوم تفسیر و حدیث اور فقہ کو خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

اس آٹھ سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد طالب علم کو فضیلت کی سند دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ، افتا، تفسیر، دینیات اور ادب کے تخصصات ہیں جن کا نصاب علاحدہ ہے۔ فضیلت کے آٹھ سالہ نصاب کے علاوہ ابتدائی درجات کا نصاب ہے جو عربی درجات کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتا ہے اور عربی درجات کی تعلیم شروع کرنے سے قبل اس کی تکمیل یا اس معیار کی صلاحیت طالب علم سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے لیے بنیادی نوشت و خواند کے علاوہ ناظرہ قرآن کی استعداد طلبہ کے اندر ہونی چاہئے۔ اس کے بعد اردو دینیات کے نام سے چار سالوں پر مشتمل نصاب ہے جس میں اردو زبان میں دینیات کے علاوہ حساب وغیرہ دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

دیوبندی مدارس کے نصاب کی اہم خصوصیت حدیث کی تعلیم و تدریس پر توجہ ہے جو حلقہ دیوبند کے مرجع فکر شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر سے ماخوذ ہے۔ شاہ صاحب کے والد شاہ عبد الرحیم کے مدرسہ رحیمیہ کی سب سے اہم خصوصیت یہی درس حدیث تھا۔ دارالعلوم میں پہلی مرتبہ صحاح ستہ کی تعلیم کو نصاب درس کا جز بنایا گیا۔ دارالعلوم کے فقہی مزاج و مذاق میں مولانا رشید احمد گنگوہی کی شخصیت اور ذوق کا دخل ہے۔ بعد میں جو دینی مدارس قائم ہوئے انھوں نے بالعموم دیوبند کی اس تعلق سے پیروی کی۔ دارالعلوم دیوبند میں بنیادی طور پر فن کے بجائے کتاب کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ ہندوپاک کے درس نظامی کے مدارس میں یہی طریقہ رائج ہے۔ ہندوستان میں دیوبندی مسلک کے اہم مدارس میں مظاہر علوم سہارن پور، مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات وغیرہ ہیں جن کا نصاب و نظام اور طریق تعلیم و تدریس بعض ضمنی اور معمولی تغیرات کے ساتھ عام طور پر یہی ہے۔ بڑی سطح پر اگر کوئی تبدیلی پائی جاتی ہے تو اس کی حیثیت استثنائی ہے۔

تاہم دار العلوم کے نصاب کے تعلق سے اہل دانش کے ایک طبقے کے خیال ہے کہ وہ صرف وقتی ضرورت کی تکمیل کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ لیکن دیوبند کے ذمہ داران اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پاکستان کے دور جدید کے اہم مفکر ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کی کوشش یا مہم ایک بدلی ہوئی صورت حال میں دفاعی اور وقتی کوشش تھی۔ وہ آئڈیل صورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آئڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دست یاب تھے اور نہ حکومتی سرپرستی دست یاب تھی۔ اور نہ وہاں کے فارغ شدہ افراد کے لیے قیادت کے مناصب موجود تھے۔ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے رہنمائی لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان کی رہنمائی مدرسے اور مسجد کے خاص

دائرے تک محدود تھی"۔(محمود احمد غازی "دینی مدارس اور عصر حاضر، مرتب شبیر احمد خاں، ص، 151)

9.5 دارالعلوم دیوبند کی فکری مسلک و منہج

دارالعلوم دیوبند ایک سنی حنفی ادارہ ہے۔ برصغیر ہند میں وہ شاہ ولی اللہ دہلوی کو اپنی فکری وابستگی کا مرجع اور مرکز تصور کرتا ہے۔ اور اسے ولی اللہ تحریک کی ہی توسیع تصور کیا جاتا ہے۔ قاری طیب صاحب، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم دیوبند کے فکری منہج کی توضیح جس طرح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: تمام مسائل میں اولین درجہ نقل وروایت اور آثار سلف کو حاصل ہے۔ کتاب و سنت کی تفہیم اسی حوالے سے کی جائے گی۔ البتہ نقل وروایت کے ساتھ عقل و درایت بھی کتاب و سنت کے فہم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اجتہاد میں حنفی اور کلام میں ماتریدی اصول واعتقادات کی پیروی کی جائے گی۔ اس طرح موصوف کے الفاظ میں علمائے دیوبند کا مسلک نہ تو عقل پرست معتزلہ کا مسلک ہے، جس میں عقل کو نقل پر حاکم اور متصرف مان کر عقل کو اصل اور وحی یا اس کے مفہوم کو عقل کے تابع کر دیا گیا ہے، جس سے دین فلسفہء محض بن کر رہ جاتا ہے اور نہ یہ مسلک ظاہریہ کا مسلک ہے جس میں الفاظ وحی پر جمود کر کے عقل و درایت کو معطل کر دیا گیا ہے۔(ایضا، ص، 435)

اکابر علمائے دیوبند کی وضاحت کے مطابق دارالعلوم دیوبند کا فکری منہج و مسلک اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ اس سے الگ ہٹ کر اس کا کوئی فکری منہج نہیں ہے۔ "دیوبندی" یا "قاسمی" ان کا صرف تعلیمی اور انتسابی لقب ہے نہ کہ مسلکی اور فرقہ واری (مولانا قاری محمد طیب: علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، ص، 100)

تاہم برصغیر ہند میں دارالعلوم دیوبند کی فکر و تحریک دیوبندی مسلک کی حیثیت سے معروف ہے۔ دیوبندی مسلک برصغیر ہند کے سیاق میں اس خطے کے دوسرے دو مسلکوں سے علیحدہ اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جن میں سے ایک اہل سنت (بریلوی) مسلک ہے اور دوسرا اہل حدیث مسلک۔ دیوبندی منہج فکر کے مقابلے میں دوسری جماعت اہل حدیث ہے جو کسی متعین امام کی شخصی تقلید میں یقین نہیں رکھتی اور دیوبند کی اسلامی فکر پر اس حوالے سے تنقید کرتی ہے کہ اس پر عجمی اور مقامی اثرات پائے جاتے ہیں جبکہ دیوبندی فکر شریعت کے ساتھ طریقت کی بھی قائل ہے۔ البتہ وہ طریقت کو شریعت سے علیحدہ کوئی چیز تصور نہیں کرتی، بلکہ شریعت کے عملی و اخلاقی اور باطنی پہلوؤں کو طریقت سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک حدیث نبوی میں اسی کو 'احسان' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دیوبندی منہج فکر کے دائرے میں مختلف حیثیتوں سے برصغیر ہند کے دوسرے ذیلی مکاتب فکر اور اسلامی فکر کے حلقے بھی آجاتے ہیں چنانچہ مثلا جماعت اسلامی اور فراہی مکتب فکر مذکورہ دونوں مکاتب فکر: بریلوی و اہل حدیث کے مقابلے میں خود کو دیوبندی مکتب فکر سے قریب تر تصور کرتے ہیں۔

9.6 دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور سرگرمیاں

9.6.1 علوم اسلامیہ کی ترویج میں دارالعلوم دیوبند کا حصہ

برصغیر ہند پر برطانوی استعماری غلبے کے نتیجے میں مسلمانوں کا سابقہ تعلیمی نظام جو مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں چل رہا تھا، ٹوٹ کر بکھر گیا۔ مدارس بند ہو گئے۔ علماء و فاضلین کی بہت بڑی تعداد اس خطے سے ہجرت کر گئی۔ لائبریریاں سونی ہو گئیں اور علمی حلقے اجڑ گئے۔ ایسے میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے مدارس کی تحریک شروع ہوئی اور بہت تیزی کے ساتھ اس خطے کے طول و عرض میں پھیلتی چلی گئی۔ انتہائی قلیل عرصے میں میرٹھ، سہارن پور، مراد آباد، تھانہ بھون اور گلاؤٹھی وغیرہ مقامات پر مدارس قائم ہوتے چلے گئے۔ اب کوئی ڈیڑھ سو سال کے دورانیے میں برصغیر کے تینوں ممالک: ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں دیوبند کے فکر و منہج سے وابستگی رکھنے والے ہزاروں مدارس پھیلے ہوئے ہیں جن کی تعداد میں اضافے کا سلسلہ جاری ہے۔

ان مدارس کے ذریعے اس خطے میں علوم اسلامیہ کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ علوم اسلامیہ کے فروغ و ترویج میں دارالعلوم کے نصاب کو بھی دخل ہے۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں شاہ ولی اللہ کی تحریک کی اتباع میں معقولات کے مقابلے میں منقولات کو خصوصی اہمیت دی گئی جس سے علوم اسلامیہ کے احیاء و ترویج میں مدد ملی۔ ہندوستان میں مسلم ادوار حکومت میں خاص طور پر حدیث کی تعلیم و تدریس پر زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی کوششوں سے اس نے مدارس کے نصاب میں خصوصی اہمیت حاصل کی۔ تدریس کے علاوہ فضلائے دیوبند نے تصنیف و تالیف کے ذریعے ان علوم کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام و تصوف اور ان کے متعلقات پر فضلائے دیوبند کی تحریر کردہ سینکڑوں کتب و رسائل سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

قرآنیات: بیان القران: مولانا اشرف علی تھانوی۔ معارف القران: مولانا مفتی محمد شفیع۔ مشکلات القران: مولانا انور شاہ کشمیری۔ تدوین قرآن: مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ہدایت القران: مولانا سعید احمد پالن پوری وغیرہ۔

حدیث: اعلاء السنن: مولانا ظفر احمد عثمانی۔ بذل المجہود شرح ابو داؤد: مولانا خلیل احمد سہارن پوری۔ التعلیق الصبیح شرح مشکاۃ المصابیح: مولانا ادریس کاندھلوی۔ انوار الباری شرح صحیح البخاری: مولانا احمد رضا بجنوری۔ فیض الباری علی صحیح البخاری: مولانا انور شاہ کشمیری۔ فتح الملہم: مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ۔

فقہ و فتاوی: امداد الفتاوی: مولانا اشرف علی تھانوی۔ کفایت المفتی: مولانا کفایت اللہ دہلوی۔ اسلامی عدالت: مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی۔ فصل الخطاب فی مسألۃ ام الکتاب و نیل الفرقدین فی مسالۃ رفع الیدین و کشف الستر عن صلاۃ الوتر: مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہ۔

تصوف: التکشف عن مہمات التصوف و تربیت السالک: مولانا اشرف علی تھانوی، شریعت و تصوف: مسیح اللہ خان وغیرہ۔

دیوبند کو خصوصی شہرت اس کے اشاعتی اداروں سے بھی ہوئی۔ دیوبند میں اس وقت کم و بیش سو اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ اس حیثیت سے دیوبند کو ہندوستان کا "بیروت" تصور کیا جاتا ہے۔ ان مکتبات اور اشاعتی اداروں کے مالکین و منتظمین کی اکثریت فضلائے دیوبند پر مشتمل ہے۔ یہاں سے کتابیں ہندوستان کے مدارس اور دینی حلقوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ دنیا کے متعدد ممالک میں جہاں ہندو پاک کے اردو داں طبقات پائے جاتے ہیں، وہاں بڑے پیمانے پر دیوبندی کتابوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ اس سے دیوبندی فکر کی اشاعت میں بھی مدد ملتی ہے۔

9.6.2 قومی وسیاسی خدمات

ہندوستان کی جنگ آزادی میں علمائے دیوبند پیش پیش تھے۔ چنانچہ 1857 میں شاملی، مظفر نگر یو پی میں علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے انگریزوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں حصہ لیا اور اور 1947 میں ملک کی آزادی تک اس کی تحریک میں شامل رہے۔ اس حوالے سے ملک کی مسلم تحریکات و تنظیمات میں سب سے زیادہ شہرت جمیعت علمائے ہند کو حاصل ہوئی، جو اصلا دیوبند کے ہی علماء وفاضلین پر مشتمل تھی اور وہ اب بھی قائم ہے، جس کا صدر دفتر دہلی میں ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند کے شاگرد عزیز مولانا محمود حسن دیوبندی نے جو "شیخ الہند" کے لقب سے معروف ہیں، تحریک ریشمی رومال شروع کی جس کا مقصد برطانوی استعمار کو ملک چھوڑنے پر مجبور کرنے کے لیے ملک سے باہر اس تعلق سے اپنی کوششوں کو مجتمع کرنا اور اس مقصد کے لیے غیر ملکی تائید وحمایت حاصل کرنا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ اس مخالفت میں جمیعت علمائے ہند کے پلیٹ فارم پر متحرک علماء پیش پیش تھے۔ انہوں نے پرزور طور پر متحدہ قومیت کی وکالت کی اور مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کو مسترد کر دیا۔

9.6.3 ملی وسماجی خدمات

دارالعلوم دیوبند نے ملی و سماجی خدمات کے حوالے سے بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے فضلا کی ایک بڑی تعداد اس حوالے سے ملک و بیرون ملک میں متحرک وفعال رہی ہے۔ اس نے مدارس و مکاتب کے علاوہ عصری تعلیم کی اشاعت کے لیے اسکول کھولے۔ ملک کے طول و عرض میں متعدد رفاہی ادارے قائم کیے جو ملی و سماجی خدمات میں مصروف ہیں۔ اس حوالے سے سب سے اہم کردار جمیعت علمائے ہند کا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور مختلف ارضی و سماوی آفات کے مواقع پر ریلیف اور باز آبادکاری میں وہ اہمیت کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ دیوبند کے فضلا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر تنظیمات کے پلیٹ فارم سے اصلاح معاشرہ کی تحریکات میں پیش پیش رہے ہیں۔ ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے رجحانات کے انسداد کے لیے بھی دارالعلوم اور اس کے فضلا نے اہم اقدامات کیے جن میں فروری 2008 میں منعقدہ کل ہند دہشت گردی کانفرنس بھی شامل ہے۔

9.6.4 لسانی وادبی خدمات

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا ایک پہلو زبان وادب سے تعلق رکھتا ہے۔ خاص طور پر عربی اور اردو میں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ

وفاضلین نے اہم کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مولانا اعزاز علی امروہوی نے "نفحۃ العرب" لکھی اور "دیوان حماسۃ" اور "دیوان متنبی" کے حواشی تحریر کیے۔ قاضی سجاد حسین نے "سبعہ معلقات" کی شرح "توشیحات" کے نام سے تحریر کی۔ عربی شاعری میں مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور انور شاہ کشمیری کو شہرت حاصل ہوئی۔ جبکہ اردو میں علامہ تاجور نجیب آبادی اور عامر عثمانی وغیرہ خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح "مثنوی مولانا روم" اور "دیوان حافظ" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں قاضی سجاد حسین نے کیا۔

لسانیات میں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی اور مولانا وحید الزماں کیرانوی کی خدمات نمایاں ہیں۔ اول الذکر نے عربی کی اہم لغت "مصباح اللغات" لکھی جبکہ ثانی الذکر نے متعدد عربی۔ اردو اور اردو۔ عربی لغات مرتب کیں، جن میں "القاموس الوحید" اور "القاموس الاصطلاحی" کو خصوصی شہرت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی تحریر کردہ "نفحۃ الادب" اور "القرأۃ الواضحۃ" متعدد مدارس اور یونیورسٹیز میں عربی زبان کے نصاب میں شامل ہیں۔

9.6.5 نامور فضلائے دیوبند

دار العلوم دیوبند کے مشاہیر علماء وفاضلین کی فہرست بہت طویل ہے جو دنیا کے متعدد ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ خصوصیت کے ساتھ ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں انہیں مرکزیت حاصل ہے اور ان میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ان مشاہیر فضلائے دیوبند میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

مولانا محمود حسن دیوبندی (م،1920): دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اور صدر مدرس۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ریشمی رومال تحریک کے بانی اور روح رواں۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری (م،1927): محدث وفقیہ اور فکر دیوبند کے شارح۔ مولانا انور شاہ کشمیری (م،1933): محدث وفقیہ اور متکلم، مختلف کتب حدیث کے شارح اور فقہ حنفی کے عظیم اسکالر اور محقق۔ مولانا اشرف علی تھانوی (م،1943): سینکڑوں کتابوں کے مصنف، مفسر وفقیہ۔ دارالعلوم دیوبند کی شناخت جن اکابر علماء سے ہوتی ہے، ان میں سر فہرست ہیں۔ مولانا الیاس کاندھلوی (م،1944): تبلیغی جماعت، انڈیا کے بانی۔ مولانا عبید اللہ سندھی (م،1944): سیاست دان، شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کے شارح۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری (م،1948): جماعت اہل حدیث کے بڑے عالم ومفسر اور اسکالر۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (م،1949): متعدد اہم کتابوں کے مصنف، جمعیت علمائے اسلام (پاکستان) کے بانی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی (م،1952): جمعیت علمائے ہند کے پہلے صدر۔ مولانا مناظر احسن گیلانی (م،1956): متعدد اہم کتابوں کے مصنف اور اسکالر۔ مولانا حسین احمد مدنی (م،1957): دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث اور جمعیت علمائے ہند کے سابق صدر۔ حفظ الرحمن سیوہاروی (م،1962): مصنف وسیاست داں۔ مولانا مفتی محمد شفیع (م،1976): مصنف، فقیہ اور مفسر اور دارالعلوم کراچی کے بانی۔ مولانا یوسف بنوری (م،1977): جامعہ بنوریہ، کراچی کے بانی، عربی کے اہم اسکالر اور ادیب۔ قاری محمد طیب (م،1983): دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم، متعدد اہم کتابوں کے مصنف اور فکر دارالعلوم کے شارح۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م،1985): مصنف واسکالر۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی (م، 1992): محدث ومحقق، حدیث کی متعدد گراں قدر تحقیقی کتابوں کے مرتب۔ مولانا سرفراز خان صفدر (م،2009): پاکستان میں حلقہ دیوبند کی اہم شخصیت،

درجنوں کتابوں کے مصنف۔ڈاکٹر محمد مصطفی الاعظمی(م،2017):حدیث کے اہم اسکالر،انگریزی، عربی اور اردو میں اہم تحقیقی کتابوں کے مصنف۔

9.7 دارالعلوم دیوبند کے منہج پر قائم اہم مدارس

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ہی اس کے طرز پر ہندو بیرون ہند میں مدارس قائم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہاں ہندو بیرون ہند کے چند اہم اور نمائندہ مدارس کے اسماء تاسیس کے ساتھ تحریر کیے جاتے ہیں:

ہندوستان کے مدارس: مظاہر علوم سہارنپور، یوپی(قیام، 1866) جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، یوپی (1879) جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈھابیل، گجرات(1928)مدرسہ امینیہ، دہلی(1897)مدرسہ عربیہ بیت العلوم، اعظم گڑھ(1930)جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم ،اکل کوا، مہاراشٹر (1979)جامعۃ الہدایہ، جے پور ،راجستھان(1986)دارالعلوم رحیمیہ، بانڈی پور، کشمیر (1979) مدرسہ کاشف الہدی، چینائی، تمل ناڈو(1977)

پاکستان کے مدارس: دارالعلوم، کراچی(1951) جامعہ خیر المدارس، ملتان،(1947)جامعۃ الرشید، کراچی، (1977) دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک(1948)جامعہ بنوریہ عالمیہ، کراچی(1979)

بنگلہ دیش کے مدارس: جامعہ معین الاسلام، ہاٹ ہزاری(1896)جامعہ مدنیہ، انگورا، سلہٹ(1958)جامعہ اسلامیہ پاتیا، چٹاگانگ،(1938)جامعہ رحمانیہ عربیہ، ڈھاکہ،(1986)جامعہ توکلیہ، سلہٹ(1919)

براعظم امریکہ ،افریقہ اور یورپ کے مدارس: دار العلوم المدنیہ، بفیلو، نیو یارک،(1986) معہد تعلیم الاسلام، شکاگو (1989)دار العلوم بولٹن، بولٹن، لنکاشائر(1993)دارالعلوم لندن(1988)، دار العلوم زکریا، جوہانس برگ، جنوبی افریقہ(1983)

9.8 قومی و بین الاقوامی سطح پر دارالعلوم دیوبند کے اثرات

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ساتھ مدارس کے قیام کی جو تحریک شروع ہوئی، اس کا دائرہ ابتدا سے ہی پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی مسلمان ہیں وہاں اس ادارے سے تعلیمی و فکری نسبت رکھنے والے افراد موجود ہیں۔ مدارس و مکاتب کا سلسلہ ملک کے سینکڑوں قریہ جات اور قصبات تک پھیلا ہوا ہے۔ فکر دیوبند سے تعلق رکھنے والی مساجد کے ائمہ کی زیادہ بڑی تعداد دیوبند یا اس کے منہج و مسلک پر قائم مدارس کے فارغین پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے علاوہ برصغیر ہند کے دونوں ممالک پاکستان و بنگلہ دیش میں بھی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی و فکری اثرات کا تناسب کم و بیش یکساں ہے۔

برصغیر ہند کے علاوہ افغانستان اور وسط ایشیا کے اکثر ممالک کی دینی و تعلیمی فضا پر دارالعلوم دیوبند کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد اس کے ابتدائی سالوں میں ہی وسط ایشیا کے دینی علوم کے حصول کے خواہشمند طلبہ دیوبند کا رخ کرنے لگے

تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے کئی نامور فضلا وسط ایشیائی ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے وہاں دیوبند کے فکری منہج پر مدارس و مکاتب قائم کیے اور دینی و اصلاحی تحریکات کی داغ بیل ڈالی۔ اس وقت ایشیا افریقہ امریکہ اور یورپ کے متعدد ممالک میں دیوبندی مدارس قائم ہیں۔

عالم عرب اور مغربی ممالک میں دارالعلوم دیوبند کے تعارف و تشہیر میں تبلیغی جماعت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک عالمی غیر حکومتی تنظیم کی حیثیت سے تبلیغی جماعت کے مراکز دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے زیر اثر تبلیغ اسلام کی دوسری تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہوئیں جن میں اہل سنت (بریلوی) جماعت سے انتساب رکھنے والی تحریک "دعوت اسلامی" خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ حالیہ سالوں تک یورپی اور افریقی ملکوں کے طلبہ اسلامی علوم کے حصول کے لیے دارالعلوم کا رخ کرتے رہے ہیں جن میں حنفی مکتب فکر کے علاوہ شافعی و مالکی مکاتب فکر کے طلبہ بھی شامل ہیں۔ ان طلبہ نے اپنے حلقوں میں دارالعلوم کو متعارف کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس طرح عالمی سطح پر دارالعلوم کا دائرہ اثر بڑھتا رہا۔

9.9 اکتسابی نتائج

- اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:
- انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ایک دینی مدرسے کا قیام دیوبند میں عمل میں لایا جائے۔ اس کے تحت 1866 میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بانیان میں اہم نام مولانا قاسم نانوتوی اور سید عابد حسین کا ہے۔
- اس ادارے کا مقصد ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کرنا تھا جس کے ذریعے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت ممکن ہو سکے جس کو ہندوستان کی استعماری حکومت سے شدید خطرات کا سامنا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے متوازی عصری اور پیشہ ورانہ تعلیم کو عام کرنے کے لیے 1875 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔
- دار لعلوم کے اہداف و مقاصد میں سب سے اہم ایک ایسی نسل تشکیل دینا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعماری سازشوں اور منصوبہ بندیوں کو ناکام بنا سکے۔ اس ادارے کو اصولی بنیادوں پر چلانے کے لیے مولانا قاسم نانوتوی نے آٹھ بنیادی اصول مرتب کیے جو "اصول ہشت گانہ" کے عنوان سے معروف ہیں۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اور بنیادی اصول یہ تھا کہ اسے صرف عوامی چندوں سے چلایا جائے اور اس کے لیے حکومتی امداد قبول نہ کی جائے۔
- دار العلوم دیوبند کے قیام نے مدارس کی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ہندوستان کے طول و عرض میں بڑی تعداد میں مدارس قائم ہو گئے۔ اس وقت برصغیر ہند کے علاوہ دنیا کے درجنوں ممالک میں دیوبندی فکر و منہج کے مدارس پھیلے ہوئے ہیں۔

- دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا بڑا حصہ درس نظامی پر مشتمل ہے۔ البتہ اس میں حدیث و فقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔
- دارالعلوم دیوبند اہل سنت والجماعت کا نمائندہ ادارہ ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کو اپنی فکری وابستگی کا مرجع اور مرکز تصور کرتا ہے اور خود کو ولی اللہی فکر کی ہی توسیع سمجھتا ہے۔
- علوم اسلامیہ کی ترویج میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے فضلا و وابستگان نے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ ملی و سماجی اور ادبی ولسانی خدمات میں بھی اس کے فضلا کے کارنامے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بر صغیر ہند کی متعدد اہم تحریکات اور ادارے کا قیام و آغاز اسی کے فضلا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔
- دیوبندی منہج پر شروع ہونے والی تحریکات اور اداروں میں تحریک ریشمی رومال، جمیعت علمائے ہند، تبلیغی جماعت، مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا وغیرہ شامل ہیں۔
- اس کے نامور فضلا میں مفکرین و دانشوران اور مصنفین و مصلحین کی ایک بڑی تعداد شامل ہیں جن میں مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسی شخصیات کا شمار ہوتا ہے۔
- عالمی سطح پر دارالعلوم دیوبند کے فکری اثرات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ متعدد ایشیائی ممالک کے علاوہ امریکہ، افریقہ اور یورپ کے متعدد ممالک میں دیوبندی مدارس پھیلے ہوئے ہیں۔ عالم عرب اور مغربی ممالک میں دارالعلوم دیوبند کے تعارف و تشہیر میں تبلیغی جماعت نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک عالمی غیر حکومتی تنظیم کی حیثیت سے تبلیغی جماعت کے مراکز دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے زیر اثر تبلیغ اسلام کی دوسری تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہوئیں۔
- دیوبند کو خصوصی شہرت اس کے اشاعتی اداروں سے بھی ہوئی۔ دیوبند میں اس وقت کم و بیش سو اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ اس حیثیت سے دیوبند کو ہندوستان کا "بیروت" تصور کیا جاتا ہے۔ ان مکتبات اور اشاعتی اداروں کے مالکین و منتظمین کی اکثریت فضلائے دیوبند پر مشتمل ہے۔ یہاں سے کتابیں ہندوستان کے مدارس اور دینی حلقوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

9.10 نمونہ امتحانی سوالات

9.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. دارالعلوم دیوبند کا قیام کب عمل میں آیا؟

1875.(a) 1857.(b) 1866.(c) 1869.(d)

2. The Indian Mussalmans کس کی تصنیف ہے؟

(a).ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (b).سید امیر علی (c).تھامس آرنلڈ (d).سر سید احمد خاں

3. دارالعلوم دیوبند کے بانی کون تھے؟

(a). مولانا رشید احمد گنگوہی (b).مولانا اشرف علی تھانوی (c).مولانا قاسم نانوتوی (d).مولانا امداد اللہ مہاجر مکی

4. دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں کس مضمون پر خصوصی توجہ دی گئی؟

(a).فقہ (b).علم کلام (c).حدیث (d).تفسیر

5. قیام کے وقت دارالعلوم کا نام کیا تھا؟

(a). مدرسہ عربی (b).دارالعلوم (c).مدرسہ عربی فارسی (d).مدرسہ عربی وفارسی وریاضی

6. "اصول ہشتگانہ" کس نے تحریر کیا؟

(a).مولانا اشرف علی تھانوی (b).مولانا خلیل احمد سہارن پوری (c).مولانا قاسم نانوتوی (d).مولانا محمود الحسن دیوبندی

7. دارالعلوم نے کس شخصیت کی فکر کو اپنا مرجع بنایا؟

(a).شاہ ولی اللہ دہلوی (b).شیخ احمد سرہندی (c).مولانا قاسم نانوتوی (d).مولانا اسماعیل دہلوی

8. تحریک ریشمی رومال کس نے شروع کی؟

(a).مولانا عبید اللہ سندھی (b).مولانا حسین احمد مدنی (c).مولانا حفظ الرحمن (d).مولانا محمود الحسن دیوبندی

9. عربی اردو لغت "مصباح اللغات" کا مصنف کون ہے؟

(a).مولانا وحید الزماں کیرانوی (b).مولانا اعزاز علی (c).مولانا نور عالم امینی (d).مولانا عبد الحفیظ بلیاوی

10. تبلیغی جماعت کے بانی کون ہیں؟

(a). مولانا شیخ محمد زکریا (b).مولانا شبیر احمد عثمانی (c).مولانا قاری محمد طیب (d).مولانا الیاس احمد کاندھلوی

9.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. دارالعلوم دیوبند کے قیام کا پس منظر تحریر کیجیے۔
2. دارالعلوم دیوبند کی قومی وسیاسی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. دارالعلوم دیوبند کی لسانی وادبی خدمات پر مختصر نوٹ قلم بند کیجیے۔
4. دارالعلوم دیوبند کا فکری منہج کیا ہے؟ تحریر کیجیے۔
5. دارالعلوم دیوبند کے نصاب ونظام پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیے۔

9.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اسلامی علوم کی ترویج واشاعت میں دار العلوم کی خدمات پر ایک تجزیاتی نوٹ تحریر کیجیے۔
2. قومی وبین الاقوامی سطح پر دار العلوم دیوبند کے اثرات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیجیے۔
3. دار العلوم کے مقاصد اور فکری منہج پر تفصیلی نوٹ تحریر کیجیے۔

9.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ دارالعلوم دیوبند (جلد اول ودوم) : سید محبوب رضوی
2. فیضان دار العلوم دیوبند : جاوید اشرف قاسمی
3. دارالعلوم کی جامع ومختصر تاریخ : (ترتیب) ڈاکٹر مولانا محمد اللہ قاسمی
4. دار العلوم دیوبند : رشید احمد جالندھری
5. علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج : مولانا قاری محمد طیب
6. دینی مدارس: عصری معنویت اور جدید تقاضے (ابراہیم موسی، ترجمہ : وارث مظہری)
7. Islamic Revival in British India:Deoband, 1860-1900: Barbara D. Metcalf

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 10: تعلیمی ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

10.3 سرسید احمد خاں

10.4 علی گڑھ تحریک

10.5 تحریک کے اسباب

10.6 تحریک کا مقصد

10.7 مدرسۃ العلوم / محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

10.8 یونیورسٹی کا درجہ

10.9 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: قیام کے مقاصد

10.10 عبداللہ گرلز کالج

10.11 اجمل خان طبیہ کالج

10.12 یونیورسٹی اسکول

10.13 شعبہ جات

10.14 مولانا آزاد لائبریری

10.15 جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

10.16 ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

10.17 اکتسابی نتائج

10.18 نمونہ امتحانی سوالات

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

10.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

اس اکائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے متعلق تفصیل سے کلام کیا گیا ہے کہ کیسے اور کن مشکل حالات میں بانی یونیورسٹی سرسید احمد خان نے اس بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ کے قیام کے بارے میں سوچا اور اس اہم کام کا آغاز کیا نیز 1857ء کے غدر کے بعد مسلمانان ہند کی حالت زار اور قیامت خیز حالات نے سرسید کو کس قدر نڈھال کر دیا تھا جس کے نتیجے میں سرسید نے علی گڑھ تحریک شروع کی تاکہ مسلمانوں کو جہالت اور پسماندگی سے نکالنے میں آسانی ہو۔ ساتھ ہی اس تعلیمی ادارہ کے شعبہ جات اسکول، کالج اور ان کے امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قیام کے اسباب، اس وقت کے حالات اور تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یونیورسٹی کے بانی سرسید کے حالات اور اس ادارہ کے قیام کے تئیں ان کی مشقت جدوجہد اور مسلمانوں کو تاریکی سے نکالنے، تعلیم کے زیور سے ان کو آراستہ کرنے و علم کی روشنی سے ان کو منور کرنے کے لئے سرسید کی لگن اور منصوبہ بندی پر کلام کرنا مقصود ہے۔ ساتھ ہی اس ادارہ کے قیام میں جس تحریک نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے اس کی قیام کا مقصد، اسباب اور اس کی بنیادی افکار کو بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اس کے شعبہ جات اسکول، گرلز کالج، طبیہ کالج، مولانا آزاد لائبریری اور جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کا مکمل تعارف پیش کرنا مقصود ہے تاکہ طلبہ اس بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ کی تاریخ اور اس کی خصوصیات سے پورے طور پر متعارف ہوں نیز سرسید وان کے رفقاء کے خوابوں کی تعبیر چمن سرسید اور اپنے اس ادارہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر سکیں۔

10.2 مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ اتر پردیش کے ایک مشہور ضلع علی گڑھ میں واقع ہے، علی گڑھ شہر جس کو لوگ پہلے کول کے نام سے بھی جانتے تھے دہلی سے ایک سو تیس کلو میٹر دور جنوبی مشرق اور لکھنؤ سے 324 کلو میٹر دور شمالی مغرب میں واقع ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے بڑے اور مرکزی حکومت کے زیر نگرانی چلنے والے تعلیمی اداروں میں ایک خاص، بین

الا قوامی شہرت یافتہ اور منفرد حیثیت کا حامل ایک مکمل رہائشی ادارہ ہے جو آغاز سے اب تک قوم اور ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتا چلا آرہا ہے جس کا قیام سر سید احمد خان کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں برٹش دور میں عمل میں آیا تھا اور تب سے اب تک اس ادارہ سے ملک کی ایک بڑی تعداد علمی تشنگی کو بجھا کر فیضیاب ہوتی آرہی ہے اور مختلف میدانوں اور علوم و فنون میں مہارت حاصل کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ اس ادارہ کی کوکھ سے ملک کے نامور سیاست داں، ادیب، مورخ، جغرافیہ دان اور سائنسدانوں نے جنم لیا ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر ادارہ کا نام روشن کیا ہے۔

10.3 سر سید احمد خاں

سر سید احمد خان کا شمار انیسویں صدی کے ان مصلحین و مفکرین میں ہوتا ہے جن کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، آپ ایک عظیم دانشور ایک روشن خیال اور دوراندیش ماہر تعلیم ایک شاندار ادیب ایک علمی و سماجی مصلح ایک ہمہ گیر و بلند خیال مصنف، جدید علم کلام کے بانی، ایک نڈر صحافی، سیکولرزم اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی، جدید ہندوستان کے ممتاز معمار، قومی رہنما اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔

سید احمد کی پیدائش 17 اکتوبر 1817 میں دلی کے سید گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد سید متقی محمد شہنشاہ اکبر ثانی کے مشیر تھے۔ دادا سید ہادی عالمگیر شاہی دربار میں اونچے منصب پر فائز تھے اور نانا جان خواجہ فرید الدین شہنشاہ اکبر ثانی کے دربار میں وزیر تھے۔ پورا خانوادہ مغلیہ دربار سے وابستہ تھا۔ ان کی والدہ عزیز النساء نہایت مہذب خاتون تھیں۔ سر سید کی ابتدائی زندگی پر ان کی تربیت کا بہت گہرا اثر ہے۔ دستور زمانے کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے وکالت سیکھی اور پھر اسی میدان میں محنت اور ایمانداری سے سرکاری خدمات انجام دیں۔ سر سید کو پہلی ملازمت آگرہ کی عدالت میں بطور نائب منشی ملی اور پھر اپنی محنت سے ترقی پاتے رہے۔ مین پوری اور فتح پور سیکری میں بھی خدمات انجام دیں۔ دلی میں صدر امین ہوئے۔ اس کے بعد بجنور میں اسی عہدے پر فائز رہے۔ مراد آباد میں صدر الصدور کی حیثیت سے تعیناتی ہوئی۔ یہاں سے غازی پور اور پھر بنارس میں مامور رہے۔ ان علاقوں میں حسن خدمات کی وجہ سے بہت مقبول رہے۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے 1888 میں 'سر' کا خطاب عطا کیا۔

27 مارچ 1898ء کو علی گڑھ میں آپ کی وفات ہوئی اور یونیورسٹی کی جامع مسجد کے احاطہ میں آپ کی قبر مبارک ہے۔

سر سید متنوع شخصیت کے مالک تھے اپنی زندگی میں انہوں نے تعلیمی، سیاسی، ادبی تحقیقی ہر قسم کے علمی اور قومی مشغولیت کو اپنی زندگی کا اہم حصہ بنایا اور ہر میدان میں اپنے دیرپا اثرات چھوڑے ہیں، بات اگر اردو زبان و ادب کی کی جائے تو آپ کی ذات گرامی اولین معماروں کی صف میں کھڑی ہوئی نظر آتی ہے، وہیں اگر تعلیمی معاملات کا ذکر ہو تو علی گڑھ تحریک کی اہمیت و افادیت و خدمات سے کسی کو انکار نہیں، غرض کہ علم و عمل کے ہر میدان میں اس عظیم سپوت نے مستقل یادگار چھوڑی ہے۔

سر سید نے اپنی دور بینی و دور اندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ کہ تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت کے لیے کسی سوسائٹی یا ادارہ کی اشد

ضرورت ہوتی ہے اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ نے متعدد سوسائٹی اور تنظیموں کی بنیاد ڈالی انہیں میں سے ایک تحریک "علی گڑھ تحریک" کے نام سے موسوم ہے جو مسلم یونیورسٹی کے قیام کی سب سے بڑی محرک ثابت ہوئی۔

10.4 علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک یا جس کو "سرسید تحریک" بھی کہا جاتا ہے اس کے پس منظر اور بیک گراؤنڈ کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہمیں انیسویں صدی کے اوائل کا مطالعہ اور تب کے سیاسی حالات کا جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے جس طرح اس بات پر سبھوں کا اتفاق ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے کم و بیش ایسے ہی حالات غدر سے قبل بھی تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مغل سلطنت عروج پر تھی اور اپنے آخری ایام گن رہی تھی یہی وہ دور ہے جس میں عظیم مصلح اور معمار قوم سرسید احمد خان نے آنکھیں کھولی، گویا مغل سلطنت برائے نام تھی پورے طور پر برٹش حکومت کا تسلط ہو گیا تھا چنانچہ 1857 میں آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں آزادی کی لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مغل سلطنت بالکلیہ ختم ہو گئی اس جنگ میں ہندو مسلم سب نے حصہ لیا لیکن مسلمانوں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کے نتیجے میں سب سے زیادہ نقصان بھی انہیں کے حصے میں آیا۔ انگریز اس کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن بن گئے جس سے مسلمانوں کی زندگی دشوار سے دشوار ہوتی چلی گئی، نہ جانے کتنے ہی مسلمانوں کو سزائے موت ہوئی، ان کے گھر، مال و دولت، زمین جائیداد سب کچھ چھین لیا گیا اور روزگار کے تمام مواقع و راستے مسدود کر دئے گئے، جو قوم صدیوں سے معزز تھی وہ ایک دم سے ذلت و پستی کی غار میں پہونچ چکی تھی جس سے بآسانی نکلنا دشوار تھا۔ ان پر خطر و پر آشوب حالات میں سرسید ہمیشہ اسی فکر اور تلاش میں رہتے کہ کیسے مسلمانوں کو ان حالات سے نکال کر ان کے مستقبل کو تابناک بنایا جائے؟ چنانچہ سرسید کے تدبر و تفکر نے ان مسائل کا یہ حل تلاش کیا کہ قوم کی حالت کو اگر بہتر بنایا جا سکتا ہے تو یہ صرف ان کے اندر تعلیمی بیداری کو عام کر کے ہی ہو سکتا ہے، آپ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا جو سب سے بڑا سبب ہے وہ در اصل تعلیم سے دوری ہے۔ ہندوستان میں جس شخص نے تعلیم کو نئی شکل اور اردو نثر کو نئی صورت عطا کی اس کا نام سرسید احمد خاں ہے۔ جدید تعلیم کے محرک اور جدید اردو نثر کے بانی سرسید احمد خاں نے صرف طرز تحریر ہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے طرز احساس کو بھی بدلا۔

سرسید نے 1857 کے غدر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا تھا اور قوم کی ہر میدان میں تنزلی سے آپ کا دل بری طرح سے ٹوٹ چکا تھا چنانچہ انہوں نے قوم کو اس دلدل اور تباہی سے بچانے کیلئے انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون کو سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے پر زور دیا جس کے لیے سرسید نے غازی پور شہر میں 1862 میں انگریزی زبان میں تصنیف شدہ اعلی اور معیاری کتب کو اردو میں منتقل (ترجمہ) کرنے کی غرض سے "سائینٹیفک سوسائٹی" کی بنیاد رکھی تاکہ اردو زبان سے واقفیت رکھنے والے لوگ ان کتب سے استفادہ کریں، دوسرے سرسید نے قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے برٹش حکومت کی مخالفتوں کو ترک کرنے پر زور دیا اور حکومت سے ٹکراؤ کو ختم کرنے کے لئے اسباب بغاوت ہند تالیف کی اس کتاب میں ۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب و علل کو زمینی سطح پر پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ یا بغاوت کی اصل وجوہات کیا تھیں اس کو سرسید نے انگریز حکمرانوں کے سامنے مدلل انداز میں پیش کرنے کی جرات

مندانہ کوشش کی۔ انہوں نے ہندوستانی عوام کو بے قصور بتاتے ہوئے بغاوت کی آڑ میں ہندوستانی عوام پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص کیے جانے والے مظالم کی روک تھام کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستانی رعایا کو اور خاص کر مسلمانوں کو جن پر سارا نچوڑ انگریزوں کی بدگمانی کا تھا، بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے، نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کیے ہیں اور جو اسباب انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے، ان کی تردید اور غلط ثابت کیا ہے۔

سرسید نے 1869 میں انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کے مشہور تعلیمی اداروں آکسفورڈ و کیمبرج یونیورسٹی کا بغور مشاہدہ اور جائزہ لیا اور لندن کے انگریزی نظام تعلیم، طرز معاشرت، نظام اور طرز زندگی، اخلاق، رہن سہن کا معائنہ کیا اور آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز کے تعلیمی ادارہ کی ضرورت ہے چناچہ آپ نے لندن میں ہی اس طرح کا تعلیمی ادارہ کے قیام کا منصوبہ بنایا اور 1872ء بنارس میں سرسید نے ایک فنڈ کمیٹی قائم کی جس کا نام انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا جس کے لائف سیکریٹری سرسید مقرر کئے گئے اس فنڈ کمیٹی نے کالج چلانے کے لئے کچھ اصول و ضوابط مرتب کئے اور چار کمیٹیاں قائم کیں، پہلی کمیٹی کا کام زبان کی تعلیم اور دنیوی علوم سے متعلق ہدایات دینا تھا، دو کمیٹیاں شیعہ اور سنی کی مذہبی تعلیمات سے متعلق قائم کی گئی جب کہ چوتھی کمیٹی کی ذمہ داری بورڈنگ ہاؤس اور اسکی طلبہ کی دیکھ بھال تھی۔

اس فنڈ کمیٹی کی دفعہ 16 کی رو سے یہ طے پایا کہ اس کالج کے قیام کے لئے چندے و امداد کی درخواست صرف اور صرف مسلم و عیسائیوں سے ہی کی جائے کیوں کہ کالج مسلمانوں کی تعلیم و ترقی و فلاح کو ذہن میں رکھ کر قائم کرنے کا منصوبہ تھا اور رہے عیسائی تو ان سے امداد اس لیے مانگی جائے کیونکہ وہ اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں تو ان کا بطور حکمران قوم یہ فرض بنتا ہے کہ وہ مسلموں کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات میں بھرپور تعاون کریں لیکن اگر کوئی بخوشی اس کالج کے لیے امداد کرنا چاہے تو اس کی امداد کو بصدق دل قبول کرنا بھی اس دفعہ کے تحت قرار پایا۔ فنڈ کمیٹی کے 1872 کے ایک جلسہ میں سید محمد خان نے اس دفعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ عام لوگوں پر اس کا اطلاق ہو راجہ مہاراجاؤں کو اس سے دور رکھا جائے بحر حال سید محمد خان کے اس مشورے سے کمیٹی کے دیگر اراکین نے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ راجہ مہاراجاؤں سے بھی چندے کی درخواست کیجائے۔ اس کے بعد فنڈ کمیٹی نے برطانوی عوام کے لیے سرکولر جاری کر کے چندے کی اپیل کی ساتھ ہی کالج کے قیام کے مقاصد بھی بیان کئے جن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کے قاعدے کے موافق مدرستہ العلوم کے قائم ہونے سے طالب علموں کے دلوں میں ایک نئی روح بھر جائے گی۔ اور اعلیٰ درجے کے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف راغب کرے گی اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے جو بالفعل کوشش ہو رہی ہیں اس میں اگر کامیابی ہو تو انگلستان اور ہندوستان کے باہم جو سیاسی اور سماجی تعلقات ہیں وہ اور زیادہ مضبوط اور دوستانہ ہو جائیں گے۔ جو عظمت مسلمانوں کو ہندوستان میں حاصل تھی اور ان کے بعد وہ عظمت انگریزی قوم کو حاصل ہوئی ہے اس لیے انگریزوں کو رقیب سمجھنے پر مسلمانوں کی طبیعت مائل ہوتی ہے، لیکن نہایت لائق اور معزز مسلمان بخوبی واقف ہیں کہ انگلستان کی شائستہ حکومت نے ہندوستان کو بڑے

بڑے فائدے بخشے ہیں اور یہ لوگ اپنے ہم مذہبوں کو جہالت اور ذلت کی حالت سے جو بالفعل ان کی ہے نکالنے کے لیے ایک ایسا سلسلہ اصلی اور پختہ تعلیم کا بنانا تجویز کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کی آئندہ نسل کے لوگ شائستہ باشندے اور گورنمنٹ کی بہتر رعایا ہوں۔

سرسید کو اس بات کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں دولت، حشمت اور عزت کی زندگی بسر کریں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی بدحالی اسلام کی بدحالی کی علامت ہے، اس لیے مسلمانوں کی حالت جتنی بہتر ہوتی جائے گی اتنا ہی اضافہ اسلام کی عزت اور شان شوکت میں ہوتا جائے گا۔ پٹنہ میں کالج کے قیام میں تعاون کے لیے مسلم اشرافیہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے بے علمی کو مفلسی کی ماں قرار دیا اور کہا کہ جدید علوم کی تعلیم پر ہی قومی ترقی کا مدار ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری قوم خود قبول کرے۔ سرسید کی اس تحریک کی مخالفت بھی کی گئی یوپی میں اس تحریک کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس سے پیسے جمع کرنے میں دشواری پیش آئی لیکن سرسید نے ہار نہ مانی اور اور اپنی دھن میں مگن رہے اور جہاں جہاں سرسید کی حمایت کی گئی سرسید نے ان سے چندہ جمع کیا۔ اس کے بعد مسئلہ تھا کہ کالج کس شہر میں قائم کیا جائے، سید صاحب کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا تو یہاں آپ نے لوگوں کو اس تحریک میں دلچسپی اور تعلیمی سرگرمیوں میں متحرک پایا لیکن اس کے باوجود انہوں نے عوام سے رائے مانگی جس کے لیے اخبارات اور خطوط کے ذریعے رائے مانگی گئی آخر کار علی گڑھ کا انتخاب کیا گیا کیوں کہ علی گڑھ کے لوگ اس تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے اور یہاں پہلے سے کالج بھی تھا جس کی امداد کے لیے حکومت نے وعدہ بھی کیا ہوا تھا ساتھ ہی علی گڑھ جنکشن نے دوسرے شہروں کو جوڑ دیا تھا اور اس کے قرب وجوار میں مسلم آبادی بھی کثیر تعداد میں تھی اس کی علاوہ بھی دیگر وجوہات تھی جس کے لیے علی گڑھ شہر کا انتخاب عمل میں آیا۔

سرسید نے انگلستان کے سفر کے دوران ہی ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا چنانچہ 1875ء میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی جو دو سال بعد 8 جنوری 1877ء میں محمڈن اورینٹل کالج کے نام سے جانا جانے لگا۔

10.5 تحریک کے اسباب

مغل سلطنت کا آخری دور مسلمانوں کے لئے سب سے مشکل دور رہا ہے اس دور میں مسلمان ہر اعتبار سے پستی میں تھے سیاسی، سماجی معاشی اور تعلیمی ہر اعتبار سے مسلمانانِ ہند کی حالت بہت خراب نظر آتی ہے۔ مسلمان دینی تعلیم تو حاصل کرتے تھے البتہ انگریزی اور عصری علوم کو سیکھنا اپنے لئے قابل گناہ، معیوب اور مہمل شے تصور کرتے تھے یہی وہ اسباب تھے جن کو سرسید احمد خان کی دور رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا جس کے سبب ملک کے مختلف حصوں اور شہروں میں ان کی پرزور مخالفت بھی کی گئی ان کے خلاف اخبارات نکالے گئے، فتوے لگے لیکن سید صاحب کو ایک دھن تھی کہ کیسے بھی ہو قوم کو عصری علوم کی تعلیم دے کر پستی اور غربت سے نکالا جائے، کالج کے لئے آپ نے طرح طرح سے چندہ وصول کیا۔ نمائش گاہ میں انہوں نے کتابیں فروخت کیں، والنٹیئر بن کر گلے میں جھولی ڈال کر بھیک مانگی، اسٹیج پر گئے اور غزلیں گائیں۔ اور یہ کہ جب تک مسلمانان ہند تعلیم کو خاص کر انگریزی علوم وفنون حاصل کر کے ان میں مہارت حاصل نہیں کر لیں گے تب تک وہ خود کو پستی سے نہیں نکال سکتے یہی وجہ ہے کہ سرسید نے تعلیم کو سب سے ضروری قرار دیا ہے اور آخر تک آپ اپنے اس موقف

پر قائم رہے مہاتما گاندھی جی نے تعلیم کے تئیں آپ کی خدمات اور جدوجہد کو دیکھ کر آپ کو "پیغمبر تعلیم" کے خطاب سے نوازا ہے۔

10.6 تحریک کا مقصد

یہ تحریک سرسید کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور علمی کوششوں کا نتیجہ ہے اس تحریک کے بنیادی پہلوؤں میں نئے علوم کا حصول، مذہبی علوم کی عقلی تفہیم، سماجی و معاشرتی اصلاح اور زبان و ادب کی ترقی شامل ہے۔ سیاسی مفاہمت، تعلیم جدید اور مذہبی اصلاح علی گڑھ تحریک کی بنیادی مقاصد میں سے ہے، نیز سرسید کی اس تحریک کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کا ذوق و شوق پیدا کرنا قدیم دور سے نکل کر جدید علوم اختیار کرنے کی تجاویز پیش کرنا تھا۔ سرسید نے جدید علوم کے ساتھ مذہبی علوم حاصل کرنے پر بھی زور دیا۔ وہ اپنے بنائے ہوئے اداروں سے نیک اور باصلاحیت نوجوانوں کا عروج دیکھنا چاہتے تھے اور ان کو ترقی کی منزلوں پر پہنچانا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم و فنون اور انگریزی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مشرقی تعلیم حاصل کرنے پر بھی توجہ دیں اس تعلق سے سرسید فرماتے ہیں۔ "اے میرے عزیزو! میری یہ آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں پس میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام بچے طالب علم جو کالجوں میں پڑھتے ہیں اور جن کے لیے میری آرزو ہے کہ وہ یورپ کے سائنس اور لٹریچر میں کامل ہوں اور تمام دنیا میں اعلیٰ شمار کیے جائیں، ان دو الفاظ لا الہٰ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کو نہ بھولیں۔" (خطبات سرسید، جلد 2، ص 72)۔ اس تحریک کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمان وقت کے تقاضوں اور حالات کے پیش نظر تعلیم حاصل کریں اور مسلموں کی تعلیمی حالت کے سدھار اور بہتر بنانے کیلئے کانفرنس، سیمینار اور کالجز قائم کئے جائے تاکہ مسلم قوم وقت کا جو اور جیسا تقاضہ ہو اس کے مطابق تعلیم حاصل کریں اس سلسلے میں سرسید فرماتے ہیں۔ "اس وقت ہم کو ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک تعداد کثیر اور اگر کثیر نہیں تو ایک تعداد معقول اپنی قوم کے نوجوانوں کی پیدا کریں جو علم اور قابلیت میں اور ان علوم میں جو اس زمانہ کی حاجتوں کے لیے ضروری ہے سربرآوردہ ہوں۔" (تہذیب الاخلاق اکتوبر 1992)۔ خلاصتاً اس تحریک کے بنیادی طور سے تین مقاصد نظر آتے ہیں۔ اول مسلمانوں کی تہذیبی و ثقافتی بقاء، سیاسی ترقی اور سماجی بلندی، دوم نئے علوم کی روشنی میں دین کی توضیح و تشریح اور توہم پرستی کا بالکلیہ خاتمہ اور سوم اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت۔

10.7 مدرسۃ العلوم / محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

سرسید احمد خان نے انگلستان کے سفر کے دوران وہاں کے نظام تعلیم اور طرز زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد جس مسلم کالج کو قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا وطن واپس آکر اور لوگوں سے چندہ یا امداد جمع کیا حالانکہ یہ ایک مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری اور 1875 میں اس کی بنیاد ڈالی اور اس طرح مسلمانوں کے ایک مڈل ہائی اسکول کی بنیاد رکھی گئی جس کو مدرسۃ العلوم کا نام دیا گیا۔ اس کے قیام کے دو سال بعد 1877 میں اس اسکول کو اپ گریڈ کر کے کالج کا درجہ دے دیا گیا اس کالج کا افتتاح اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے خود کیا تھا۔ یہ پورے ہندوستان میں کروڑوں مسلمانوں کے لئے پہلا کالج تھا علی گڑھ کالج میں طلباء مقیم ہوتے تھے اور وہاں ایف

۔اے۔بی۔ اے۔ ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی کے درجات تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔کالج کے نصاب میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان وادب، جدید سائنس اور نئے علوم کے مطالعے کے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا۔ آرٹ اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی لازم تھی۔ چونکہ مسلمانوں نے سرسید کے مذہبی خیالات قبول نہ کیے تھے، اس لیے وہ دینیات کے شعبے سے لاتعلق رہے۔ بہر حال سنی اور شیعہ طالب علموں کو ان کے عقائد کے مطابق دینیات کی تعلیم دی جاتی رہی۔ کالج میں کھیلوں اور دیگر ادبی، معاشرتی اور ثقافتی تفریحوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ہندو طلباء بھی کالج میں داخل ہوتے تھے۔ 1878 میں اس کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہوا تھا اور پھر 1887 سے آخر تک (1920) الہ باد سے الحاق رہا۔

10.8 یونیورسٹی کا درجہ

سرسید احمد خان نے جس مسلم کالج کو اپنی انتھک کوششوں سے قائم کیا تھا وہ روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا تھا اسی لئے سرسید کا ایک خواب یہ تھا کہ کالج اب یونیورسٹی کی شکل اختیار کر جائے تاکہ اس میں طلبہ کو علم کے حصول میں مزید آسانی ہو لیکن آپ کی زندگی میں یہ دیرینہ خواہش تکمیل کو نہ پہونچ سکی اور آپ کی وفات ہوگئی آپ کے بعد آپ کے رفیق خاص نواب محسن الملک نے یہ بیڑہ اٹھایا لیکن قسمت سے وہ بھی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے آپ کے بعد نواب وقار الملک نے اس تحریک (یونیورسٹی کا درجہ ملنا) کو آگے بڑھایا اور یہ تحریک پوری ہندوستان میں پھیل گئی اور لوگوں کی مانگ بھی بڑھنے لگی اس کے بعد حالات اس تحریک کی حمایت کرنے والوں کے مخالف ہوتے رہے اور اسی دوران جنگ عظیم بھی ہوئی لیکن آخر کار 1920 میں سرسید اور ان کے خاص رفقاء کا دیرینہ خواب مکمل ہوا اور اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور اب یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یونیورسٹی ایکٹ نافذ ہونے کے بعد بروئے قانون جنرل لارڈ ریکٹر ہوئے، گورنر جنرل نے نوٹیفیکیشن کے ذریعے تین سال کے لئے ہز ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم تاج ہندی جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، جی بی ای (فردوس آشیاں) سابق فرمانروا بھوپال کو چانسلر اور ہز ہائنس آغا خان کو پرو چانسلر اور مہاراجہ سر محمد علی خان (محمود آباد اودھ) کو وائس چانسلر مقرر کیا۔

10.9 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: قیام کے مقاصد

ہم اوپر کے پیراگراف میں پڑھ کر آئے ہیں کہ سرسید نے مسلم کالج کے قیام کا منصوبہ اس لئے بنایا تھا کہ مسلمان 1857 غدر کے بعد سیاسی، سماجی اور معاشی ہر اعتبار پسماندگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور ساتھ ہی اس غدر کے نتیجے میں انگریز حکومت مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار مانتی تھی جس سے مسلمانوں اور حکومت کا آپس میں ٹکراؤ تھا، سرسید ایک دور اندیش اور درد مند انسان تھے قوم کی پست حالی کے تئیں ان کے دل میں درد صاف نظر آتا ہے قوم کو پستی سے نکالنے اور عصری علوم وفنون سے آراستہ کرنے کرنے کے لئے انہوں نے اس کالج جسے آج پوری دنیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانتی ہے قائم کیا تھا اور اس کالج میں انگریز اساتذہ کا تقرر کر کے مسلمان اور حکومت کے درمیان جو ٹکراؤ اور مخالفت کی صورت تھی اس کو ختم کرنا تھا تاکہ ہند کے مسلمان حکومت کے ساتھ ملکر تعلیم حاصل کریں اور

اور اپنی حیثیت اور مرتبہ کو بلند کریں۔ دوسرے اس ادارہ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مسلمان دین کے علاوہ دوسرے عصری علوم کو سیکھنے کو ناجائز اور گناہ تصور کرتے تھے سر سید کا نظریہ یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمان عصری علوم کو حاصل کئے بغیر ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتے لہذا عصری علوم کے حصول کے لیے کسی ادارہ کی ضرورت ہوتی ہے انہیں سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے سر سید نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ادارہ میں الگ سے خواتین کے لئے کالج، یونانی کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج اور دیگر اسٹڈی سینٹر قائم کئے گئے۔

10.10 عبداللہ گرلز کالج

عبداللہ گرلز کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک اہم ترین حصہ ہے جو بانی کالج شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں کے نام پر عبداللہ کالج کے نام سے معروف ہے۔ شیخ عبداللہ کی پیدائش 1874 میں ہوئی اور وفات 1965 میں۔ پاپا میاں ایک عظیم شخصیت کے مالک انسان تھے انہوں نے تعلیم نسواں کے لئے بڑی خدمات انجام دیں ہیں خواتین کی نظم تعلیم کا سہرا شیخ صاحب اور ان کی اہلیہ وحید جہاں بیگم کے سر ہے، آپ نے سر سید تحریک سے متاثر ہو کر محمڈن اورینٹل کالج میں داخلہ لیا اور بی اے۔ و ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ سر سید کی حیات میں جب بھی کبھی خواتین کی تعلیم کے تعلق سے بات کی گئی تو سید صاحب کی طرف سے مخالفت کا سامنا کیا گیا جس کے نتیجے میں سر سید کی حیات میں خواتین کی تعلیم کے تعلق سے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ سر سید کی وفات کے بعد شیخ عبداللہ نے اس جانب توجہ کی اور اپنی اہلیہ وحید جہاں بیگم کی حوصلہ افزائی سے عبداللہ نے دسمبر 1902 میں ایجوکیشن کانفرنس میں خواتین کی تعلیم کا مسئلہ بھرپور طریقے سے اٹھایا۔ اس میٹنگ میں عبداللہ کو فیمیل ایجوکیشنل سیکشن کا سیکریٹری منتخب کر لیا گیا اور انہوں نے خواتین کی تعلیم کے لئے ایک نارمل اسکول قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اسی دوران مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ علی گڑھ میں خواتین کی تعلیم کے تعلق سے شائع ہونے والے ایک مضمون سے مزید حوصلہ ملا جس میں مولانا نے خواتین کی تعلیم پر زور دیا تھا۔ 1903 میں ممبئی کے ایک جلسہ میں خواتین کو شرکت کی اجازت دی گئی اس کے بعد عبداللہ نے بھوپال کی حکمراں بیگم سلطان جہاں کو مالی امداد کے لئے خط لکھا جواب میں بیگم نے مجوزہ خواتین کے اسکول کو ماہانہ سو روپے دینے کا وعدہ کیا۔ سن 1906 میں شیخ عبداللہ اور ان کی اہلیہ نے اوپر کوٹ میں ایک مکان لے کر مدرسہ کا آغاز کیا وقت گزرے کے ساتھ یہ جگہ ناکافی ہوتی گئی تو 1910 میں محلہ بنی اسرائیلیان میں مدرسہ منتقل کرنا پڑا مردوں کے کالج کے پاس عورتوں کا اسکول ہونے کی وجہ سے تشویش کا اظہار کیا گیا تو سن 1911 میں لیفٹیننٹ گورنر کی اہلیہ لیڈی پورٹر نے اسکول کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ تعمیر 1913 کے آخر تک بھوپال کی بیگم کی 20,000 روپے کی مالی امداد اور حکومت کی طرف سے مساوی رقم سے مکمل ہوئی۔ یکم مارچ 1914 کو بھوپال کی بیگم نے ایک تقریب میں رہائشی اسکول کا افتتاح کیا جس میں ہندوستان بھر سے تعلیم یافتہ خواتین نے شرکت کی۔ خواتین کا یہ اسکول 1925 میں انٹر میڈیٹ تک اور 1937 میں ڈگری کالج میں تبدیل ہو گیا جہاں موجودہ وقت میں تین ہزار سے زائد طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں اس کالج میں گریجویشن تک کی تعلیم کا نظم ہے جس کے لئے کالج میں سات فیکلٹیاں ہیں آج یہ خواتین کی معیاری تعلیم کے لیے شمالی ہند کا اول درجہ کا کالج ہے۔ اس کالج میں طالبات کی رہائش کے لیے شیخ عبداللہ کے نام سے عبداللہ ہال بھی ہے۔

10.11 اجمل خان طبیہ کالج

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے جنوری 1926 کو طبیہ کالج کے قیام کے لیے ایک سب کمیٹی تشکیل دی جس کی سفارش پر 1927 میں طبیہ کالج قائم ہو گیا۔ قیام کے وقت یہ کالج صاحب باغ میں واقع تھا گرچہ یونیورسٹی سے اس کا تعلق تھا مگر سند اور ڈگری دینے کا تعلق بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی سے تھا۔ 1945 میں بورڈ سے رشتہ ختم ہوا اور یونیورسٹی خود با قاعدہ امتحان لینے لگی اور سند کا سلسلہ جاری کیا۔ طبیہ کالج مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتا رہا چنانچہ موجودہ عمارت کی بنیاد 1936 میں میجر جرنل نواب سر حمایت علی خان اعظم جاہ بہادر سلطنت آصفیہ، دکن کے ہاتھوں رکھی گئی 1944 میں تعمیر کا کام مکمل ہوا تو کالج سلطان جہاں منزل سے موجودہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا اور سن 1969 میں حکیم اجمل خان کی صد سالہ تقریب کے موقع پر اس کالج کا نام اجمل خان طبیہ کالج کر دیا گیا۔ آج اس کالج میں طلبہ و طالبات انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور پی جی ڈپلومہ (یونانی) کرتے ہیں نیز مدارس کے فارغین کے لیے یک سالہ پری طب کے نام سے ایک کورس کرایا جاتا ہے جس میں بی یو ایم ایس میں داخلہ لینے کے لیے کامیاب ہونا شرط ہے۔ کالج میں بارہ ڈپارٹمنٹ ہیں اور کالج کا 120 بیڈ پر مشتمل ایک ہسپتال بھی ہے جہاں روزانہ مریض علاج و معالجہ کے لئے آتے ہیں۔

10.12 یونیورسٹی اسکول

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ملک کا منفرد ادارہ ہے جہاں ملک و بیرون ممالک سے طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر انتظام فی الوقت دس اسکول ہیں جن میں سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری تک تعلیم کا بہترین نظم ہے۔ جن میں سید ناطاہر سیف الدین (منٹو سرکل) اسکول، اے۔ ایم۔ یو سٹی اسکول جواب راجہ مہندر پرتاپ کے نام سے جانا جاتا ہے، اے۔ ایم۔ یو گرلس اسکول، سید حامد سینئر سیکنڈری اسکول (لڑکوں کے لئے)، سینیر سیکنڈری اسکول (لڑکیوں کے لئے)، سٹی گرلز اسکول (قاضی پارا)، احمدی اسکول برائے نابینا، اے۔ ایم۔ یو اے بی کے اسکول (لڑکوں کے لئے)، اے۔ ایم۔ یو اے بی کے اسکول (لڑکیوں کے لئے) اور عبداللہ اسکول۔

10.13 شعبہ جات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شمار ملک کے بڑے اداروں میں ہوتا ہے اس ادارہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں 13 فیکلٹیاں ہیں جن کے تحت 117 شعبے قائم ہیں ساتھ ہی 3 اکیڈمی اور 21 سینٹر بھی ہیں جن میں ملک و بیرون ممالک کی ایک بڑی تعداد تقریباً 35 ہزار سے زائد طلبہ نرسری تا پی ایچ ڈی تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادارہ روز اول سے اب تک مسلکی اختلافات سے دور رہا ہے اور یہاں سنی اور شیعہ دینیات کی تعلیم ایک ہی بلڈنگ میں دی جاتی ہے اس ادارہ نے ملک کے تمام شہریوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں اور ملک کا کوئی بھی باشندہ یہاں داخلہ لے سکتا ہے اس ادارہ کے پہلے گریجویٹ ہونے کا شرف ایک غیر مسلم ایشوری پرساد کو ہے جو ایک نامور مورخ تھے۔ مدارس کے فارغین بھی کچھ شرائط کے ساتھ مختلف شعبہ جات میں داخلہ لینے کے مجاز ہیں نیز مدارس کے فضلاء کی آسانی کے لئے یک سالہ برج کورس

شروع کیا گیا ہے تا کہ مدارس کے فارغین سوشل سائنس کے دیگر مضامین میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

10.14 مولانا آزاد لائبریری

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری ہے محمڈن اورینٹل کالج کے قیام کے وقت کالج کی لائبریری لیٹن لائبریری کے نام سے جانی جاتی تھی۔ موجودہ لائبریری کا افتتاح 1956 میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے کیا اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر اس کو مولانا آزاد لائبریری نام دیا گیا۔ مولانا آزاد لائبریری قدیم مخطوطات، مذہبی کتب، پرانے اور نادر دستاویزات کی وجہ سے پورے عالم میں مشہور ہے اس لائبریری میں 14 لاکھ سے زائد کتب ہیں اور اس کا شمار ملک اور ایشیاء کی بڑی لائبریری میں ہوتا ہے۔

10.15 جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کے قیام کا سہرا ''سر ڈاکٹر ضیاء الدین'' کے سر ہے جنہوں نے یونیورسٹی میں ضرورت مند اور غریب لوگوں کے علاج کے لئے میڈیکل کالج کی ضرورت محسوس کی اس کام کے لیے انہوں نے فنڈ جمع کئے لیکن میڈیکل کالج کے قائم ہونے سے پہلے ہی انہوں نے دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ بعد میں وائس چانسلر ایس بشیر حسن زیدی، میجر ایس ایم ایچ نقوی اور رجسٹرار ایم ایم صدیقی نے کالج کو شروع کرنے میں اہم کردار ادا کیا کالج خان بہادر اسلام نبی خان اور پروفیسر ہادی حسن کی قیادت میں پروان چڑھا، جنہوں نے فنڈ ریزنگ مہم چلائی ہندوستان بھر سے تقریباً آٹھ ملین روپے اکٹھے کیے گئے۔۔2 اکتوبر 1962 مہاتما گاندھی جی کی 93 ویں یوم ولادت کے موقع پر میڈیکل کالج کا افتتاح کیا گیا اور ایم بی بی ایس کے لیے 40 سیٹیں مختص کی گئی، 1996 میں جب سیٹوں کی تعداد 150 ہوئی تو ان میں سے 40 سیٹیں بی ڈی ایس کے کے خاص کی گئی۔ آج کالج 26 شعبوں اور 3 سینٹر پر مشتمل ہے جہاں طلباء میڈکل میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ میڈیکل کالج میں 1269 بیڈ پر مشتمل ایک ہسپتال بھی ہے جہاں مریضوں کا سستا علاج ہوتا ہے۔ اس کالج کا شمار ہندوستان کے اعلیٰ میڈیکل کالجز میں ہوتا ہے۔

10.16 ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی

ذاکر حسین کالج کا قیام 1935 میں یونیورسٹی کے ایک کالج کے طور پر ہوا۔ اس کالج کے تحت 11 شعبہ جات ہیں جن میں گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کالج میں داخل طلبہ کے لئے تین اقامتی ہال ہیں جن میں طلبہ رہتے ہیں۔ یہ کالج عالمی سطح پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے اور ہندوستان میں انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے دیگر اعلیٰ اداروں کی صف میں اس کی گنتی ہوتی ہے، اس کالج میں پڑھنے والے طلبہ اپنی نت نئی ایجادات سے پورے عالم میں ملک و یونیورسٹی کا نام روشن کر رہے ہیں۔

10.17 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مرکزی حکومت ہند کے زیر نگرانی تعلیمی اداروں میں منفرد اور بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ ایک مکمل رہائشی ادارہ ہے۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں برٹش دور میں قائم کیا گیا تھا۔
- سرسید کی پیدائش 17 اکتوبر 1817 کو دلی کے سید گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام سید متقی اور والدہ کا نام عزیز النساء ہے۔
- سرسید کو پہلی ملازمت آگرہ کی عدالت میں بطور نائب منشی ملی اور ترقی کرتے ہوئے مراد آباد میں صدر الصدور کی حیثیت سے تعیناتی ہوئی۔
- 27 مارچ 1898 میں آپ کی وفات ہوئی اور یونیورسٹی کی جامع مسجد کے احاطہ میں آپ کی تدفین ہوئی۔
- علی گڑھ تحریک کو "سرسید تحریک" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔
- علی گڑھ تحریک 1857 کے غدر کے بعد مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے اور عصری علوم کے حصول کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔
- بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں 1857 کی آزادی کی آخری لڑائی ہوئی جس میں ان کو شکست ہوئی اور مغل سلطنت بالکلیہ ختم ہو گئی۔
- سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" میں بغاوت کے اسباب انگریزی حکمران کے سامنے مدلل انداز میں پیش کیے اور ہندوستانی عوام کو بے قصور قرار دیا۔
- سرسید نے 1869 میں انگلستان کے سفر میں مسلم کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور 1875 میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی جو 1877 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے جانا جانے لگا۔
- اس کالج کا الحاق 1878 تک کلکتہ یونیورسٹی اور 1887 سے 1920 تک آلہ آباد سے الحاق رہا۔
- سرسید اور ان کے رفقاء خاص کا یونیورسٹی کا درجہ ملنے کا دیرینہ خواب 1920 میں مکمل ہوا۔
- خواتین کی تعلیم کے لئے شیخ عبد اللہ نے اپنی اہلیہ کی مدد سے 1902 میں ایجوکیشن کانفرنس میں تعلیم نسواں کا معاملہ اٹھایا اور 1906 میں خواتین کے لئے ایک مدرسہ کا آغاز کیا۔
- لیڈی پورٹر نے 1911 میں مدرسہ کی تعمیر کی سنگ بنیاد رکھی جو حکومت اور بھوپال کی بیگم کی 20000 کی مالی امداد سے 1913 میں مکمل ہوئی اور 1914 میں بھوپال کی بیگم نے اس کا افتتاح کیا۔
- عبد اللہ کالج 1925 میں انٹر میڈیٹ اور 1937 میں ڈگری کالج میں تبدیل ہو گیا۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اکیڈمک کونسل کی سفارش پر 1927 میں طبیہ کالج قائم ہوا۔

- اجمل خان کی صد سالہ تقریب کے موقع پر طبیہ کالج اجمل خان طبیہ کالج کے نام جانا جانے لگا۔
- پہلی کلاس سے انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی میں دس اسکول ہیں۔
- یونیورسٹی میں 13 فیکلٹی 117 شعبے 3 اکیڈمی اور 21 سینٹر ہے۔
- مولانا آزاد لائبریری کا شمار ایشیا کی بڑی لائبریری میں کیا جاتا ہے اس میں 14 لاکھ سے زائد کتب موجود ہیں۔
- جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج سر ڈاکٹر ضیاء الدین کی محنتوں کا نتیجہ ہے جس کا افتتاح 1962 میں ہوا۔ اس کا ہسپتال میں 1269 بیڈ پر مشتمل ہے۔
- ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی 1935 میں قائم ہوا اس میں 11 شعبہ جات ہیں یہ کالج ملک و بیرون ملک اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

10.18 نمونہ امتحانی سوالات

10.18.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. سرسید کی والدہ کا نام ہے؟

(a).وحید بیگم (b).عزیز النساء (c).سلطان جہاں (d).بلقیس بانو

2. برطانوی حکومت نے کس سن میں سرسید کو "سر" کے خطاب سے نوازا؟

1877.(a) 1888.(b) 1887.(c) 1866.(d)

3. سرسید کو پہلی ملازمت کس شہر میں ملی؟

(a).بنارس (b).بجنور (c).غازی پور (d).آگرہ

4. کس عظیم شخص نے سرسید کو "پیغامبر تعلیم" کہا ہے؟

(a).مہاتما گاندھی (b).مولانا ابوالکلام آزاد (c).مولانا قاسم نانوتوی (d).پنڈت جواہر لعل نہرو

5. سائنٹفک سوسائٹی کا قیام کس سال عمل میں آیا؟

1877.(a) 1875.(b) 1862.(c) 1860.(d)

6. محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کی بنیاد کا شہر میں رکھی گئی؟

(a).علی گڑھ (b).غازی پور (c).بجنور (d).بنارس

7. مدرسۃ العلوم کب قائم کیا گیا؟

1875.(a) 1877.(b) 1888.(c) 1889.(d)

8. سرسید نے جس کالج کی بنیاد رکھی تھی اسے یونیورسٹی کا درجہ کس سال ملا؟

1898.(a) 1899.(b) 1915.(c) 1920.(d)

9. شیخ عبداللہ کی وفات کب ہوئی؟

1970.(a) 1965.(b) 1963.(c) 1961.(d)

10. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طبیہ کالج حکیم اجمل خان کے نام سے جانا جانے لگا؟

1969.(a) 1967.(b) 1975.(c) 1976.(d)

10.18.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
2. علی گڑھ تحریک کے اسباب و مقاصد پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد تحریر کیجیے۔
4. حکیم اجمل خان طبیہ کالج کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
5. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام، اسباب و محرکات پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔

10.18.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سرسید کے حالات قلمبند کیجیے۔
2. علی گڑھ تحریک اور سرسید کے کردار کا مفصل جائزہ لیجیے۔
3. عبداللہ گرلز کالج کے قیام اور شیخ عبداللہ کے کردار پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

10.19 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ	: پروفیسر مظہر مہدی
2.	سرسید اور علی گڑھ تحریک	: پروفیسر خلیق احمد نظامی
3.	علی گڑھ کی علمی خدمات	: پروفیسر خلیق احمد نظامی
4.	علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز	: مرتب نسیم قریشی
5.	علی گڑھ تحریک	: سید حامد
6.	مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام اور اس کے اولین نقوش	: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
7.	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مختصر تاریخ	: مرتب محمد امین زبیری

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 11: تعلیمی ادارہ ندوۃ العلماء

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 تحریک ندوۃ العلماء

11.3 تحریک ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر

11.4 تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد

11.5 ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس اور اہم تجاویز۔

11.6 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام

11.7 ندوۃ العلماء کے بانی اور اہم شخصیات

11.8 ندوۃ العلماء کا فکری شعور و منہج

11.9 ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم

11.10 ندوۃ العلماء کے شعبے

11.11 ندوۃ العلماء اور صحافت

11.11.1 عربی صحافت میں ندوہ کا مقام

11.11.2 مختلف میدانوں میں فضلائے ندوہ کی خدمات اور ندوہ کی حصولیابیاں

11.12 اکتسابی نتائج

11.13 نمونہ امتحانی سوالات

11.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

ندوۃ العلماء ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں، ایک تحریک ہے، تحریک ندوۃ العلماء ہندوستان میں برپا ہونے والی چند اہم تحریکات میں سے ایک ہے، اس اکائی میں اختصار کے ساتھ تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے تاریخی پس منظر اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے قائم کردہ تعلیمی ادارہ دارالعلوم کے نصاب اور شعبہ جات سے متعارف کرایا گیا ہے، جدید ہندوستان میں ندوۃ العلماء کے کردار، مختلف میدانوں میں فضلائے ندوہ کی خدمات، ثقافت اسلامی، فکر اسلامی، اصلاح نصاب اور اصلاح معاشرہ میں ندوۃ العلماء کے کردار سے متعارف کرایا گیا ہے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد تعلیمی ادارہ ندوۃ العلماء کی تاریخ، اس کے پس منظر اور مقاصد سے واقف ہونا ہے، دیگر تعلیمی اداروں کے درمیان اس کی کیا خصوصیات ہیں، کیا امتیازات ہیں، یہ ادارہ کیوں قائم کیا گیا ہے، اس کے پیچھے کیا اسباب تھے، کن لوگوں نے قائم کیا، اس اکائی میں ان پہلوؤں سے واقف کرانے کے ساتھ ندوۃ العلماء کے مقاصد، اس کے نصاب اور اس کی اصلاحی کوششوں کے علاوہ اس کی خدمات اور حصولیابیوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

11.2 تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء وقت کے بڑے علماء کے غور و فکر اور مشاورت کے بعد وجود میں آئی، یہ ایک تاریخ ساز و عہد ساز تعلیمی اور اصلاحی تحریک تھی، 1857ء کی جنگ آزادی اور شکست و ریخت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے تھے ان میں ایک طرف سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ قائم ہو کر اپنے کام میں مصروف تھی تو دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند قائم کر چکے تھے، تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جس وقت تحریک ندوۃ العلماء برپا ہوئی اس وقت ملت اسلامیہ دھڑوں میں تقسیم تھی، قدیم اور جدید کے درمیان کشمکش جاری تھی، دارالعلوم دیوبند کو قائم ہوئے چھبیس (26) برس گزر چکے تھے اور ایم اے او کالج علی گڑھ کو 18 سال ہو چکے تھے، ملت کو ان حالات میں کسی ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو قدیم و جدید کی خلیج پاٹ سکے، ملت کی شیرازہ بندی کر سکے اور مختلف دھڑوں کو قریب لا سکے، اعتدال و توازن کی فضا ہموار کرے، دنیا کے دھارے میں بہنے یا زندگی سے یکسر کنارہ کش ہونے کے بجائے زندگی کی رہنمائی کرے، چنانچہ 1892ء میں تحریک ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے مقاصد پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے۔

11.3 تحریک ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر

1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد ملت اسلامیہ ہندیہ جس طرح حالات کا شکار ہوئی اور بحران سے دوچار

ہوئی وہ کسی صاحب علم پر مخفی نہیں، ہر شعبہ زندگی متاثر ہوا، علمی، فکری، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی زوال مقدر بن گیا، اربابِ فکر و نظر اور دانشورانِ قوم کے نزدیک اس ہنگامۂ محشر میں سب سے بڑا مسئلہ ملت کو احساس کمتری سے نکالنا تھا، اللہ نے جس کو جو صلاحیت دی تھی وہ اس اعتبار سے ملت کے لیے کام کر رہا تھا، 1866ء میں دیوبند کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا، اس کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اپنے باقی ماندہ اثاثے کی حفاظت کی جائے، اپنے مذہبی تشخص کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے، اس کے قائدین نے اپنے لیے یہ کام طے کیا کہ مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کی حفاظت اور اس کے احترام کا جذبہ فروغ دیا جائے، مغربی تہذیب کے طوفان کا مضبوطی اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے، اس کام کے لیے ہی دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی جو آج دنیا بھر میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے۔

دوسری طرف سرسید احمد خان مرحوم غور و خوض کر رہے تھے، ان کے غور و خوض کے بعد ان کی درد دل کے نتیجے میں علی گڑھ میں 1875ء میں ایک ادارہ جدید تعلیم کے لیے وجود میں آیا، جو پہلے مدرسہ، پھر کالج اور کالج سے ترقی کر کے 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا، آج دنیا اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانتی ہے، اس ادارہ نے عصری تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں، لیکن اسی کے ساتھ یہاں مغربی طرزِ فکر، مغربی تہذیب و تمدن کو بھی قبول کیا گیا، چنانچہ دیوبند و علی گڑھ تحریکات الگ الگ انتہاؤں پر قائم تھیں، دیوبند کے پیشِ نظر صرف اور صرف قدیم صالح کی حفاظت اور اشاعت تھی، علی گڑھ قوم سے احساس کمتری دور کرنے کے لیے صرف جدید نافع کے حاصل کرنے کو ضروری سمجھ رہا تھا، ایک طرف احساسِ شکست تھا، انگریزوں کا تعصب اور تسلط تھا دوسری طرف قوم کے سامنے یہ داخلی چیلنج تھا کہ رہبران ملت و دانشوران قوم کئی دھڑوں میں تقسیم تھے، قدیم و جدید کی بحث ایک وسیع خلیج میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی، تفرقہ وانتشار شباب پر تھا، جبکہ ملت پہلے ہی فقہی مسائل اور مذہب کے نام پر وجود میں آئی فرقہ بازی سے زار و نزار تھی، ایسے حالات میں یہ ایک نئی بحث ملت کو اندر سے مزید کمزور کر رہی تھی، یہ وہ حالات تھے جن میں ایک نئی تعلیمی وہ اصلاحی تحریک 1892ء میں وجود میں آئی، اس نے ایک طرف علوم اسلامیہ کے درسی نصاب میں بنیادی اصلاحات اور جدید نصاب کی تیاری کو اپنا نصب العین بنایا، دوسری طرف اس نے زندگی سے کنارہ کشی کے بجائے زندگی کی رہنمائی کو اپنا مقصد قرار دیا اس نے ایسے علماء کی تیاری کو اپنا ہدف قرار دیا جو کتاب و سنت کے وسیع علم کے حامل ہونے کے ساتھ جدید علوم و رجحانات سے واقف ہوں، نئے طوفانوں کا پامردی سے مقابلہ کریں اور زندگی کے لئے درست رہنمائیاں فراہم کر سکیں۔

اس تحریک کے بانی مولانا سید محمد علی مونگیری تھے، گرچہ اس کا آغاز متعدد نفوس کی موجودگی میں ہوا اور یہ قافلہ بھی مختلف کارواں سالاروں کی سربراہی میں آگے بڑھا، لیکن تحریک کی بنیادی و ابتدائی دعوت مولانا محمد علی مونگیری نے ہی چلائی، آگے چل کر علامہ شبلی خاص طور پر اس تحریک کا دماغ اور زبان ہوشمند بن گئے، اس کے قائم کیے ہوئے دارالعلوم کی شہرت و ترقی کا کلیدی کردار قرار پائے، اس تحریک کو ابتدا سے ہی قبول عام حاصل ہوا، ایک طرف حلقہ دیوبند کے نمائندہ علماء نے اس کے پہلے ہی جلسے میں شرکت کی تو دوسری طرف ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس عام منعقدہ 1894ء کے بعد اسی سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس میں اس تحریک کا باقاعدہ استقبال کیا گیا، نواب محسن الملک نے اجلاس کی تقریروں کا اپنی تقریر میں بار بار حوالہ دیا اور مبارک باد پیش کی، تجویز پیش کی، سرسید

احمد خان نے اس تجویز کی ہزاروں کاپیاں چھپوا کر تقسیم کیں، اس تحریک کی ابتدائی مجلس مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوئی تھی، اس مجلس کے شرکاء کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ہی اس تحریک کی عظمت واہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ علی گڑھیؒ۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ۔ مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا محمد خلیل احمد مدرس دوم دارالعلوم دیوبند"۔ مولانا ثناء اللہ امر تسریؒ۔ مولانا نور محادِ پنجابی۔ مولانا احمد حسن کانپوری۔ مولانا سید محمد علی مونگیری۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری۔ مولانا حکیم سید ظہور الاسلام فتحپوری۔ مولانا عبد الغنی خاں مؤرشیلا بادی۔ مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی۔ مولانا سید شاہ تجمل دیسنوی۔"(تاریخ ندوۃ العلماء جلد ا ص96)

11.4 تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد

یہ تحریک جس نے آگے چل کر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک مثالی ادارہ قائم کیا، اس کے پیشِ نظر کیا مقاصد تھے یہ جاننا ضروری ہے، اس کے تعلیمی نصاب اور مزاج و منہج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مقاصد پر نظر ہو، ہم تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد کو "تاریخ ندوۃ العلماء" سے من و عن نقل کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں:

"ندوۃ العلماء کے قیام کے اسباب کے ادراک کے لیے اس مجلس کے اغراض و مقاصد کے جائزہ سے مدد ملے گی، اس تحریک کے پیش نظر ابتداء میں دو مقاصد تھے۔

1. علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
2. نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

تحریک ندوۃ العلماء جوں جوں آگے بڑھتی رہی، اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا، اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے:

1. علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔
2. ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔
3. اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔
4. اسلامی تعلیمات کی اشاعت، بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا"۔(تاریخ ندوۃ العلماء جلد 1 ص96)

11.5 ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس اور اہم تجاویز۔

ندوۃ العلماء کی تحریک کے لئے پہلی میٹنگ مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر ہوئی، مولانا محمد علی مونگیری ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، پھر انہوں نے اس تحریک کے تعارف کے لئے غور و فکر شروع کیا، انہوں نے مولانا مشتاق علی صاحب کو ندوہ کے تعارف کے لیے مختلف جگہوں کا دورہ کرنے اور لوگوں کو تحریک کا ہمنوا بنانے کے لیے تیار کیا، انہوں نے اس کام کو بخوبی انجام دیا،

ادھر ندوہ کے پہلے اجلاس عام کے لئے تاریخ و مقام کا اعلان ہوا، پہلا اجلاس 15/16/17 شوال 1311ھ مطابق 22/23/24، اپریل 1894ء کو مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا، یہ اجلاس بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس کی صدارت استاد العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے کی، عربی تعلیم کے نقائص پر تقریریں ہوئیں، دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر گفتگو ہوئی، علامہ شبلی نعمانی نے دستور العمل پیش کیا، اس پہلے اجلاس میں جو اہم تجویز پاس ہوئی وہ یہ کہ موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے، دوسرے یہ کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوہ کے اجلاس میں شریک ہوا کریں اور تیسرے یہ کہ کثرت سے قائم مدارس کا وفاق بنایا جائے، دو تین بڑے مدارس کو مراکز بنا کر تمام مدارس کو ان کی شاخ بنایا جائے۔

ندوہ کے اجلاس عام بھی بڑی خاص اہمیت و خصوصیات کے حامل ہوتے تھے، ان جلسوں میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج نظر آتا تھا، ایک طرف اسلامی روایات کی پاسداری تو ساتھ ہی مشرقی تہذیب کا حسن نمایاں، اس کے ساتھ جدید وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا، ان جلسوں کی کشش کے باعث ندوہ کا بڑا پُرتپاک استقبال ہو رہا تھا، ندوہ کے اجلاس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء، وکلاء، ادباء، صحافی اور تاجر وغیرہ سبھی شریک ہوتے تھے، ندوہ کی مقبولیت اور ترقی میں ان جلسوں کا بڑا کردار تھا، "تاریخ ندوۃ العلماء" میں ان جلسوں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بڑی پرکشش ہے۔

11.6 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام

چونکہ تحریک ندوۃ العلماء کوئی عام تحریک نہ تھی، اپنے وقت کے اعلیٰ ترین دماغ اس تحریک کے پیچھے کام کر رہے تھے، اس کے عزائم بلند اور مقاصد بہت اعلیٰ تھے، اس لئے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اصلاحِ نصاب کی تمام تر کوششوں کے باوجود جب تک تحریک ندوۃ العلماء کے زیر نگرانی ایک نئی تجربہ گاہ نہیں ہو گی، ایک نیا دارالعلوم نہیں قائم کیا جائے گا تب تک مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی کا حصول ممکن نہیں، ناظم ندوہ العلماء نے ایک واضح خاکہ کو مسودہ کی شکل میں 12 محرم 1313ھ کے جلسہ مجلس انتظامیہ میں پیش کیا، مجلس نے یہ طے کیا اس کو شائع کر کے اس پر لوگوں کی رائے طلب کی جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر 80 حضرات کی رائے موصول ہوئیں، 53 علماء اور 19 دیگر اربابِ نظر نے کلی اتفاق کیا، تین علماء اور 5 دیگر اہل علم نے اختلاف کیا، جب یہ مرحلہ گزر گیا تو پھر ناظم ندوۃ العلماء کی طرف سے عربی نصاب کا ایک مجوزہ خاکہ پیش کیا گیا، اس مجوزہ نصاب میں تغیر پذیر حالات کی روشنی میں ہندوستان کے درسی نصاب کے مختلف مراحل کا جائزہ لیتے ہوئے جس نصاب کو تجویز کیا گیا وہ گزشتہ صدی کے اوائل میں ایک نہایت فکر انگیز اور انقلابی اقدام تھا۔

بانیان ندوۃ العلماء کے پیش نظر کیا کچھ تھا اور کن کن جزئیات پر ان کی نظر تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ان سطروں پر نظر ڈالیے، علامہ شبلی مجوزہ دارالعلوم کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں :

"تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی اور مذہبی مدرسہ نہیں، جو بلحاظ جامعیت و وسعت و عظمت کے مدرسہ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، یعنی جس میں تمام علوم دینیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ کی تعلیم ایسے کمال درجہ تک دی جاتی ہو کہ تحقیق کا مرتبہ حاصل

ہو سکے، جس میں اسلامی علوم کی قدیم اور نادر کتابیں فراہم کی گئی ہوں، جس میں طالب علموں کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہو، جس میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہو جو مخالفین کے اعتراضات کا جواب آج کے مذاق کی موافق دے سکیں، جس میں حکومت کی موجودہ زبان بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو، جس کی عمارت وسیع پُرفضا اور عظیم الشان ہو، اس غرض کو پورا کرنے کے لئے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا دارالعلوم قائم کیا گیا"۔(تاریخ ندوۃ العلماء جلد ا/ ص80)

مولانا محمد علی مونگیری تربیت و معاشرت کا اعلیٰ ترین تخیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہر طالب علم کے لئے جدا کمرہ ہو گا، اور بجز خاص حالت کے دو طالب علم ایک کمرہ میں نہ رہیں گے، طالب علموں کو تاکید ہو گی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں، صبح سے شام تک جو اشغال ہیں مثلاً سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ جانا، کھانا کھانا، ورزش کرنا سب کے لیے اوقات متعین ہوں گے اور تمام طالب علموں کو انہیں اوقات میں سب کچھ کرنا ہوں گے"(تاریخ ندوۃ العلماء جلد ا ص80)

چونکہ ندوۃ العلماء کا ظہور جن بلند مقاصد کے لیے ہوا تھا ان کے لئے ایسے علماء کی تیاری بھی ناگزیر تھی جن کے ذریعہ مستقبل میں وہ مقاصد حاصل کیے جا سکیں، ندوہ نے جیسے علماء کی تیاری کا اعلان کیا تھا اور عزم ظاہر کیا تھا، مولانا شبلی نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے۔(1) علماء میں ایثار نفس پیدا کرنا(2) انگریزی داں علماء پیدا کرنا(3) مذاق حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور اربابِ قلم پیدا کرنا(4) ایسے علماء پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کام کر سکیں۔

جن حالات میں ندوۃ علماء کا وجود ہو رہا تھا وہ حالات کئی اعتبار سے ہنگامہ خیز تھے، ایک طرف لوگوں نے فقہی مسائل کو کفر و اسلام کا مسئلہ بنا دیا تھا، دوسری طرف فتنہ تکفیر شباب پر تھا، قدیم و جدید کی بحث نے ملت کو دولخت کر دیا تھا، عیسائی مشنریاں اپنا کام کر رہی تھیں، شدھی تحریک کا خطرہ الگ سر پر تھا، ندوۃ العلماء نے اشاعت اسلام کو شروع سے ہی اپنے مقاصد میں شامل رکھا، مشنریوں اور شدھی تحریک کے مقابلہ کے لیے یہ اہم تجویز رکھی کہ عربی خواں لوگوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دی جائے، ان اہم مقاصد اور تجاویز کے ساتھ ندوۃ العلماء نے جو مجوزہ نصاب پیش کیا اس میں بیس علوم اور ان کی کتابوں کے ساتھ تاریخ، اصول لغت، تجوید و عروض، اختلاف و تہذیب نفس اور اسرارِ احکام کو خاص طور پر شامل کیا گیا تھا۔

تحریک ندوۃ العلماء کا مرکزی دفتر کانپور میں تھا، لیکن مجوزہ دارالعلوم کا قیام لکھنؤ میں طے ہوا تو ستمبر 1898ء کو مرکزی دفتر لکھنؤ منتقل ہو گیا، اس کے افتتاح کے لیے ایک عارضی مکان بھی خرید لیا گیا، بالآخر 26 ستمبر 1898ء کو اسی مکان "خاتون منزل" میں دارالعلوم کا عملی افتتاح بھی ہو گیا۔

دارالعلوم خستہ حال مکان میں چلتا رہا، لیکن اس کے بانیوں کو دارالعلوم کے لیے مستقل اور پُر شکوہ عمارت کی فکر رہی، مولانا شبلی جب معتمد ہو کر آئے تو ان کو اس کی کچھ زیادہ ہی فکر دامن گیر ہوئی کیونکہ ان کی نظر میں قسطنطنیہ کا دارالعلوم اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مذہبی درسگاہ بھی دنیوی درسگاہوں سے ظاہری حیثیت میں کسی طور پر کم نہ ہو، بہر حال اس سلسلہ میں مختلف تجاویز

آتی رہیں، 1907ء میں مدرسہ کی عمارت کے لیے ایک تخمینی صرفہ 50 ہزار مقرر کر کے ایک اپیل چھپوائی، پھر 1908ء میں مختلف اشخاص کی کوششوں سے گومتی ندی کے کنارے دو سو روپیہ سالانہ لگان پر لیفٹیننٹ گورنر نے زمین دینا منظور کر لیا، نومبر 1908ء میں دارالعلوم کی مرکزی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس کی سنگ بنیاد کے موقع پر بقول سید سلیمان ندوی ایک چھت کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی اور زاہد و صوفی، اس طرح رندوامام سبھی جمع تھے، ایک مذہبی درسگاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے حاکم کے ہاتھوں علماء کی موجودگی میں رکھا جارہا تھا، دارالعلوم کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا، جیسے جیسے کام آگے بڑھتا شبلی کا جوش بڑھتا جاتا، جب تفسیر کا کمرہ تعمیر ہو رہا تھا تو فروری 1901ء میں ایک روز تمام اساتذہ و طلبہ کو لے کر گئے، سب نے مل کر وہاں مزدوروں کو ہٹا کر کام کیا، شبلی نے فرمایا کہ بظاہر بنیاد تو حاکمِ وقت نے رکھی تھی اب آؤ ہم سب مل کر حقیقی بنیاد رکھیں، اس تقریب کا آغاز بھی پر اثر دعا سے ہوا اور اختتام بھی دعا پر ہوا، اس موقع پر شبلی نے ایک مؤثر تقریر کی جس کا ماحصل ان ہی کے قلم سے پڑھیے تو ندوہ کا فکر و تخیل اور اغراض و مقاصد واضح ہو جاتے ہیں، فرماتے ہیں:

" اے خدا! یہ چند ناتواں، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سخت سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لے جاتا ہے، جس کے ساتھ ان کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر سب اسی طوفان کی زد میں ہے، اے خدا! ان چند ناتواں بچوں کا دعوی ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے، جو کسی طرح ان کے چہرے پر نہیں کھلتا، تو ہی ہے جو ان کی آبرو رہ جائے"۔ (حیاتِ شبلی ص386)

11.7 ندوۃ العلماء کے بانی اور اہم شخصیات

ندوۃ العلماء کے پہلے مشاورتی اجلاس میں جن نامور شخصیات نے شرکت کی ان کا ذکر گزر چکا، تاہم بانی ندوۃ العلماء اور ناظم اول مولانا سید محمد علی مونگیری تھے، ندوہ کے پہلے اور نامور معتمد تعلیم علامہ شبلی نعمانی تھے، ان کے دور معتمدی میں ندوۃ العلماء نے مثالی ترقی کی اور ایک دبستان فکر و قلم کا رنگ اختیار کیا، ان حضرات کے علاوہ جن شخصیات کی خدمات نمایاں رہی ہیں ان میں مولانا سید عبد الحی حسنی، مولانا سید ظہور الاسلام، مولانا مسیح الزماں خاں، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، منشی اطہر علی کاکوروی، منشی احتشام علی، شاہ سلیمان پھلواروی وغیرہ قابل ذکر ہیں، بعد کے دور میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی، مولانا سید ابو الحسن علی حسنی، مولانا عمران خان ندوی، مولانا محب اللہ لاری، مولانا سید محمد رابع حسنی، مولانا سعید الرحمن اعظمی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

11.8 ندوۃ العلماء کا فکری شعور و منہج

ندوہ نے ابتدا سے ہی فکری وسعت، اعتدال، اصول میں تصلب اور فروع میں توسع کو اپنا منہج قرار دیا، اسلام کی روح اور اس کی آفاقی دعوت کو اپنا مطمح نظر بنایا، قومیت کے مختلف نعروں کی پرزور تنقید کی، مذہبی و ملی ترقی کے بارے میں ہمیشہ حسّاس رہا، اپنے عہد اول سے ہی ملی مسائل سے دلچسپی اور بانیان ندوہ کی ان میں بھرپور شرکت رہی ہے، عالمی سطح پر یا ملکی سطح پر جب بھی ملت کو چیلنجز درپیش ہوئے تو ندوہ نے ان کا مقابلہ زبان و قلم سے کیا، ندوہ کی صحیح تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ندوہ نام ہے دل دردمند، فکر ارجمند اور زبان ہوشمند کا، ندوہ نے

تمام طرح کی مسلکی بحثوں سے بالا ہو کر اپنا شعار رجوع الی الاسلام کو بنایا اور یہ آواز بلند کی شعارنا الوحید اِلی الاسلام من جدید، اس نے خذ ما صفا ودع ما کدر کی حکمت عملی اپنائی، ندوہ کا وجود قدیم وجدید کی معرکہ آرائی کے درمیان ہوا تھا، اس لیے اس نے مادی تہذیب یکسر کو قبول کیا اور نہ دنیا سے کٹ جانے کی دعوت دی بلکہ اس نے دنیا میں رہ کر زندگی کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی، اپنے فرزندوں سے نئے نئے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا مطالبہ کیا۔

تحریک ندوہ کی فکری اساس خالص دینی تھی، اس کے بانیوں کے نزدیک دینی تعلیمات سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم کا فقدان ہی مسلمانوں کے زوال اور دن بہ دن تنزلی کا اصل سبب تھا، اسی لئے دینی تعلیم کے طریقہ ونصاب کی اصلاح کو ہی اس تحریک میں مرکزی کردار بنایا گیا اور ساتھ ہی علماء دین کو بھی اس تحریک میں مرکزی کردار دیا گیا، ابتدا سے ہی دینی تعلیم میں اصلاح اور ترقی نصاب کے کام کا بیڑا اٹھایا گیا، نصاب تعلیم کے سلسلے میں جو بحثیں اور تجاویز اس کے بانیوں کے درمیان پیش ہوئیں، سالانہ جلسوں کی روداد پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ نصاب کا مسئلہ کس قدر اہم تھا۔

ندوہ اتحاد ملت کا داعی رہا ہے، باہمی کشمکش کو دور کرنا اس کا شعار رہا ہے، جماعتی عصبیت اور گروہی اختلافات، مسلکی نظریات کی ندوہ نے کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اپنے آپ کو اس سے ہمیشہ دور رکھا، ندوۃ العلماء کے بانیوں کو اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ علوم اسلامیہ میں سب سے زیادہ تغیر پذیر علم فقہ ہے، لوگوں کے دینی و دنیاوی فوائد و مصالح کی اساس بھی اسی پر ہے، اس کے لئے انہوں نے تحقیق کا راستہ اپنایا، ابتدائی دنوں میں کانپور میں ایک محکمہ افتاء قائم کیا، پھر آگے چل کر دارالعلوم کے احاطہ میں "مجلس تحقیقات شرعیہ" قائم کی گئی۔

11.9 ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم

ندوہ نے اپنے نصاب میں سبق آموزی اور کتاب آموزی سے زیادہ فن آموزی کو بنیادی جگہ دی، ذوق پیدا کرنا اصل مقصد قرار پایا، ابتدا میں ادنیٰ، اعلی اور اختصاص کی تقسیم کے ساتھ مختلف علوم کی تعلیم شروع کی گئی، ارکان کے درمیان نصاب کے سلسلے میں اختلافات بھی ہوئے لیکن علامہ شبلی کا دور معتمدی ندوہ کا عہد زرّیں ثابت ہوا، نصاب میں بڑی موثر تبدیلیاں ہوئیں، اعلی تعلیم اور تکمیل کا درجہ کھولا گیا، قرآن کریم کے درس کو خاص مقام دیا گیا، بلکہ متن قرآن کی بلاواسطہ تدریس میں ندوہ کو اولیت حاصل ہوئی، انگریزی تعلیم کا نظم کیا گیا، ہندی اور سنسکرت کا درجہ قائم ہوا جو گرچہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔

ندوہ کے نصاب میں ابتدا سے ہی حذف واضافہ کا عمل ہوتا رہا ہے، شبلی کے دور میں عربی کے نئے نصاب کا اجراء ہوا، بعد کے دور میں فضلائے ندوہ نے باقاعدہ عربی ریڈر تیار کیں، جو کامیاب نصابی کتابیں قرار پائیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مختارات من الادب العربی، قصص النبیین، القرأۃ الراشدۃ، مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی منشورات من الادب العربی، مختار الشعر االعربی، الادب العربی بین عرض ونقد، مولانا عبد الماجد ندوی کی معلم الانشاء وغیرہ، وہ نصابی کتابیں ہیں جن کو عرب نقاد نے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا، ندوہ میں قرآن وعلوم قرآن، حدیث وعلوم حدیث، فقہ وعلوم فقہ، تاریخ، سیرت، ادب عربی، انگریزی کے علاوہ فلسفہ ومنطق وسیاست ومعاشیات کے مبادیات کو مختلف

مراحل میں رکھا گیا ہے، ندوہ کا تعلیمی نصاب چار مراحل پر منقسم ہے، پرائمری ۵ سال، ثانویہ ۶ سال، عالیہ چار سال اور تخصص دو سال پر مشتمل ہے، ابتدائی و ثانوی مرحلہ میں دینی مضامین کے ساتھ اچھی خاصی مقدار میں عصری مضامین کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، ساتھ ہی عربی، انگریزی اور ہندی پڑھائی جاتی ہے، عالیہ درجات میں تفسیر و حدیث و فقہ و ادب عربی پر خاص توجہ دی جاتی ہے، ساتھ ہی انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے، تخصص کے دو سالہ نصاب میں تفسیر، حدیث و فقہ اور ادب عربی کے شعبے الگ الگ ہیں، جہاں متعلق مضمون میں اختصاص کرایا جاتا ہے، اس کے علاوہ خصوصی کے درجات کا نصاب پانچ سال پر مشتمل ہے، یہ نصاب خاص ان طلبہ کے لئے ہے جو عصری تعلیم کے اداروں سے مدارس کا رخ کرتے ہیں اور عالم دین بننا چاہتے ہیں، افتاء، تدریس اور دعوت و صحافت کی تربیت کے لیے علیحدہ ایک سالہ ڈپلومہ کا نصاب ہے۔

11.10 ندوۃ العلماء کے شعبے

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شعبۂ تعلیم سب سے اہمیت کا حامل ہے، اس کو جدید طرز پر شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ثانویہ کا شعبہ علحدہ ہے، عالیہ اور تخصص کا الگ، بلکہ عالیہ اور تخصص کے لیے الگ الگ شعبے قائم ہیں، شعبہ ادب عربی، شعبہ علوم شرعیہ، شعبہ دعوہ، ان تینوں شعبوں سے عالمیت اور فضیلت یعنی اختصاص کی سند دی جاتی ہے، شعبہ علوم شرعیہ میں۔ مرحلہ اختصاص میں تین قسمیں ہو جاتی ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، اس کے علاوہ خصوصی درجات کا شعبہ الگ ہے جس میں کالج سے آنے والے طلباء یا غیر ملکی طلبہ کی تعلیم کا نظم کیا گیا ہے اور معہد تحفیظ القرآن الگ ہے۔

ان تعلیمی شعبوں کے علاوہ ندوہ میں دارالقضاء، دار الافتاء، مجلس تحقیقات شرعیہ، شعبہ صحافت و لسانیات، شعبہ اصلاح معاشرہ، شعبہ دعوت و ارشاد اور شعبہ مدارس وغیرہ قائم ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کیمپس میں قائم کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ہندوستان بھر کے مدارس اسلامیہ کے درمیان اپنا منفرد مقام رکھتی ہے، اپنی ضخامت اور تعداد کتب کے اعتبار سے اس کا شمار ایشیا کی بڑے مکتبات میں ہوتا ہے، یہ لائبریری اپنی عمارت، حسنِ انتظام کے اعتبار سے بھی مثال ہے، مختلف مشاہیر کے ذاتی ذخیرہ کتب بھی اس کی ملکیت میں ہیں، مخطوطات کی بھی خاصی تعداد ہے، علوم دینیہ کے علاوہ تاریخ و سوانح اور دیگر موضوعات پر یہاں کتب کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اس کتب خانہ کو ڈیجیٹلائز کرنے کا کام جاری ہے، عالمی تحریک رابطہ ادب اسلامی کی برصغیر شاخ کا دفتر بھی ندوہ میں ہی قائم ہے، مولانا علی میاں کی قائم کی ہوئی تحریک "پیام انسانیت" بھی اب دارالعلوم کا ایک شعبہ ہے۔

11.11 ندوۃ العلماء اور صحافت

ندوہ نے ابتدا میں ہی صحافت کی طرف خاص توجہ دی، ارکان ندوہ میں سے اس جانب سب سے زیادہ رجحان علامہ شبلی کا تھا، یہ ان کے مزاج و مذاق کی چیز بھی تھی، اس کے ذریعہ علماء کو ایک نئے آفاق، نئے فکر اور نئے علم کلام سے واقف کرانا مقصود تھا، اور سب سے زیادہ رسالہ کے ذریعہ طلبہ دارالعلوم کی قلمی تربیت مقصود تھی، چنانچہ 1904ء میں رسالہ الندوہ کا اجرا ہوا، علامہ شبلی اور مولانا شیر وانی اس کے

ایڈیٹر مقرر ہوئے، علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم وجدید کا موازنہ رسالہ کے خاص موضوعات قرار پائے، سید سلیمان ندوی اور ابو الکلام آزاد جیسے اصحاب قلم اسی رسالہ کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ ہیں، 1912ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا، پھر دوبارہ شروع ہوا لیکن 1916ء میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

1932ء میں ندوہ نے عربی صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور مجلہ الضیاء مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں جاری ہوا، جس نے ہندوستان کی عربی صحافت میں اولیت کے ساتھ عالم اسلام اور یورپ میں بھی اپنی شناخت قائم کی، قلتِ وسائل کے سبب یہ رسالہ بھی 1935ء میں بند ہو گیا۔

1955ء میں مشہور زمانہ عربی مجلہ البعث الاسلامی مولانا محمد الحسنی نے البعث العربی کے مقابلہ کے لیے جاری کیا، 1960ء میں اس رسالے کو ندوہ نے اپنے انتظام میں لے لیا اور تاحال یہ ندوہ کا ترجمان ہے۔

1959ء میں پندرہ روزہ پرچہ "الرائد" طلبہ کی تنظیم النادی العربی کی طرف سے مولانا سید محمد رابع حسنی کی ادارت میں جاری کیا گیا اور تاحال پابندی سے نکل رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جلد ہی اس پرچہ کی ہیئت تبدیل ہو گئی تھی اور اس نے طلباء کے بجائے مشاہیر اہلِ قلم کی نمائندگی شروع کر دی تھی البتہ اب بھی اس میں طلبہ کے بعض مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

ندوہ نے اپنے دینی، فکری اور دعوتی و اصلاحی افکار کی اشاعت کے لیے نومبر 1963ء میں مولانا محمد الحسنی کی ادارت میں ایک پندرہ روزہ رسالہ "تعمیر حیات" جاری کیا جو پابندی سے اب تک نکل رہا ہے، اس کے علاوہ 2002ء میں ہندی زبان میں دعوت واصلاح کے کام کو فروغ دینے کے لئے ایک ماہنامہ "سچاراہی" جاری کیا گیا جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر حافظ ہارون رشید صدیقیؒ تھے، یہ رسالہ مولانا محمد غفران ندوی کی ادارت میں اب بھی جاری ہے، ندوہ نے انگریزی میں بھی فکرِ اسلامی کی ترسیل کے لیے ایک سہ ماہی مجلہ 1998ء میں جاری کیا جس کے ایڈیٹر شارق علوی اور ان کے نائب ڈاکٹر عبید الرحمن ندوی ہیں، یہ رسالہ بھی جاری ہے۔

11.11.1 عربی صحافت میں ندوہ کا مقام

یوں تو عمومی طور پر ندوہ کی صحافت نے تعمیری صحافت میں اپنا کردار ادا کیا ہے، فکرِ اسلامی کی ترسیل، اصلاحِ نصاب پر غور و فکر، مختلف مہلک رجحانات کا تعاقب، جدید علمِ کلام کے فروغ اور ادبِ اسلامی کے نظریہ کی تبلیغ و ترسیل میں اس کا کردار نمایاں رہا ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک عربی صحافت میں ندوہ کو اولیت و فوقیت حاصل ہے، جس وقت ندوہ سے الضیاء نکلا اس وقت مسلمانان ہند کی ترجمانی کے لیے عربی زبان میں کوئی پرچہ نہیں ہوتا تھا، ندوہ کی عربی صحافت کو مشاہیر عرب نقاد نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، الضیاء نے اپنی شناخت چھوڑی، البعث الاسلامی نے عرب قومیت کی تحریک کا اس قوت سے مقابلہ کیا کہ حکومت کو مداخلت کرنی پڑی، فکر اسلامی اور ادب اسلامی کو فروغ دینے میں ندوہ کے عربی رسائل کا کام اور مقام وہ ہے جس پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، ندوہ کی عربی صحافت کے فیض یافتگان میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح حسنی، مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا نور عالم خلیل امینی اور مولانا سلمان الحسینی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں، جنہوں نے ان رسائل و مجلّات سے تربیت پائی اور

بعد میں پختہ کار ادیب وصحافی اور اصحابِ قلم کی حیثیت سے جانے گئے۔

11.11.2 مختلف میدانوں میں فضلائے ندوہ کی خدمات اور ندوہ کی حصولیابیاں

ندوۃ العلماء نے ایک صدی سے زیادہ کے عرصے میں مختلف میدانوں میں بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اس کی خدمات ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں، ملی اتحاد، برادران وطن تک انسانیت کا پیغام پہنچانا، اسلامی فکر کو عام کرنا، اعتدال وتوازن کو رواج دینا، قرآن مجید سے رشتہ استوار کرنا، عربی کی تعلیم وتدریس کو ایک جہت دینا، جدید علمِ کلام کی طرح ڈالنا، ادبی نظریات کے بالمقابل ادب اسلامی کا نظریہ قائم کرنا ندوہ کی متنوع خدمات کے جلی عنوانات ہیں۔

ندوہ نے جدید علم کلام کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، علوم القرآن کے باب میں بہترین کتابیں شائع کیں، تاریخ کا معروضی مطالعہ پیش کیا، علوم حدیث کے باب میں شاندار خدمات پیش کیں، اساطینِ ندوہ بالخصوص علامہ شبلی نے جو طرح ڈالی تھی اس کو ندوہ اور فضلائے ندوہ نے اس طرح آگے بڑھایا کہ آج تک عصری اسلوب میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے، دارالمصنفین کا اکثر لٹریچر ندوی فضلاء کے قلم سے نکلا اور پھر ندوہ کے کیمپس میں قائم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے بھی ان ہی کی تصانیف شائع ہوئیں، ادب عربی کے میدان میں اگر ندوہ کی خدمات کو عالم عربی میں سراہا گیا، نئی ادبی تحریک رابطہ ادب اسلامی کی بنیاد اگر ندوہ کی رہین منت رہی اور اس کی صدارت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے حصہ میں آئی تو اردو ادب میں بھی ندوہ یا دبستانِ شبلی اپنی شناخت رکھتا ہے، کئی اساطین علماء کی خدمات پر ایم فل وپی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گیے، علوم القرآن، علوم حدیث، علوم فقہ، تاریخ، سیرت وسوانح، فکر اسلامی، جدید علم کلام اور ادبیات عربی واردو میں جن فضلائے ندوہ کی خدمات بہت نمایاں ہیں ان میں سے چند نام یہ ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، حسن مثنی ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، اکرام اللہ خان ندوی، علامہ شہاب الدین ندوی، پروفیسر یسین مظہر صدیقی ندوی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، مولانا سعید الرحمن اعظمی، مولانا سید محمد رابع حسنی، مولانا سید واضح رشید ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی اور ڈاکٹر علی احمد ندوی وغیرہ۔

فضلائے ندوہ کی خدمات کا ملکی وعالمی سطح پر اعتراف کیا گیا، متعدد فضلاء بڑے بڑے اعزاز سے نوازے گئے، مولانا ابوالحسن علی ندوی کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، دبئی کی طرف سے عالمی شخصیت کا ایوارڈ دیا گیا، سلطان برونائی ایوارڈ دیا گیا، صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا گیا، صدر جمہوریہ ایوارڈ سے مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید واضح رشید ندوی، مولانا سعید الرحمن اعظمی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، پروفیسر اسید احتشام احمد ندوی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر شفیق احمد خان وغیرہ نوازے گئے، ڈاکٹر علی احمد ندوی کو بھی شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

تعلیم کے میدان میں ندوہ نے مدارس اسلامیہ کو ایک رخ دیا، اصلاح نصاب کے ذریعہ نصاب کے تغیر پذیر ہونے کا تصور دیا، جدید عربی ادب کی تعلیم کے لیے پہل کی، طریقہ تدریس میں تبدیلی کی، متن قرآن کی تدریس کو رائج کیا، کالج کے طلبہ کے لیے علحدہ شعبہ قائم

کیا، انگریزی کی تعلیم کو شامل کیا، اس کو ندوہ کی کامیابی ہی کہا جائے گا کہ آج اس کے نصاب و نظام سے وابستہ ملک بھر میں سینکڑوں مدارس قائم ہیں، وہ مدارس ان کے علاوہ ہیں جن میں اس کی نصابی کتب سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، دوسری طرف دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں، ندوہ اپنے بانیوں، ذمہ داران اور متعلقین کی گوناگوں محنتوں اور ذمہ داریوں کے سبب متعدد ملی تنظیموں کو بھی مرکز و مرجع بنا رہا، ندوہ کی تاریخ، ثقافت اور تعارف و خدمات کو اس مختصر سی اکائی میں جمع کرنا بہت مشکل ہے، یہاں صرف اشارے کیے گئے ہیں، تفصیلی مطالعہ کے لیے مراجع کا مطالعہ لازم ہے، مختصراً یہ کہنا درست ہوگا کہ ندوہ جن مقاصد کے لیے قائم ہوا تھا اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، بالخصوص اصلاحِ نصاب، رفعِ نزاع باہمی اور جدید تقاضوں سے آراستہ اہل قلم علماء کی تیاری میں اس کی حصولیابیاں نمایاں ہیں، یہ الگ بات ہے کہ زمانہ تغیر پذیر ہے، روز نئے حالات اور نئے تقاضے ہیں، اس لیے جمود کی قطعاً گنجائش نہیں، فی الوقت نئی تبدیلیاں ضروری ہیں جن کے لیے مسلسل غور وخوض ہوتے رہنا لازم ہے۔

11.12 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تحریک ندوہ اٹھارویں صدی کے آخری عشرہ میں قائم ہوئی پھر اس نے ایک نئی تجربہ گاہ کے طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم کیا۔
- ندوۃ العلماء نے قدیم وجدید کے درمیان ایک پل کا کام کیا۔
- ملت کے مختلف دھڑوں کو ایک اسٹیج پر لانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔
- مدارس کی تعلیم کے میدان میں نئی طرح ڈالی اور اصلاحِ نصاب کی کامیاب مہم چلائی۔
- ہندوستان میں عربی صحافت کو فروغ دیا۔
- متنِ قرآن کی تدریس کو رائج کیا۔
- اصول میں تصلب اور فروعی مسائل میں توسع کی فکر عام کی۔
- عربی کی تعلیم میں نئے نصاب کو متعارف کرایا۔
- ایک ادبی نظریہ کی بھرپور نمائندگی کی۔
- جدید علم کلام کی طرح ڈالی اور خاطر خواہ لٹریچر تیار کیا۔
- عصری اسلوب کے حامل اور عصری تقاضوں سے واقف اہل قلم کی ایک جماعت تیار کی۔
- یہ غور وفکر کا موضوع ہے کہ تحریک ندوہ کی تجربہ گاہ تو باقی ہے لیکن تحریک ندوہ کیوں مفقود و معطل ہوگئی۔
- تحریک ندوہ کی تاریخ پڑھ کر آج کے حالات میں اس کے احیاء کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔
- تاریخ ندوۃ العلماء کی روشنی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حالات کے پیشِ نظر تبدیلی نصاب کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔

- ایک صدی سے زیادہ کے احوال کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں ندوۃ العلماء کی علمی، فکری، صحافتی واصلاحی ودعوتی خدمات بہت نمایاں ہیں، ایسی مفید اور تعمیری اہداف کی تحریک کا عملاً فعال ومتحرک رہنا ملت کیلئے مفید وضروری ہے۔۔

11.13 نمونہ امتحانی سوالات

11.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ندوۃ العلماء کب قائم ہوئی۔

(a).1857ء (b).1892ء (c).1990ء (d).1791ء

2. دارالعلوم ندوۃ العلماء کب قائم ہوا۔

(a).1894ء (b).1902ء (c).1892ء (d).1914ء

3. رسالہ الندوہ کتنے سال جاری رہا۔

(a).دس سال (b).پانچ سال (c).بیس سال (d).دوسال

4. متن قرآن کی براہ راست تدریس میں کس کو اولیت حاصل ہے۔

(a).ندوہ (b).علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (c).دیوبند (d).جامعہ ملیہ اسلامیہ

5. ندوہ کے پہلے ناظم کون تھے۔

(a).محمد علی مونگیری (b).شبلی نعمانی (c).سید سلیمان ندوی (d).سید ابوالحسن علی ندوی

11.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے اسباب کیا تھے؟
2. ندوہ کے بنیادی اہداف کیا تھے؟
3. ندوہ کا سب سے بنیادی کارنامہ کیا ہے؟
4. ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس اور اس میں پیش کی گئی تجاویز پر روشنی ڈالیے؟
5. علوم القرآن اور فکر اسلامی میں چند ندوی فضلاء کی خدمات کا تذکرہ کیجئے۔

11.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ندوۃ العلماء کے پس منظر پر مفصل مضمون لکھیے؟
2. ندوۃ العلماء کے مقاصد پر تجزیاتی مضمون لکھیے؟

3. ندوۃ العلماء کی عربی صحافت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

11.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.5	حیات شبلی	:	علامہ سید سلیمان ندوی
.6	حیات سلیمان	:	شاہ معین الدین احمد ندوی
.7	حیات عبدالحی	:	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
.8	سوانح محمد علی مونگیری	:	مولانا محمد الحسنی
.9	تاریخ ندوۃ العلماء اول۔ دوم	:	مولانا اسحاق جلیس ندوی۔ مولانا شمس تبریز خاں
.10	پیام ندوۃ العلماء	:	مولانا محمد الحسنی ندوی
.11	اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء	:	ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی
.12	ندوۃ العلماء ایک تعلیمی تحریک	:	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
.13	ندوی فضلاء کی قرآنی خدمات	:	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
.14	ندوۃ العلماء کا فکری و ملی شعور	:	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
.15	ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج	:	منور سلطان ندوی

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 12: تعلیمی ادارے: جامعہ نظامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 مؤسس جامعہ نظامیہ کی مختصر سوانح عمری

12.3 بانی جامعہ نظامیہ کی علمی، قلمی، تجدیدی اور اصلاحی خدمات

12.4 جامعہ نظامیہ کا قیام

12.5 جامعہ نظامیہ کے چند مشاہیر علماء

12.6 قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تاریخی پس منظر

12.7 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام وترقی کے مختلف ادوار

12.8 قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض ومقاصد

12.9 اردو زبان کی ترویج واشاعت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ

12.10 ملک کی تعمیر وترقی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کردار

12.11 اکتسابی نتائج

12.12 نمونہ امتحانی سوالات

12.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

12.0 تمہید

اعلی تعلیمی اداروں میں علوم و فنون اور صلاحیتوں و مہارتوں کو فروغ دینے، تعلیمی وسائل کو متحرک کرنے اور متنوع آبادی کے لیے سیکھنے کے مواقع فراہم کرنے کی منفرد صلاحیت ہوتی ہے۔ اعلی تعلیم ایک عظیم ثقافتی و سائنسی ورثہ ہے جو فرد کی ہمہ جہت ترقی، معاشی خوشحالی اور بہتر مستقبل کا ضامن ہوتی ہے۔ اقتصادی، تکنیکی اور سماجی تبدیلی کو پروان چڑھانے میں بھی اعلی تعلیم کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اعلی تعلیم طلباء و طالبات میں تحقیق و اختراع کے جذبات کو ابھارنے میں انتہائی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے اور دور جدید کے تقاضوں کے مطابق درکار صلاحیتوں اور مہارتوں سے طالب علم کو آراستہ کرتی ہے۔ اعلی تعلیم کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت ہند نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اعلی معیار کے غیر ملکی تعلیمی اداروں کے ساتھ تحقیق / تدریسی تعاون کے تبادلے کی سہولت فراہم کی ہے۔ علاوہ ازیں اقوام متحدہ (یو۔این۔او) کی ایک شاخ اقوام متحدہ تعلیمی، سائنسی و ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے تمام طلباء و طالبات کی اعلی تعلیم تک رسائی کو یقینی بنانے اور اعلی تعلیم کے نظام کو مزید مستحکم بنانے کی غرض سے ممالک کی مستند معلومات اور تکنیکی مدد کے ذریعہ مدد کرتا ہے۔ تمام والدین کی دلی خواہشات ہوتی ہے کہ ان کی اولاد اعلی تعلیم کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہو جائے۔ والدین کے اس خواب کی تکمیل کے لیے صحیح و معیاری ادارے کی فراہمی، نوجوان نسل کی تعمیر و ترقی اور پیشہ وارانہ تکنیکی مہارتوں سے آراستہ کرنے، اعلی تعلیم کی اہمیت و افادیت اور اس کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل علم و دانش، اصحاب اخلاص و فکر اور ملت کا درد رکھنے والے حضرات نے جامعہ نظامیہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی جن میں عالمی معیار کی تعلیم دی جاتی ہے اور طلباء و طالبات کو مہذب، باکمال اور مشینوں سے زیادہ ذہین اور کارآمد بنایا جاتا ہے۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء و طالبات لوگوں میں شہری اور اخلاقی اقدار و شعور کو بیدار کرکے انہیں ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے پر ابھارتے ہیں اس طرح وہ وطن عزیز ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں بھی کلیدی کردار ادا کررہے ہیں۔

12.1 مقاصد

- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء و طالبات کو بانی جامعہ نظامیہ کے احوال و کوائف سے واقفیت حاصل ہوگی۔
- اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء و طالبات کو بانی جامعہ نظامیہ کے علمی، قلمی، تجدیدی اور اصلاحی کارناموں سے آگاہی ہوں گے۔
- اس اکائی کو پڑھنے سے جامعہ نظامیہ کے مشاہیر علماء اور ان کی خدمات کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔
- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء و طالبات کو قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاریخی پس منظر سے واقفیت حاصل ہوگی۔
- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلباء و طالبات جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات سے روشناس ہوسکیں گے۔

12.2 مؤسس جامعہ نظامیہ کی مختصر سوانح عمری

جامع الکمالات اتالیق سلاطین آصفیہ شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ الفاروقی چشتی قادری حیدرآبادی (1264۔1336ھ) نور اللہ مرقدہ کی ولادت بتاریخ 4/ربیع الثانی 1264ھ بمقام قندھار ضلع ناندیڑ میر عدل حضرت ابو محمد شجاع الدین فاروقیؒ (1225۔ 1288ھ) کے گھر ہوئی جو دینی جذبہ سے سرشار خالص علمی گھرانا تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب 40 واسطوں سے خلیفہ دوم امیر المومنین حضرت سیدنا عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کابل کے روسائے شہر حضرت شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ کابلی الفاروقیؒ (1164۔1241ء) کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی اور اعلی تعلیم مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنویؒ (1209۔1285ھ)، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھنویؒ (1264۔1304ھ)، مولانا فیاض الدین اورنگ آبادیؒ، مولانا شیخ عبداللہ یمنیؒ اور مولانا حافظ امجد علیؒ جیسے جلیل القدر علماء اعلام سے حاصل کی۔ آپ نے اپنے تمام علوم و کمالات کا استعمال قوم و ملت کی صلاح و فلاح کے لیے کیا۔ آپ ایک متدین، خلیق، صاحب استقامت، صاحبِ بصیرت، صاحب دعوت و ارشاد باخبر مصلح، پیکر خلوص، صاحب تصانیف کثیرہ بزرگ اور اعلی پیمانے کے منتظم تھے۔ بقول پروفیسر نثار احمد فاروقیؒ "یہ سلطنت آصفیہ کی خوش نصیبی تھی کہ آخری صدی میں یہاں حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ کا ظہور ہوا جن کی محبوب محترم شخصیت کمالات کا مجموعہ ہے، وہ مفسر و محدث بھی ہیں، فقیہ اور اصولی بھی، متکلم اور فلسفی بھی ہیں، مصلح و مجدد بھی وہ ادیب و انشا پرداز بھی ہیں، شاعر بھی، مورخ اور سیرت نگار بھی معلم اور مربی بھی، واعظ اور خطیب بھی ہیں، مناظر اور منطق بھی۔ آپ تقوی و طہارت اور فراست و تدبر کے باعث نہ صرف عامۃ المسلمین میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے بلکہ معاصر علماء کرام میں بھی ممتاز و منفرد مقام کے حامل تھے۔

بانی جامعہ نظامیہ کا سلسلہ بیعت اپنے والد گرامی حضرت ابو محمد شجاع الدین قندھاریؒ کے واسطہ سے عہد سکندر جاہ آصف جاہ سوم (1180۔1218ھ) کے ممتاز و معروف صوفی حضرت شاہ رفیع الدین قندھاریؒ سے ملتا ہے۔ جب آپ 1294 ہجری میں پہلی دفعہ بغرض ادائیگیٔ حج حجاز مقدس تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات شیخ العرب والعجم مولانا احمد حسین شاہ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (1229۔1317ھ) سے ہوئی۔ آپ اس صوفی کامل کی انسان دوستی صفت سے بے حد متاثر ہوئے اور آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ پیر و مرشد کی نکتہ رس نگاہوں نے شیخ الاسلامؒ کی ظاہری خوبیوں اور باطنی محاسن کے باعث آپ کو خلافت کے لیے چن لیا۔ 1301ھ، 1304ھ میں بالترتیب شاہی خطاب کے حصول اور زوجہ محترمہ کے وصال کے بعد حج کا ارادہ فرمایا۔ چوتھا اور آخری سفر حج آپ نے 1308ھ میں کیا۔ اس طرح آپ کو چار مرتبہ حج بیت الشریف کا شرف حاصل ہوا منجملہ ان کے ایک حج آپ نے اپنے تلمیذ رشید اور بانی اسلامیہ کالج ورنگ شاہ سید محمد حسینی القادری الملتانیؒ مرید حضرت شاہ سید پیر حسینی القادری الملتانی محققؒ و خلیفہ حضرت شاہ سید عبدالرحیم حسینی القادری الملتانی خادمؒ کے ہمراہ ادا فرمایا۔ آپ نے 1287ھ میں ملازمت سے مستعفی ہو کر درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے اور تقریباً پچاس سالوں (1287ھ سے 1336ھ تک) تک تشنگان علم کی پیاس بجھانا آپ کا اہم مشغلہ رہا۔ باہمت اور باذوق طلبہ کی روحانی تسکین کے لیے آپ مغرب سے نصف شب تک 560 ابواب پر مشتمل "فتوحات مکیہ" کا درس دیا کرتے اور اپنے فیوض باطنی سے

اربابِ طریقت کو بہرہ ور فرماتے۔

فتوحات مکیہ کے مصنف دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی بزرگ الشیخ الاکبر حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ(560۔637ھ) ہیں جنہوں نے سب سے پہلے وحدت الوجود کا تصور پیش کیا تھا۔ بانی جامعہ نظامیہ کے مشہور تلامذہ میں آصف سادس نواب میر محبوب علی خاں، آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں، حضرت علامہ مفتی رکن الدینؒ، حضرت علامہ سید ابراہیم ادیب رضویؒ، محدث دکن حضرت سید عبداللہ شاہ نقشبندی قادریؒ، حضرت علامہ مفتی محمد رحیم الدینؒ، حضرت مفی سید محمود صاحبؒ، حضرت مفتی سید شاہ احمد علی صوفی قادریؒ، حضرت علامہ نذر محمد خانؒ، مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوریؒ، حضرت سید شاہ محمد حسینی القادری الملتانیؒ، حضرت قاضی میر محمد انور علیؒ اور حضرت مولانا سید محمد حسین نقشبندیؒ قابل ذکر ہیں۔ بانی جامعہ نظامیہؒ مصنف، مصلح، مجدد، وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ معانی کو وسعت دینے، ذہن کو تسخیر کرنے، نغمگی کی تاثیر رکھنے اور دلوں کو جکڑنے کی خوبی کے باعث بانی جامعہ نظامیہ نے اپنے جذبات و احساسات، افکار و خیالات اور مشاہدات و تجربات کے اظہار کے لیے فن شاعری کا استعمال بھی فرمایا اور بزبان عربی، فارسی، اُردو متعدد شعر رقم فرمائے۔ ہندوستان کے شاہان وقت کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اکثر اہل علم و فضل، ارباب فکر و دانش کی قدردانی کرنے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی غرض سے ان مبارک ہستیوں کو مختلف خطابات سے سرفراز کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی دینی، علمی، قلمی، دعوتی، تحقیقی، سماجی، معاشرتی، اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کو سراہتے ہوئے پہلے آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں غفران مکاں (1866۔1911ھ) نے جشن تخت نشینی کے پر مسرت موقع پر 1301ھ میں آپؒ کو "خان بہادر" کا اور پھر بعد میں آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں (1886۔1967ھ) نے اپنی سالگرہ کے موقع پر 1335ھ میں آپؒ کو "نواب فضیلت جنگ" کا خطاب دیا۔ آپ کو دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ آپ کا وصال بعمر 72 سال جمادی الثانی 1336ھ کے ہلال طلوع ہونے کے وقت ہوا اور نماز جنازہ بعد نماز ظہر مکہ مسجد میں ادا کی گئی۔ آپ کی وصیت کے مطابق تدفین احاطہ جامعہ نظامیہ میں عمل میں آئی۔ آپ کی آخری آرام گاہ آج بھی مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ آپ کی مزار اقدس پر آصف سابع نے گنبد تعمیر کی۔

12.3 بانی جامعہ نظامیہ کی علمی، قلمی، تجدیدی اور اصلاحی خدمات

بانی جامعہ نظامیہ کو علوم قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت، منطق، فلسفہ، کلام اور عقائد میں ید طولی حاصل تھا۔ اسی باعث آپ کا شمار ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی اُن معروف ترین علمی شخصیات میں ہوتا ہے جن کے رشحات قلم اور علوم اسلامیہ کی مستقل نشر و اشاعت سے چمنستانِ علم کی بہار تا صبح قیامت قائم رہے گی۔ آپ اپنے شاگردوں کو نوافل کی ادائیگی سے زیادہ کتب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دلاتے تھے چونکہ نوافل کی ادائیگی میں فرد کا شخصی فائدہ ہوتا ہے جبکہ کتب بینی کے شوق سے انسان اپنے کردار کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی تقدیر سنوار سکتا ہے۔ آپ نے کتب خانہ آصفیہ اور دائرۃ المعارف کے قیام میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے جس کے باعث حیدرآباد کو علمی و ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ حجاز مقدس میں قیام کے دوران آپ نے زائد 22 کتب حدیث کا مجموعہ جسے دنیائے حدیث شریف کا عظیم و بے نظیر انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا ہے یعنی 8 جلدوں پر مشتمل "کنزل العمال" کی نقول ہزاروں کے صرفہ سے حاصل کی اور دائرۃ

المعارف سے طبع کرواکر عالم اسلام پر عظیم احسان فرمایا۔ آپ اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود قلمی سفر بھی جاری رکھا اور مختلف عناوین کے تحت معرکۃ الآراء کتب تصنیف و تالیف فرمائی جنہیں شہرت دوام حاصل ہوا۔ آپ کے علمی و قلمی فیضان سے اقطاع عالم مستفید و مستفیض ہو رہا ہے۔ حقائقِ دین کے تحفظ میں ذوقِ تخلیق اور جذبۂ تحقیق سے مملو آپ کی قلمی خدمات اہل تحقیق کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گی۔ بانی جامعہ نظامیہ نے احقاق حق و ابطال باطل کے لیے قلمی جہاد فرمایا اور متنوع موضوعات پر انوار احمدی، مقاصد الاسلام (گیارہ حصے)، حقیقۃ الفقہ (دو حصے)، انوار اللہ الودود، مسئلۃ الربوا، خدا کی قدرت، شمیم الانوار، بشری الکرام فی عمل المولد والقیام، انوار الحق، افادہ الافہام (دو حصے)، منتخبہ من الصحاح، (قلمی) تلخیص فتوحاتِ مکیہ (قلمی)، خلق افعال، کتاب العقل، انوار التمجید فی ادلۃ التوحید، الکلام المرفوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع، انوار اللہ الودود فی مسئلۃ وحدۃ الوجود جیسی شاہکار تصنیفات تخلیق فرمائی۔

ہر زمانہ میں ایسی نابغہ روزگار شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جو دین و ملت کی اصلاح و تربیت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیتی رہی ہیں۔ مصلح کی سیرت و کردار میں جن عوامل و عناصر کو از حد ضروری سمجھا گیا ہے ان میں علم و دانشمندی، عمل و پرہیز گاری، حسن نیت و صفائے قلبی، استقلال و قوتِ ارادی، فراست و جرأت مندی، شفقت و مہربانی، تقویٰ و خوش اخلاقی، خیر خواہی و بھلائی، خلوص و کیفیتِ استغنائی، وضعداری و بلند ہمتی، تہذیب و تمدن کا علمبردار و حامل شرف انسانی، عزیمت و جاں فروشی، جذبۂ ایثار و قربانی، وسیع النظر و فارغ البالی، دور اندیشی و مستقبل شناسی، جامع علوم عقلی و نقلی اور رعب و جلالت ایمانی کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بہت کم مصلحین ایسے گزرے ہیں جن کے کردار میں یہ تمام صفات پائی گئی ہوں۔ جن عبقری شخصیات اور نابغۂ روزگار ہستیوں میں مذکورہ بالا صفات بدرجہ اتم پائی گئیں ان میں ایک نام شیخ فاضل علامہ مولانا امام شاہ محمد انوار اللہ فاروقی خان بہادر فضیلت جنگؒ کا ہے۔ آپ کا مقصد وحید اصلاح امت تھا آپ نے پست ذہنیت اغیار کی کج فہمیوں کو اجاگر کرنے اُن کی تضلیل و تکفیر کیے بغیر انتہائی شائستگی، سنجیدگی اور متانت سے مسکت جواب دینے کو ہمیشہ ترجیح دی۔

آصف سابع میر عثمان علی خان نے بانی جامعہ نظامیہ کو عذر خواہی کے باوجود 1321ھ میں محکمہ امور مذہبی میں کلیدی عہدوں (بشمول ناظم امور مذہبی، صدر الصدور صوبہ جات دکن) پر مامور کیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اس محکمہ میں کئی اصلاحات نافذ کیں اور دیگر اہم اور نہایت مفید خدمات انجام دیں۔ آپ کے فتاوی ساری مملکت آصفیہ میں نافذ العمل تھے۔ مسلم معاشرے سے عیش و عشرت، فسق و فجور کی وبا کو دور کرنے کے لیے مجاہد اعظم اور مصلح کبیر حضرت بانی جامعہ نظامیہ نے امور مذہبی کے اعلی ترین عہدوں پر فائز ہونے کی حیثیت سے حکومت وقت کو تحفظ آداب اسلام و پابندی احکام شرعیہ کی غرض سے معروضات و سفارشات پیش کرتے ہوئے متعدد اہم مذہبی اصلاحات نافذ کروانے میں اہم کردار ادا کیا جن میں دیہات و قصبات میں مقیم مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاق کی درستگی کے لیے تعلیم یافتہ افراد اور ہر ضلع کے لیے ایک سرکاری واعظ کا تقرر، اوراق متبرکہ کی بے حرمتی کی ممانعت شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مہر کا واضح ذکر نہ ہونے کی وجہ سے زوجین کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھی اور ان کی ازدواجی زندگی کا سکون اختلافات کی نذر ہو جاتا تھا اس خامی کو دور کرنے کے لیے نکاح نامہ کی اجرائی، رمضان المبارک کے احترام میں ہوٹلوں پر پردے ڈالنے کا لزوم، سجادگان کے لیے علاحدہ نصاب کی

ترتیب، اولیاء وصلحاء کے تقاریب اعراس میں ہونے والی خرافات و دیگر رسومات قبیحہ کا انسداد، نظام قضاءت کو استحکام بخشنا، مرد حضرات کے زنانی لباس زیب تن کرنے کو جرم قرار دینا بھی آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی بین دلیل ہیں۔

12.4 جامعہ نظامیہ کا قیام

تمام عمر عبادت و ریاضت میں گزارنے اور دنیاوی معاملات سے احتراز کرنے والے عالم ربانی، غزالی دوراں حضرت شیخ الاسلام حافظ امام انوار اللہ فاروقی قدس سرہ العزیز نے محض 28 سال کی عمر میں علوم نبوت کی اشاعت اور امت مرحومہ کے نوجوانوں کو ناخواندگی، پسماندگی اور درماندگی کی تاریکیوں سے نکال کر علوم وفنون کی بلندیوں پر پہنچانے کے لیے توکل، اخلاص اور تقوی کی بنیاد پر شہرۂ آفاق دانشگاہ علم و عرفان، اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ، اسلامی تہذیب و تمدن کا ترجمان جامعہ نظامیہ کا قیام بتاریخ 19 / ذی الحجہ 1292ھ عمل میں لایا جہاں طلباء کے لیے قیام و طعام اور اساتذہ کے لیے ہر قسم کی سہولیات کا بھرپور خیال رکھا گیا تاکہ وہ دنیاوی افکار سے بے نیاز ہو کر پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اسلامی علوم پر خاص توجہ مرکوز کر سکیں۔ جامعہ نظامیہ کے علمی فیضان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نظام ہفتم میر عثمان علی خان جامعہ نظامیہ کے موقر بانی حضرت شیخ الاسلامؒ کے وصال فرمانے کے بعد تعزیتی فرمان مورخہ 15 / اپریل 1918ء کے ذریعہ حضرت شیخ الاسلامؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے ترویج علوم دینیہ کے لیے مدرسہ نظامیہ قائم کیا تھا، جہاں اکثر ممالک بعیدہ سے طالبان علوم دینیہ آکر فیوض و معارف و عوارف سے متمتع ہوتے ہیں۔" جامعہ نظامیہ سے نہ صرف حیدرآباد، ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک (بشمول سمرقند، بخارا، بدخشاں، افغانستان اور عالم عرب) کے تشنگان علم سیراب ہوتے رہے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے 1322ھ میں ایک کتب خانہ بنام "امداد المعارف" قائم فرمایا جسے اب کتب خانہ جامعہ نظامیہ کہا جاتا ہے۔ جامعہ نظامیہ کے کتب خانہ میں اسلامیات کے مختلف موضوعات پر ایک لاکھ کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی، اور اُردو کے ڈھائی ہزار نایاب ونادر مخطوطات بھی محفوظ و موجود ہیں۔ اسی طرح جامعہ نظامیہ کا قدیم نام بھی مدرسہ نظامیہ تھا۔

علماء کرام کی تحریک و تجویز پر 19 / ذی الحجہ 1354ھ میں مدرسہ نظامیہ کو جامعہ نظامیہ سے موسوم کیا گیا۔ جامعہ نظامیہ کی بقا اور ترقی میں آصف سابع کی شاہی سرپرستی کا بڑا دخل رہا ہے چونکہ آصف سابع نے تخت نشینی کے اندرون ایک سال فرمان مورخہ 26 ذی الحجہ 1383 / 4 مئی 1912 کے ذریعے اپنے استاد محترم کے مدرسہ "مدرسہ نظامیہ" کے لیے دو ہزار روپے ماہانہ کی امداد منظور کی۔ آصف سابع نے بذریعہ فرمان مورخہ 19 شوال 1336 / 28 / جولائی 1918 احکام صادر کیے کہ حکومت کی جانب سے پندرہ بیس ہزار روپے کی لاگت سے مدرسہ نظامیہ کے لیے عمارت تعمیر کی جائے۔ علاوہ ازیں آصف سابع نے اس جامعہ کے دار الاقامہ، جماعتوں، کتب خانہ، دفتری عمارت کی تعمیر نو کے لیے 2،25،000 روپیہ منظور کیے۔ اور اس جامعہ کی تنظیم نو میں خاصی اور شخصی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ امورِ مذہبی کی تحریک پر آصف جاہ سابع نے بذریعہ فرمان 19 / ربیع الاول 1367 / 21 جنوری 1948 جامعہ نظامیہ کے نام (3) لاکھ سالانہ اور (2) لاکھ امداد کو منظوری دی۔ آصف جاہ سابع نے مختلف فرامین کے ذریعہ مدرسہ نظامیہ کے طالب علموں کو تعلیمی وظیفہ جاری کیا، مدرسہ کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا، یہاں کے مدرسین کی بیواؤں کے لیے مالی مدد و اعانت فرمائی۔ جامعہ نظامیہ کے سند یافتہ طلبا کو سرکاری ملازمت کا

استحقاق دینے کی ایک عرضی مولانا انوار اللہ خانؒ نے پیش کی۔ اس معروضے پر ماہرین کی رائے حاصل کرنے کے بعد آصف سابع نے فرمان مورخہ 2 ذی قعدہ 1336 / 10 اگست 1918 کے ذریعہ حکم دیا کہ مدرسہ نظامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو اپنی اپنی لیاقت کی مناسبت سے سرکاری خدمات پانے کا حق حاصل رہے گا۔ 1328ھ میں جامعہ نظامیہ میں دار الافتاء قائم ہوا۔ مفتی کے عہدہ جلیلہ پر سب سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے تلمیذ رشید ایوان علم و فقہ کے تاجدار حضرت علامہ مفتی محمد رکن الدین قادریؒ فائز ہوئے اور 1337ھ تک آپ مسند افتا پر متمکن رہتے ہوئے دار الافتا کو زینت بخشی۔ آپ کی جانب سے تحقیق و تفحص کے بعد صادر کیے گیے مستند و مدلل فتاوی کو ادارے مجلس اشاعت العلوم نے "فتاوی نظامیہ" کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ جامعہ نظامیہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا انتہائی قدیم اور قابل تعظیم ادارہ ہے۔ جہاں کے علماء، فقہاء، صلحاء، قراء، اُدباء، شعراء، خطباء، اطباء، حکماء، مفسرین، محدثین، مفکرین، مصنفین، مبلغین، محققین، مصلحین، مورخین، قائدین پوری دنیا میں اپنی خاموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسی باعث سرزمین دکن کو پورے اقطاع عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ آپ کی یہ عظیم یادگار جامعہ نظامیہ عصر حاضر میں مسلمانان عالم کے لیے علم و فضل اور بحث و تحقیق کا مینار بن چکی ہے۔ جامعہ نظامیہ کے علاوہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے علوم دینیہ کے فروغ و اشاعت کے لیے مختلف ریاستوں بشمول تلنگانہ، راجستھان، مہاراشٹرا، کرناٹک میں کئی مدارس اور اداروں کا قیام عمل میں لایا تھا۔

12.5 جامعہ نظامیہ کے چند مشاہیر علماء

مشرقی علوم کے مرکز جامعہ نظامیہ سے فارغ التحصیل مشاہیر علماء کی فہرست بہت طویل ہے جس میں مولانا مفتی رکن الدینؒ، مولانا مفتی رحیم الدینؒ، ڈاکٹر عبدالحقؒ، مولانا سید ابراہیم ادیب رضوی، مولانا سید محمد پادشاہ حسینیؒ، مولانا عبدالواحد اویسیؒ ایڈوکیٹ، مولانا قاری محمد عبدالباریؒ، مولانا مفتی اشرف علی اشرفؒ، مولانا مفتی سید مخدوم حسینیؒ، حضرت شاہ محمد شطاریؒ، محدث کبیر مولانا عبدالوہاب عندلیبؒ، مولانا مفتی مخدوم بیگؒ، شہنشاہ رباعیات سید احمد حسین امجد حیدرآبادی، حضرت صفی اورنگ آبادی، مفتی عبدالحمیدؒ، حضرت علامہ سید طاہر رضوی قادریؒ، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ، مفتی حافظ محمد ولی اللہ قادریؒ، مفتی ابراہیم خلیل الہاشمیؒ، مولانا الطاف حسین فاروقیؒ، مولانا سید حبیب اللہ قادری رشید پاشاہؒ، مفتی عبدالقدوس نظامیؒ، مولانا ابو القاسم شاہ سید عبدالوہاب حسینی القادری الملتانیؒ وغیرہ شامل ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے چند مشاہیر علماء جامعہ نظامیہ کے تذکرات کو سپرد قلم کیا جارہا ہے جو حسب ذیل ہیں:

1. محدث دکن حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحبؒ (1292-1384 / 1875-1964)

قرآن مجید کی قولی توضیح و تشریح اور اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ و منبع حدیث نبویؐ ہے۔ نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کو تدریساً، تقریراً، یا تحریراً لوگوں تک پہنچانا کسی بھی مسلمان کے لیے بہت بڑی سعادت مندی کی بات ہے۔ محدثین کرام کی زندگی کا اہم مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دن رات علوم احادیث سے لوگوں کے قلوب و اذہان کو روشن و منور کرتے رہتے ہیں انہی درخشندہ ستاروں میں سے ایک زبدۃ المحدثین محدث دکن ابو الحسنات حضرت سید عبداللہ شاہ نقشبندی مجددی قادریؒ ہیں۔ جو برصغیر ہند و پاک کے مایہ ناز اور ہمعصر علمائے حدیث میں اپنی علمی کمالات، دینی وجاہت، حسن صورت و سیرت اور مجاہدانہ کارناموں سے منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ علم حدیث کے

شہسوار محدث دکن کا شمار شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقیؒ کے لائق وفائق تلامذہ اور ان غیر معمولی مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے علم حدیث میں چار چاند لگائے ہیں۔ ایسی مبارک ہستیاں صدیوں میں کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ آپ عربی، فارسی اور اُردو میں ید طولی رکھتے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان بالخصوص دکن میں علم حدیث کی نشر و اشاعت کے حوالے سے صف اول کے محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ نے علم حدیث کے فروغ میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے اور برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کی تدریس و تعلیم و تصنیف و تالیف کے رواج کو عام کرتے ہوئے علم حدیث کے چراغ کو جلائے رکھا۔ آپ کی علمی شان و جلالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تذکرہ محدث دکن کے مصنف حضرت ابو الفدا عبدالستار خان نقشبندی مجددی قادریؒ (1342-1433/1924-2012) لکھتے ہیں: عالم ربانی، فقیہ دوراں حضرت مولانا محمود شاہ قادری حنفی معروف بہ ابو الوفاء افغانیؒ (1310-1395/1892-1975) نے مجھے بتایا کہ بلاشبہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے حضرت ابو الحسنات کی صورت میں مرشد کامل میسر ہے۔ بصورت دیگر مجھے شیخ کامل کی تلاش میں سفر کرنا پڑ سکتا تھا۔ آپ نے بتائید غیبی پانچ جلدوں پر مشتمل "زجاجۃ المصابیح" تصنیف فرمائی جو حدیث شریف کی مشہور و معروف، مقبول و مستند اور معتبر و متداول کتاب ہے اور احناف کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ 6634 احادیث کا یہ خوبصورت مجموعہ نہ صرف علماء، دعاۃ اور طلبہ کے لیے مفید ہے بلکہ عوام بھی اس سے بھرپور استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا کام تھا جس کی تکمیل فرماکر محدث دکنؒ نے حدیث رسول کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس شاہکار تصنیف کو اللہ تعالی نے قبولیت عامہ نصیب فرمائی اور علماء نے سالہاسال سے جامعہ نظامیہ میں داخل نصاب کیا ہے۔ اس کتاب کے درس کو مولانا ابو الوفاء الافغانیؒ نے جاری فرمایا۔

تمسک بالحدیث، عمل بالسنت، مشتغل بالحدیث اور علم حدیث میں گراں قدر خدمات انجام دینے کے باوصف علماء اور عوام الناس حضرت مولانا سید عبداللہ شاہ صاحبؒ کو محدث دکن کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ذی اکرام مولف نے مسائل کے لحاظ سے احناف کے اثبات میں احادیث نبوی کا یہ بہترین مجموعہ بنام "زجاجۃ المصابیح" اسی طرح مرتب کیا ہے جس طرح علامہ محمد بن عبداللہ خطیب تبریزیؒ (المتوفی 741/1340) نے شوافع کے لیے 5594 احادیث پر مشتمل ایک جامع ذخیرہ بعنوان "مشکوٰۃ المصابیح" مرتب کیا تھا۔ زجاجۃ المصابیح کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ (80-150/699-767) کے اقوال اور بیان کردہ فقہی مسائل حدیث شریف سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ زجاجۃ المصابیح کی تالیف کے دوران حضرت محدث دکنؒ نے جن امور کا التزام فرمایا وہ حسب ذیل ہیں: (i) صحیح بخاری کے طرز پر ہر بڑے عنوان کے بعد متعلقہ آیات قرآنی کا حوالہ درج کیا ہے، (ii) زجاجۃ المصابیح کی تبویب و تدوین گرچہ مشکوۃ شریف کے نہج اور طرز پر کی ہے لیکن اختلافی مقامات پر وہی احادیث لائے ہیں جن سے احناف استدلال کرتے ہیں، (iii) ہر فقہی مسئلہ سے متعلق تمام احادیث کو ایک ہی مقام پر بیان کردیا ہے، (iv) ہر مسئلہ میں مُفْتَی بِہٖ قول کی تائید کرنے والی احادیث کو درج کیا ہے، (v) بعض اہم مسائل کی وضاحت کے لیے مفید حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔ ملک شام کے ممتاز عالم دین علامہ عبدالفتاح ابو غدۃؒ (1336-1417/1918-1996) نے حج کے موقع پر زجاجہ کی پہلی جلد ملاحظہ فرمائی تو حضرت مصنف کو مکتوب ارسال کیا جس میں انہوں نے لکھا: "مجھے یہاں حضرت والا کی تصنیف منیف زجاجۃ المصابیح کی جلد اول دستیاب ہوئی جس کی وجہ سے میری بصر اور بصیرت

دونوں روشن ہو گئے، اللہ تعالی نے آپ کو اس بیش بہا نعمت سے جو نوازا ہے اس پر میں نے اللہ تعالی کا شکر ادا کیا، اللہ تعالی آپ کو اس کارِ خیر پر اسلام اور حضرات احناف کی طرف سے جزا خیر عطا فرمائے۔" عربی تصنیف زجاجۃ المصابیح کے علاوہ اُردو زبان میں لکھی گئی آپ کی دیگر تصنیفات و تالیفات کو بھی سند کا درجہ حاصل ہے۔

2. فقیہ الاسلام حضرت مولانا محمود شاہ قادری حنفی معروف بہ ابو الوفاء افغانیؒ (1310-1395/1892-1975)

اسلامی علوم میں علم فقہ کو خاص اہمیت حاصل ہے چونکہ یہ مختلف شعبہ ہائے حیات بشمول مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی کو محیط ہے۔ اسلامی علوم بالخصوص فقہ حنفی پر چودھویں صدی ہجری کے عظیم محدث، فقیہ، محقق، عالم دین اور جامعہ نظامیہ کے قابل سپوت حضرت مولانا ابو الوفاء الافغانیؒ کی عمیق اور وسیع نظر تھی۔ آپ کا شمار محققین، محدثین، فقہاء اور صاحب فضل و کمال شخصیات میں ہوتا ہے۔ اہل علم و اہل قلم نے حضرت علامہ ابو الوفاء الافغانیؒ کی خدمات حدیث کا برملا اعتراف کیا ہے۔ آپ کا گھر ہمیشہ کتابوں، مسودات، اور تحریروں سے مملو رہتا۔ آپ ازہر ہند جامعہ نظامیہ میں شیخ الفقہ کے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی فقہ حنفی کی ترویج کے لیے وقف کر دی تھی۔ دکن کے علاقہ میں فقہ حنفی کی تحقیقات و تعلیقات اور ترویج و اشاعت پر بہت بڑا اور عظیم کام ہوا۔ اس عظیم مقصد کے لیے حضرت مولانا ابو الوفاء الافغانیؒ نے علماء مجلس کے تعاون سے سن 1348/1929 میں "مجلس احیاء المعارف النعمانیہ" کی داغ بیل ڈالی جو آپ کی علمی زندگی کا عظیم الشان یادگار کارنامہ ہے۔ مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کا اہم مقصد ائمہ احناف بالخصوص امام اعظمؒ، امام یوسفؒ (120-182/738-798) اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ (131-189/749-805) کی تصنیفات کو تعلقیات و مقدمات کے ساتھ شائع کرنا تھا۔ عالم اسلام کے بلند پایہ محدثین، فقہاء اور محققین جیسے مولانا انور شاہ کشمیریؒ (1875-1933)، مولانا یوسف بنوریؒ (1908-1977)، مولانا مفتی مہدی حسنؒ (1884-1976)، مولانا عبد الرشید نعمانی (1916-1999) اور علامہ زاہد الکوثری (1898-1952) اس ادارہ کے ارکان مقرر ہوئے۔

آپ نے فقہ حنفی پر لکھی گئی کتابوں جیسے ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامۃ الطحاویؒ (229-331/844-942) کی 'مختصر الطحاوی'، امام قاضی ابو یوسفؒ کی 'کتاب الآثار'، کتاب 'اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلی'، اور 'الرد علی السیر الاوزاعی'، امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی 'الزیادات' (دو جلدیں)، 'الحجۃ علی اہل المدینہ' (چار جلدیں)، امام بخاریؒ (195-257/810-870) کی 'تاریخ الکبیر' (تیسری جلد)، ابو بکر احمد بن عمرو بن مھیر الخصاف (المتوفی 261/875) کی 'النفقات'، امام سرخسیؒ (400-483/1009-1090) کی 'اصول الفقہ'، امام محدث ابو عبد اللہ حسین بن الصمیریؒ (المتوفی 436/1045) کی 'اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ'، امام ذہبیؒ (673-749/1274-1348) کی 'مناقب الامام ابی حنیفہ و صاحبیہ ابی یوسف و محمد بن الحسن'، حافظ محدث محمد بن یوسف صالحی شافعی دمشقی (المتوفی 942/1536) کی عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان پر تحقیقی کام کیا۔ حضرت مولانا ابو الوفاء الافغانیؒ امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی تصنیف منیف "کتاب الاصل" پر تصحیح و تعلیق کا کام کیا جسے دائرۃ المعارف العثمانیہ نے شائع کیا۔ امام ابو حنیفہؒ کی تصنیف "کتاب الآثار لابی حنیفہ" علم حدیث میں تالیف کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو سفؒ نے بھی آپ سے اس کتاب کو روایت کیا ہے۔ البتہ امام

ابو یوسفؒ نے چند احادیث کا اس میں اضافہ کیا ہے۔ یہ نسخہ مولانا ابو الوفاء افغانیؒ کی تحقیق سے طبع ہوا ہے۔ اسی طرح آپ نے امام محمدؒ کی مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق تالیف "کتاب الآثار" پر تقریباً 150 صفحات پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ تحریر فرمایا جو ضخامت میں اصل کتاب سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ اس مقدمہ میں آپ رقمطراز ہیں کہ علم حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین میں نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ تحریر کی جانے والی سب سے پہلی کتاب امام اعظم ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار ہے جس میں ہزار ہا مرفوع و موقوف احادیث شامل ہیں۔ اس مفصل حاشیہ سے متاثر ہو کر انوار الباری شرح صحیح البخاری کے مولف حضرت مولانا احمد رضا بجنوری نقشبندی مجددیؒ پانچویں جلد کے مقدمہ میں حضرت علامہ محدث ابو الوفا صاحب افغانیؒ کو شارح کتاب الآثار امام محمد کے جلیل القدر لقب سے مخاطب کیا ہے۔ اس مقدمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو آپ کے افکارِ ادبیہ اور خیالات عالیہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے اس کتاب پر ایسا معلومات آفریں حاشیہ بھی تحریر فرمایا جو متقدمین کی کتب سے بہت ہی گراں قدر ہے۔

حضرت مولانا ابو الوفا الافغانیؒ کی رہنمائی میں عظیم ادارہ 'مجلس احیاء المعارف النعمانیہ' سے جو کتابیں شائع ہو کر منصہ شہود پر آئیں وہ حسب ذیل ہیں: (1) اصول السرخسی، (2) کتاب النفقات، (3) کتاب الحجۃ، (4) کتاب الآثار للامام محمد، (5) کتاب النکت، (6) المختصر للطحاوی، (7) عقود الجمان، (8) اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلی، (9) الرد علی سیر الاوزاعی، (10) کتاب العالم والمتعلم، (11) الجامع الکبیر للامام محمد، (12) مناقب الامام ابی حنیفہ، (13) شرح الزیادات۔ اس طرح آپ نے فقہ حنفی پر بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے جو آنے والے زمانے میں علماء، محققین اور اصحاب قلم کے لیے راہ کشا ثابت ہو گا۔ آپ کی اس گراں قدر خدمات کے پیش نظر بعض علماء آپ کو ابو حنیفہ ثانی کہتے ہیں۔ آپ نے فن تجوید و قرأت میں کتاب بعنوان "دلیل القاری علی کلام الباری" تحریر فرمائی۔ آپ کی وفات پر قرآن، حدیث، فقہ، عربی ادب پر گہری نظر رکھنے والے، شارح ترمذی حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں: "مولانا ابو الوفاء قندھاری کی وفات سے ورع و زہد کا ایک پیکر تقوی و خشیت الٰہی کی قوی روح، جہد و سعی کا ایک حیرت انگیز نمونہ، سلف صالحین کی عجیب یادگار، ایک عظیم ترین شخصیت دنیا سے رخصت ہو گئی۔

3. ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (1326-1423/1908-2002)

دینی و عصری تعلیمی اداروں سے وابستہ طلباء و طالبات میں اکثریت ایسے طالب علموں کی ہوتی ہے جو مادر علمی پر فخر کرتے ہیں لیکن ان میں ایسے طلباء و طالبات کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے جن پر خود مادر علمی کو ناز ہوتا ہے چوں کہ وہ لوگ علمی دنیا میں اعلی و منفرد مقام بنا لیتے ہیں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں تاریخی کارنامے انجام دیتے ہیں جن کی نظیر تاریخ انسانیت میں بہت کم ملتی ہے۔ انہی تاریخ ساز اور عظیم عبقری شخصیتوں میں جامعہ نظامیہ و جامعہ عثمانیہ کے نامور سپوت، عالم اسلام کے روشن ستارے، مرد حق آگاہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ کا شمار ہوتا ہے جن کی اذان توحید پر لبیک کہہ کر مغرب کے ہزاروں مریضان کفر نے اپنے باطن کو نہ صرف ضیابار کر کے داخل اسلام ہوئے بلکہ علم و دعوت کی سینکڑوں شمعیں روشن کرنے کا باعث بنے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کو اپنی مادر علمی اور علماء جامعہ نظامیہ سے قلبی و والہانہ لگاؤ تھا۔ پروفیسر عبد الرحمن مومن نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے اساتذہ کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کو جامعہ نظامیہ کے جید

الاستعداد اساتذہ سے استفادہ کا زرین موقع ملا اور ان اساتذہ میں ڈاکٹر صاحب کی سیرت و شخصیت پر سب سے گہرا اثر مولانا ابو الوفا افغانیؒ کا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ڈیڑھ سو خطوط مولانا افغانی کے نام لکھے۔"

آپ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، قدیم و جدید ترکی، روسی بولیوں کے علاوہ مزید 20 زبانوں سے واقف تھے۔ شاید آپ بیسویں صدی کے وہ واحد عالم دین و محقق بے نظیر ہیں جنہیں اس قدر متعدد زبانوں پر ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے زائد از 450 کتابیں اور 937 علمی و تحقیقی مضامین و مقالے تحریر فرمائے ہیں جس سے علمی دنیا آج بھی روشن و منور ہے۔ آپ کی کثیر التعداد تصانیف کے موضوعات کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ آپ نے اسلام کی دعوت و اشاعت، دیگر ادیانِ عالم پر اس کی برتری، فن حدیث پر تحقیق، نیز سیرت نبویؐ بالخصوص اس کے سیاسی پہلوؤں کے حوالے سے گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دیں جو اہل علم بالخصوص محققین کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔ اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت میں آپ کی گراں قدر خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی لکھتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب نے 94 سال کی طویل عمر پائی اور اس کا بیشتر حصہ علم و فن کی خدمت، اسلام کی اشاعت اور تدریس و تحقیق میں گزارا۔ کہنا چاہیے کہ ان کی پوری زندگی علوم اسلامیہ کی حفاظت و اشاعت کے لیے وقف تھی"۔ ڈاکٹر خالد ظفر رندھاوا نے اپنے مضمون میں اس بات کا ذکر کیا کہ "ڈاکٹر حمید اللہؒ اپنی بعض تحقیقات علمیہ کے سلسلے میں مکتبہ محمد پاشاہ کوپرولی (ترکی) میں مصروف کار تھے کہ وہاں پر آپ کو سنن سعید بن منصورؒ (المتوفی 227/842) کا ناقص نسخہ ملا جو کہ مصنف ابن ابی شیبہؒ (159-235/776-850) کے تحت غلط طور پر مندرج تھا آپ نے یہ نسخہ بغرض تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ (1319-1412/1901-1992) کو عنایت کر دیا اور بوقت طبع اس پر ایک قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا جو القسم الاول عن المجلد الثالث صفحات 13 تا 30 پر درج ہے جس میں سعید بن منصورؒ کے حالات زندگی اور تاریخ علم حدیث پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے"۔ آپ نے یونیسکو کے ایک پراجکٹ کے تحت شمس الائمہ السرخسی کی "شرح سیر الکبیر" کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا جسے کافی عرصہ کے بعد ترکی کے ریلیجیس افیرز فاؤنڈیشن نے شائع کیا جب تک آپ کی طبعیت ناساز ہونا شروع ہو چکی تھی۔ عبد اللہ قربان ترکستانی لکھتے ہیں کہ "جو لوگ ترجمہ قرآن، حدیث لٹریچر، سیرت، بین الاقوامی اسلامی قانون، اسلامی سیاست اور اسلام کے تاریخی ورثہ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو نظر انداز نہیں کر سکتے"۔

عوام الناس کے لیے 1363/1944ء میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ نے ضلعی سطح پر لیکچرز کا اہتمام کیا تھا جس کو عثمانیہ یونیورسٹی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس سال ورنگل اورنگ آباد کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اسی سال شہر حیدرآباد میں مسلم لا کے موضوع پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ نے لیکچر دیے۔ "ڈاکٹر صاحب کے لکچر عجیب و غریب ہوتے ان میں نہ غرائب لفظی ہوتی اور نہ شوکت الفاظ، نہ علم کی نمائش ہوتی اور نہ حوالوں کی کثرت وہ اس قدر سادہ اور دلکش انداز میں لکچر دیتے کہ طالب علم کی ناواقفیت کا ہر گوشہ سیر ہو جاتا"۔ تاریخ حدیث پر علمی شواہد اور گہرے تحقیقی منہج کے ساتھ لکھنے کی سعادت ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے حصے میں آئی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہمام بن منبہ (40-131/660-749) کی کتاب "صحیفہ ہمام ابن منبہ" کو تحقیق و تلاش کے بعد شائع کیا جو حدیث میں دلچسپی رکھنے والے علماء کے لیے ایک اہم دریافت ہے۔ چنانچہ آپ نے صحیفہ ہمام بن منبہ کی تلاش و تحقیق اور طباعت کا اہتمام کر کے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا جواب دیا کہ

صحابہ کرام کے دور میں احادیث کی جمع و ترتیب کا کام نہیں ہوا تھا۔ ہمام بن منبہ کی دریافت کے بارے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی (1352-1425/1934-2004) لکھتے ہیں: "یہ اب تک کی دریافت کے مطابق احادیث نبوی کا سب سے قدیم نسخہ ہے"۔ اس کتاب کا شمار حدیث کی اول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ (المتوفی 58/677) نے یہ صحیفہ اپنی شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے تیار کیا تھا۔ محض اس بات کی تصدیق حاصل کرنے کے لیے آپ نے برلن، بیروت اور دمشق کے سفر کیے جس سے آپ کے مزاج تحقیق کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ نے جرمنی کی بون یونیورسٹی سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کو نہ صرف قرآن فہمی، علوم حدیث، سیرت نگاری، تاریخ اسلام پر کامل عبور تھا بلکہ آپ قانون میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کا یہ خیال تھا کہ بین الممالک قانون کی بنیاد ہیوگو گرٹوئس (991-1075/1583-1665)، فرانسسکو ڈی وٹوریا (885-953/1480-1546)، بلیٹاسر ڈی ایالہ (955-992/1548-1584)، فرانسسکو سواریز (955-1017/1548-1617)، البریکو گنتیلی (959-1017/1552-1608) جیسے ماہرین نے سولہویں صدی عیسوی میں رکھی تھی جب کہ تحقیق کے شناور و غواص ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ نے امام زید بن علیؒ (80-120/698/738) کی کتاب المجموع، امام اعظم ابو حنیفہؒ (80-150/699-767) کی کتاب السیر اور محمد بن حسن الشیبانیؒ (132-189/750-805) کی کتاب سیر الکبیر کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ بین الاقوامی قانون کی بنیاد دراصل آٹھویں صدی عیسوی ہی میں مسلمانوں نے رکھ دی تھی۔ اس طرح آپ نے تنگ نظر دانشوروں کی علمی خیانتوں اور عیاریوں پر سے نہ صرف پردہ اٹھایا بلکہ دلائل و براہین کے ذریعہ ان کا مسکت جواب بھی دیا۔ آپؒ کی زندگی کا یہ پہلو تمام مبلغین اسلام کے لیے نمونہ عمل ہے۔ اللہ تعالی کی ذات سے قوی امید ہے کہ مرتب کی یہ گراں قدر خدمت احساس کمتری و تذبذب کی ظلمتوں میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوگی، مسلم نوجوان نسل میں اسلامی علوم سے شغف پیدا کرنے اور قلب و روح کو شوقِ فراواں سے مالامال کرنے میں انتہائی موثر کردار ادا کرے گی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ نے علمی و تحقیقی افکار و افادات کا جو ورثہ چھوڑا ہے اس آثار علمیہ سے تشنگان علم ہمیشہ مستفید و مستفیض ہوتے رہیں گے۔

12.6 قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تاریخی پس منظر

مخالف اسلام استعماری سرگرمیوں کی شدت سے مخالفت اور ملت کے اکابرین و سیاسی تدبر رکھنے والی شخصیات کا ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے اصل محرکات ثابت ہوئے۔ تحریک خلافت میں متوقع کامیابی حاصل ہونے کے بعد 1920ء میں گاندھی جی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے، اپنی حکومت قائم کرنے اور غیر ملکی سامان، برطانوی تعلیمی نظام اور ان کے اداروں کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے تحریک ترک موالات (The Non-cooperation movement) کی تجویز پیش کی جسے جنگ آزادی میں موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ گاندھی جی کا ماننا تھا کہ برطانوی اداروں کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعاون غیر انسانی فعل ہے۔ جلیان والا باغ کے معصوم لوگوں کے قتل عام کی مرتکب برطانوی حکومت کے زیر انتظام

چلائے جارہے کالجوں کے ساتھ بھی تعاون نہ کرنے کی اپیلیں کی گئیں۔ مرادآباد میں 9تا11 اکتوبر1920ء میں منعقدہ ایک کانفرنس میں گاندھی جی نے برطانوی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ لینے کو حرام قرار دیا۔ مولانا آزاد نے کہا جو اشخاص مسلمانوں کے دشمن ہیں ان سے ترک موالات کرنا عین ایمان ہے۔ 12 / اکتوبر1920ء کو گاندھی جی اور علی برداران نے علی گڑھ کالج اسٹوڈنٹس یونین ہال میں طلبہ کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ تحریک عدم موالات میں مسلمانوں نے جوش و خروش کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آزادی کے متوالوں اور جیالوں کے کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کی۔ مولانا شوکت علی نے علی گڑھ سے 1200 طلبہ کو یونیورسٹی خالی کرنے پر آمادہ کیا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلبہ برادری سے اس تحریک میں شمولیت اختیار کرنے کی اپیل کی تو طلبہ نے انگریزی پروفیسروں کا بائیکاٹ کر دیا جس کی وجہ سے یونیورسٹی ایک عرصہ تک بند رہی۔

اُس وقت طلبہ کی تعلیم و تربیت کا نظم بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا اس تحریک کو پروان چڑھانا بالخصوص مسلمان نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چونکہ مسلمان اس وقت تعلیمی لحاظ سے خاصے پسماندگی کا شکار تھے۔ 1905ء میں ہندوستان میں شرح خواندگی افسوس ناک حد تک کم تھی۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ کوئی بھی تحریک، ملک اور قوم وملت اس وقت تک حقیقی ترقی حاصل نہیں کرسکتے جب تک وہ خود کو تعلیم یافتہ نہ بنالیں چونکہ تعلیم اور تعلیمی ادارے کسی بھی تحریک، قوم اور ملک کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اقتصادی ترقی بھی تعلیم ہی کی رہین منت ہوتی ہے لہٰذا حقیقی محب وطن وہی ہوتا ہے جو تعلیم کے ذریعہ وطن عزیز ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کردے۔ تحریک عدم تعاون کے تقاضوں میں سے ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ ہندوستانی بالخصوص مسلمان حکومتی اسکولوں کا بائیکاٹ کریں گے اور اپنے بچوں کو مغربی تعلیمی اداروں کو روانہ کرنے کے بجائے اپنے تعلیمی اداروں میں داخلہ دلوائیں گے جو بیک وقت حکومت سے آزاد بھی ہوں اور قومی و ملی مفادات کا تحفظ کرنے کے پابند بھی۔ اس نازک دور میں ملک و قوم کو مضبوط و مستحکم بنیاد فراہم کرنے کے لیے مسلمانوں پر لازم تھا کہ بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے طرز پر اپنے اعلیٰ اور معیاری تعلیمی ادارے قائم کریں جن کی تحقیقات نے یوروپی ممالک کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ مشترکہ قومیت اور سیکولر اقدار کے حامل بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ یعنی محمود حسن دیوبندی، مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عبدالمجید خواجہ، اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے دوررس وجہاندیدہ مذہبی، سیاسی و سماجی رہنماؤں اور رہبران وطن نے مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل، مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کی کفالت اور ملت کی تعمیر نو کی غرض سے سن1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس نے نہ صرف ہندوستانیوں کی تقدیر کو بدل دیا بلکہ ہندوستانی تاریخ کے دھارے کو بھی موڑ دیا۔ المختصر تحریک آزادی کی پیداوار عظیم ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا وہ پہلا قوم پرست ادارہ ہے جو تحریک خلافت اور تحریک عدم موالات کے باعث معرض وجود میں آیا۔

نومبر1920ء کو مہاتما گاندھی نے حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور علی برادران کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کو خط ارسال کیا اور جامعہ کا انتظام سنبھالنے کی درخواست کی۔ علالت اور دیگر ناقابل بیان وجوہات کی بنا پر علامہ اقبال نے معذرت کا اظہار کیا جس کے بعد اتفاق رائے سے مولانا محمد علی جوہر اس عظیم جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے جبکہ اس کے پہلے امیر جامعہ ہونے کا اعزاز مسیح

الملک حکیم اجمل خاں کو حاصل ہے جنہوں نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ یہ چھوٹا سا پودا بہت جلد ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر جائے گا جس کی شاخیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ مولانا محمد علی جوہر نے شیخ الجامعہ بنتے ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں روزانہ ایک گھنٹہ درس قرآن کا اہتمام و انتظام فرمایا۔ 1924ء میں ناظم دینیات مولانا خواجہ عبدالحئ تفسیر، محمد علی شاہ حدیث و فقہ، مولانا محمد اسلم جیراج پوری سیرت و تاریخ اسلام کا درس دیا کرتے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیگر ممبران میں مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالماجد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا شبیر احمد دیوبندی، سی ایف ایڈریوز اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ جیسی مایہ ناز اور نابغہ روزگار ہستیاں شامل تھیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب جامعہ کے نام سے لفظ اسلامیہ کو حذف کرنے کا شدت سے مطالبہ کیا گیا لیکن مہاتما گاندھی کی شدید مخالفت کے بعد اس مطالبہ کو رد کر دیا گیا۔ گرچہ اس یونیورسٹی کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے لیکن یہ جامعہ اپنے طرز عمل میں انتہائی سیکولر اور گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کو منی انڈیا دیکھنا ہے تو جامعہ کا دورہ کر لے۔ جامعہ کے سیکولر اقدار کا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ نہ صرف اس جامعہ میں مختلف مذاہب اور مختلف افکار و نظریات کے حامل طلبہ زیر تعلیم ہیں بلکہ اس جامعہ کے شعبہ اُردو کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شعبہ ہندی کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر مجیب رضوی نے خدمات انجام دی ہیں۔ جامعہ گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ کیوں نہ ہو جب کہ اس کا خمیر جب گوندھا جارہا تو فرقہ وارانہ مصلحتوں کو خاطر میں لائے بغیر گاندھی جی، علامہ اقبال، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔

12.7 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام و ترقی کے مختلف ادوار

آزادئ ہندوستان سے قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ کا آغاز ایک چھوٹے سے ادارے کے طور پر ہوا۔ 29/اکتوبر 1920ء بروز جمعہ ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کے شہر علی گڑھ کی جامع مسجد میں معروف مجاہد آزادی اور ممتاز عالم دین شیخ الہند مولانا محمود حسن کی رہنمائی میں ہندوستان کی پہلی قومی تعلیمی درسگاہ یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ تمام مذاہب کے لوگ بالخصوص مسلمان یہاں تعلیم حاصل کر سکیں۔ علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ کا روشن باب یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روشن خیال، ترقی پسند اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار اساتذہ و طلبہ کی رہین منت ہے۔ پانچ سال بعد یعنی 1925ء میں اس جامعہ کو شہر علی گڑھ سے قرول باغ نئی دہلی میں واقع کرایہ کے مکانوں میں منتقل کیا گیا۔ اسی سال جامعہ بہت بڑے مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ اس دوران جامعہ سے ہمدردی اور قلبی تعلق رکھنے والے اور جامعہ کے حیاتی ارکان یعنی برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے ڈاکٹر ذاکر حسین، تعلیم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے ڈاکٹر عابد حسین اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے مایہ ناز تاریخ داں پروفیسر محمد مجیب نے محض 100 روپیہ ماہانہ تنخواہ پر جامعہ کی خدمات انجام دینے کے لیے از خود راضی ہو گئے۔ ان حضرات نے 1926ء میں تعلیم بالغاں کو یقینی بنانے کے لیے مسائیہ جماعتوں کو متعارف کروایا۔ 1938ء تک تعلیم بالغاں کا منصوبہ شعبہ کی شکل اختیار کر گیا جسے ادارۂ تعلیم و ترقی کہا جاتا تھا۔ ان اکابرین ملت کی بے لوث خدمات کے باعث جامعہ کی ترقی دیکھ کر ہر شخص کی زبان پر مرزا غالب کے شعر کا یہ مصرعہ ضرور آہی جاتا ہے... ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا۔ ہندوستان کی آزادی تک جامعہ بے شمار مصائب و مشاکل کے باوجود انتہائی جدوجہد کے ساتھ اپنی منزل مقصود

کی طرف گامزن رہا۔ گاندھی جی نے جامعہ کے مالی مسائل کی یکسوئی کے لیے کہا تھا کہ اگر مجھے جامعہ کے لیے کٹورا لے کر بھیک مانگنی پڑی تو میں وہ بھی کروں گا۔ گاندھی جی کی اس بات کا متمول حضرات پر اس قدر اثر ہوا کہ ان حضرات نے دست تعاون دراز کیا اور جامعہ کی مالی دشواریاں ختم ہوئیں۔ مثالی ہندوستان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کی غرض سے قائم کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گاندھی جی کو قلبی لگاؤ تھا اور وہ اکثر خطوط کے ذریعہ ذمہ داران جامعہ سے جامعہ کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ جامعہ کے آرکائیوز میں گاندھی جی کے پانچ (5) خطوط آج بھی موجود ہیں۔ 1928ء میں حکیم اجمل خان کی وفات کے بعد جامعہ دوبارہ مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ جامعہ کی معاشی حالات کو سدھارنے کے لیے اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں جامعہ کے اساتذہ نے یہ عہد کیا کہ ہم محض 150 روپیہ کی تنخواہ پر اگلے بیس سال تک جامعہ کے لیے تدریسی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

یکم مارچ 1935ء میں دریائے جمنا کے کنارے اور جنوبی دہلی کے ایک غیر رہائشی علاقہ اوکھلا میں یہ جامعہ منتقل ہوا جہاں محبین جامعہ کی وقف کردہ اراضی پر نئی عمارتوں کے ساتھ اس جامعہ کا سفر آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ یہ ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل اختیار کر گیا اور یہ نئی بستی جامعہ نگر کہلائی جانے لگی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام بھی اسی ہدف کو پیش نظر رکھتے ہوئے عمل میں لایا گیا تھا تاکہ یہاں طلبہ کے لیے اسکولی سطح سے لیکر اعلی تعلیم تک کا نظم ہو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے ابتدائی ایام میں انتہائی مفلوک الحالی کا شکار تھی جہاں چند خیمے تھے جو بیک وقت طلباء کے لیے درسگاہ اور اساتذہ کے لیے دانشگاہ تھا۔ جامعہ کے فرش پر بیٹھ کر علوم وفنون کے دریا بہائے گئے اور مختلف مضامین کے متنوع نظریات کو حل کیا گیا۔ بانیان جامعہ اور اسلاف کی انتھک کوششوں اور قربانیوں کا ہی ثمرہ تھا کہ انتہائی قلیل عرصے میں یہ جامعہ اعلی تعلیمی ادارے کی شکل اختیار کر گیا اور مختلف کالجوں سے الحاق کی درخواستیں موصول ہونی شروع ہو گئیں۔ چار سال کے انتہائی کم عرصے یعنی سن 1924ء تک جامعہ سے بمبئی، ہردوئی، پونہ، حضرو، گجرات، جھانسی، بھٹکل، وانمباڑی، پشاور، سیال کوٹ، علی گڑھ، پشاور، رنگون، سورت اور مکھڈ شریف سے تقریباً سترہ (17) اسکولوں کا الحاق ہو چکا تھا۔ 1938ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی دعوت پر مذہبی رہنما، عظیم مجاہد آزادی اور ہندوستان کے ولی ثانی مانے جانے والے مولانا عبید اللہ سندھیؒ جامعہ تشریف لائے اور اسکول آف اسلامک اسٹڈیز کا آغاز کیا جسے بیت الحکمت کہا جاتا تھا۔ 1988ء میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے نام سے مستقل ایک شعبہ کام کرنے لگا۔

پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی کاوشوں کے باعث اس جامعہ کو 1963ء میں ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ 1988ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایکٹ (59/1988) کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی جامعہ کا درجہ ملا۔ اب یہ مرکزی جامعہ ہندوستان کے دار الحکومت نئی دہلی میں واقع ہے۔ ماہرین تعلیم اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کی جہد مسلسل کے باعث فروری 2011ء میں نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات (این سی ایم ای آئی) نے تاریخی فیصلہ دیتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کو تسلیم کیا جس کے باعث پچاس (50) فیصد نشستیں مسلم طلبہ کے لیے مختص کرنا آسان ہو گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ وہ پہلی مرکزی جامعہ ہے جسے اقلیتی کردار ملا ہے۔ جسٹس صدیقی کمیشن کے چیرپرسن ایم۔ ایس۔ اے صدیقی فیصلہ پر اپنے دستخط ثبت کرتے ہوئے کہا ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ مسلمانوں نے جامعہ کی بنیاد مسلمانوں کے مفاد کے لیے رکھی تھی اور اس نے مسلم اقلیتی تعلیمی ادارے کے

طور پر اپنی شناخت کبھی نہیں کھوئی۔ 2006ء میں سعودی عرب کے سلطان سلمان بن عبد العزیز آل سعود کے 3 ملین ڈالر کے نذرانے سے ذاکر حسین لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ایسے مرکب تعلیمی نظام کی حامل جامعہ ہے جو دین و دنیا اور قدیم و جدید عناصر کا حسین امتزاج ہے جہاں زائد از 24 ہزار طلباء و طالبات کو جدید علوم کی تشنگی کا سامان فراہم ہو رہا ہے۔ اسی باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شمار ہندوستان کی اہم ترین یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے اور وزارت برائے فروغ انسانی اور وسائل کی فہرست میں بھی جامعہ کو اہم مقام حاصل ہے۔

12.8 قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

دنیا میں وہی اقوام و ممالک ترقی حاصل کر سکتے ہیں جن کا تعلیمی نظام مضبوط و مستحکم اور معیار تعلیم اعلی ہونے کے ساتھ جن میں قومیت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ یہ عناصر و عوامل بہتر نظم و نسق، نئی نئی ایجادات اور سماجی مسائل کو بہترین انداز سے حل کرنے کے لیے از حد ضروری ہوتے ہیں۔ جو افراد تعلیم و قومیت سے تشکیل پانے والے تعلیمی نظام کو اپناتے ہیں تو وہ ایک حقیقی قوم کے طور پر دنیا میں ممتاز ہو جاتے ہیں چونکہ ایسے تعلیمی نظام سے نکلنے والے اکثر لوگ مفاد پرستی اور خود غرضی کی نحوستوں سے بالاتر ہو کر اجتماعی مفاد کو فوقت دینے والے ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر بانیان جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں میں علمی و فنی مہارت پیدا کرنے اور قومی سوچ کو ابھارنے کی غرض سے ہی جامعہ کی اساس رکھی تھی۔ نئی نسل کی صحیح اسلوب پر نشو و نما کا یہ واحد اور بہترین راستہ ہے۔ علاوہ ازیں قیام جامعہ کے دیگر اغراض و مقاصد میں حسب ذیل نکات شامل ہیں: قوم و ملک کے لیے بہترین اور باصلاحیت افراد فراہم کرنا، ہندوستانیوں کے اندر آزادی و ذمہ داری کا احساس پیدا کرتے ہوئے انہیں ذہنی اور جسمانی ہر اعتبار سے کھوکھلا ہونے سے بچانا، برطانوی حکومت کے تسلط اور اس کے آہنی پنجوں سے آزادی حاصل کرنا، ہندوستانیوں کو برطانوی سامراج کے ظلم و ستم، جبر و استبداد اور سماجی و اقتصادی استحصال سے گلو خلاصی پانا، ذہنی غلامی اور ظلم و ستم کے خلاف سینہ سپر ہونے کی طاقت و صلاحیت رکھنے والی نسل تیار کرنا، تعلیم کو سامراجی تسلط سے آزاد کروانا، مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر اغیار کے تسلط کو برخواست کرنا، قومی تعلیم کو فروغ دینا، اغیار کے تعلیمی نظام سے متاثر ہوئے بغیر اپنے طور پر تعلیمی نظام چلانا، سماج کے ہر طبقہ تک معیاری تعلیم پہنچانا، ذہنی جمود اور اندھی تقلید کے مقابلے تخلیقی صلاحیت اور اجتہادی فکر کو مہمیز کرنا، نئی نسل کے قلوب و اذہان کو روشن کر کے ان میں ایجاد و اختراع کی صلاحیتیں پیدا کرنا، طلبہ کو اسلامیت اور ہندوستانیت کا اعلی نمونہ بنانا، امت مسلمہ کو سیاسی و سماجی قیادت فراہم کرنا، ایسے طلبہ پیدا کرنا جو مذہب کے پیروکار رہنے کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کے جنون سے محفوظ و مامون رہیں، ایک نئی مشترک ہندوستانی قومیت کی نشو و نما کرنا جو وطن کی آزادی کو ہمیشہ اپنے لیے حرز جاں بنالیں۔ اس جامعہ سے ایسے ہونہار طلبہ فارغ ہوں جو حکومتوں کی سماج، ملک اور عوام مخالف پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکیں اور ذہنی و فکری بیداری میں انقلاب آفریں کارنامے انجام دے سکیں۔ مذکورہ بالا مقاصد جلیلہ کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل ہندوستانی یونیورسٹی کے طور پر ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ روز اول سے مختلف افکار و خیالات اور علوم و فنون کا ایسا علمی گہوارہ رہا ہے جس نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ جامعہ کے فارغین اقوام عالم میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی

فکری و تحقیقی مہارتوں اور انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔

12.9 اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ

قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سال بعد یعنی 1921ء میں طلباء میں تحقیقی، تخلیقی، تصنیفی، تالیفی، ادبی، شعری، صحافتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور علمی تعمق و فکری بصیرت کو پروان چڑھانے کے لیے جامعہ کا فعال ادارہ یعنی شعبہ تصنیف و تالیف معرض وجود میں آیا۔ اور 1922ء کو شعبہ اشاعت کی داغ بیل ڈالی گئی تا کہ جامعہ کے پیغام سے عوام الناس کو واقف کروایا جائے اس طرح جامعہ سے فکری تحرک، علمی فعالیت اور موضوعاتی وسعت کے حامل رسالہ جامعہ (1923ء)، پیام تعلیم (1926ء) اور رسالہ کتاب نما (1932) کا اجرا عمل میں آیا جو بانیان جامعہ کے افکار و نظریات کے ترجمان تھے۔ مکتبہ جامعہ اپنے قیام ہی سے اُردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت کی غرض سے رسائل و جرائد جاری کرتا رہا ہے۔ مکتبہ جامعہ سے مذہب، تحقیق و تنقید، سفر نامہ و خود نوشت، افسانہ و ڈراما، تہذیب و ثقافت، شعر و ادب، فلسفہ و تاریخ، رپورتاژ و طنز و مزاح، سائنسی و سماجی علوم و فنون، غالبیات و اقبالیات پر زائد از چھ ہزار علمی، ادبی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، تاریخی اور سماجی اعتبار سے دستاویزی نوعیت کی حامل کتب شائع ہو چکی ہیں۔ سینکڑوں اصحاب علم و فضل کے افکار و خیالات، تحریرات و نگاراشات اور مضامین و تخلیقات سے دنیا کو روشناس کروایا گیا اس طرح مکتبہ جامعہ نے اُردو کو علمی زبان کی حیثیت سے پروان چڑھانے اور موضوعاتی اعتبار سے ثروت مند بنانے میں انتہائی گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ فکر و نظر کی گہرائی اور تحقیق کی گہرائی والی کتب کی نشر و اشاعت کے باعث مکتبہ جامعہ کا شمار برصغیر میں اُردو مطبوعات کے صف اول کے اداروں میں ہوتا ہے۔

اس طرح مکتبہ جامعہ نے اُردو ادب کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے تخلص سے ماخوذ رسالہ 'جوہر' کی اجرا کے ساتھ ہی جامعہ میں اُردو صحافت کی داغ بیل پڑی۔ پدم شری ایوارڈ یافتہ این۔ ڈی۔ ٹی۔ وی کی مشہور و معروف خاتون صحافی برکھا دت، دانش صدیقی، نہا ڈکشٹ، روشن عباس، ریتو کپور، شاذیہ علمی جیسے میدان صحافت کے نایاب گوہر کا شمار بھی جامعہ کے فارغین میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی اُردو خود نوشت فن و تجزیہ، افق کی مسکراہٹ، ترجمے کے فنی اور عملی مباحث، رابندر ناتھ ٹیگور فکر و فن کے ہزار رنگ، گیتانجلی، نول کشور اور ان کا عہد، ٹیگور اور اقبال جیسے کتابیں شائع کر کے اُردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشاعتی اداروں کو جن معروف قلمکاروں کا علمی تعاون حاصل رہا ہے ان میں منشی پریم چند، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، قرۃ العین حیدر بھی شامل ہیں۔ 1947ء تک جامعہ سے وابستہ مصنفین بشمول مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا عبدالحئ، مولانا عبداللہ محمد بن یوسف السورتی، پروفیسر محمد عاقل، نور الرحمن، سعید انصاری، ڈاکٹر سلامت اللہ، محمد سرور، محمد شفیع الدین و قار عظیم، قاسم حسن، برکت علی فراقؔ، محمد حسین حسان، الیاس احمد مجیبی، فیاض حسین جامعی، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار مدہولی نے معرکۃ الآرا تصانیف تخلیق کر کے اُردو زبان کے فروغ میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔

12.10 ملک کی تعمیر و ترقی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کردار

کسی بھی ملک کی ترقی میں وہاں کے تعلیمی نظام اور تعلیمی اداروں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس حوالے سے جامعہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے قبل اور مابعد آزادی قوم وملک کی تعمیر و ترقی میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جس نے جدوجہد آزادی میں بھی تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا آج بھی ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ترقی میں اپنی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ جامعہ نے اپنے طلبا و طالبات کو ذات پات، مذہب اور رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر ہندوستان کے آئین و اقدار کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے پر ہمیشہ ابھارا ہے۔ جامعہ سے وابستہ افراد نے جامعہ کے متعین اہداف و مقاصد کو پیش نظر رکھا اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس کی تکمیل کے لیے ہر ممکنہ اقدام کیا یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے انتہائی قابل ترین افراد بشمول ہندوستان کے سابق مرکزی وزیر سلیمان خورشید، مشہور و معروف فلم اداکار شاہ رخ خان، ناسا کے سابق سائنٹسٹ مکل کمار اور فلم اداکارہ و سماجی جہد کار نفیسہ علی، سابق چیف الیکشن کمشنر وائی قریشی، میگھالیہ کی قانون ساز اسمبلی کی سابق رکن امپرین لینگدو، عارفہ خانم شیروانی، انجنا اوم کشیپ وغیرہ نکلے ہیں جو ہر شعبہ میں اپنی لیاقت و صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ طلبائے جامعہ کے مختلف گروپس قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اپنی آرا کا کھل کر اظہار کرتے ہیں اور طلباء کے حقوق کے تحفظ میں پیش پیش رہتے ہیں۔ حالیہ عرصہ یعنی 2020ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ کیمیا کے متحرک و فعال پروفیسر عمران علی نے دنیا کے 24ویں سائنسدان کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہوئے جامعہ کا نام روشن کیا۔ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں امریکہ کے اعلی درجے کے محققین (ہائیلی سائٹیڈ ریسرچرز۔ ایچ سی آر) کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جس میں 60 ممالک کے 6167 محققین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں 26 نوبل انعام یافتہ محققین کے نام بھی ہیں۔ علاوہ ازیں جامعہ وطن عزیز ہندوستان کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اس کی سالمیت میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جدید ہندوستان کے معماروں نے ہندوستان میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے تنوع میں اتحاد کا نعرہ دیا تھا جسے یقینی بنانے کے لیے کئی ادارے تشکیل دیئے گئے تھے ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شمار بھی ہوتا ہے جو سیکولرازم اور اسلامی تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔ فن تعمیر کے اعتبار سے بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ طلباء و طالبات کی پہلی پسند ہے یہاں کے فارغین 80 تا 85 فیصد روزگار سے مربوط ہیں۔ علوم و فنون کی آبیاری کے علاوہ جامعہ میں کھیل کود کو بہت زیادہ فروغ دیا گیا ہے۔ کرکٹر ویرندر سہواگ، قومی ایتھلیٹ مونکا جون، نشانہ باز سرپریت سنگھ، ہاکی پلیر تشکر کھانڈیکر، لان ٹینس پلیر پریرنا بھمبری جیسے قومی و بین الاقوامی سطح کے کھلاڑی بھی جامعہ نے اس ملک کو عطا کیے ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق کی بناء پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو عالمی یونیورسٹیوں میں 856 واں مقام حاصل ہے۔ آج بھی جامعہ ہندوستانی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ایک ترقی پسند، طاقتور اور باوقار ملک یعنی ہندوستان کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر رہا ہے جس کے باعث جامعہ کی ہندوستان اور بیرون ملک منفرد و نمایاں پہچان ہے۔

12.11 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حضرت شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ الفاروقیؒ کی ولادت بتاریخ 4 / ربیع الثانی 1264ھ بمقام قندھار ضلع ناندیڑ ہوئی۔
- حضرت بانی جامعہ نظامیہؒ حضرت شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ کابلی الفاروقیؒ کے خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔
- حضرت شیخ الاسلامؒ شیخ العرب والعجم مولانا احمد حسین شاہ امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید وخلیفہ تھے۔
- حضرت شیخ الاسلامؒ نے محض 28 سال کی عمر میں علوم نبوت کی اشاعت کے لیے توکل، اخلاص اور تقوی کی بنیاد جامعہ نظامیہ کا قیام بتاریخ 19 / ذی الحجہ 1292ھ عمل میں لایا۔
- جامعہ نظامیہ کا دار الافتاء سن 1328ھ میں قائم ہوا۔ حضرت علامہ مفتی محمد رکن الدینؒ اس کے پہلے مفتی مقرر ہوئے۔
- حضرت شیخ الاسلامؒ کا وصال بعمر 72 سال جمادی الثانی 1336ھ کے ہلال طلوع ہونے کے وقت ہوا اور آپ کی وصیت کے مطابق تدفین احاطہ جامعہ نظامیہ میں عمل میں آئی۔
- محدث دکن حضرت مولانا عبد اللہ شاہ صاحبؒ، فقیہ الاسلام حضرت مولانا محمود شاہ قادری حنفی معروف بہ ابو الوفاء افغانیؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کا شمار جامعہ نظامیہ کے مشاہیر علماء میں ہوتا ہے۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا وہ پہلا قوم پرست ادارہ ہے جو تحریک خلافت اور تحریک عدم موالات کے باعث معرض وجود میں آیا۔
- 29 / اکتوبر 1920ء بروز جمعہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔
- ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب نے سن 1926ء میں تعلیم بالغاں کو یقینی بنانے کے لیے مسائیہ جماعتوں کو متعارف کروایا۔
- گاندھی جی نے جامعہ کے مالی مسائل کی یکسوئی کے لیے کہا تھا کہ اگر مجھے جامعہ کے لیے کٹورا لیکر بھیک مانگنی پڑی تو میں وہ بھی کروں گا۔
- ۱۹۸۸ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایکٹ (59 / 1988) کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی جامعہ کا درجہ ملا۔
- سن 1921ء میں طلباء میں تحقیقی، تخلیقی، تصنیفی، تالیفی، ادبی، شعری، صحافتی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور علمی تعمق وفکری بصیرت کو پروان چڑھانے کے لیے جامعہ کا فعال ادارہ یعنی شعبہ تصنیف وتالیف معرض وجود میں آیا۔
- جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشاعتی اداروں کو منشی پریم چند، مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، قرۃ العین حیدر جیسے قلمکاروں کا علمی تعاون حاصل رہا۔

12.12 نمونہ امتحانی سوالات

12.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بانی جامعہ نظامیہؒ کی ولادت کس مقام پر ہوئی؟

(a).حیدرآباد (b).دہلی (c).قندھار (d).گلبرکہ شریف

2. بانی جامعہ نظامیہؒ کی مرید و خلیفہ تھے؟

(a).حضرت نظام الدینؒ (b).حضرت بابا فریدؒ (c).حضرت اشرف جہانگیرؒ (d).حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ

3. جامعہ نظامیہ کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a).1291ھ (b).1281ھ (c).1340ھ (d).1376ھ

4. جامعہ نظامیہ کے پہلے مفتی کون تھے؟

(a).مفتی محمودؒ (b).مفتی ولی اللہؒ (c).مفتی عبدالحمیدؒ (d).مفتی رکن الدینؒ

5. زجاجۃ المصابیح کس نے تصنیف کی؟

(a).ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (b).حضرت عبداللہ شاہؒ (c).ابوالوفا افغانیؒ (d).سید ابراہیم ادیب رضویؒ

6. جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کس سن میں ہوا؟

(a).1857 (b).1920 (c).1947 (d).1988

7. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے امیر جامعہ کی حیثیت سے کس کا تقرر عمل میں آیا تھا؟

(a).محمود حسن دیوبندی (b).مولانا محمد علی جوہر (c).حکیم اجمل خان (d).ڈاکٹر مختار احمد انصاری

8. وہ کون سا کرکٹر ہے جس کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہے؟

(a).راہل دڑاویڈ (b).ویرندر سہواگ (c).سچن تندولکر (d).محمد اظہر الدین

9. ہندوستان کے کس چیف الیکشن کمشنر کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ سے رہا ہے؟

(a).ٹی۔این سیشن (b).ایس۔وائی قریشی (c).نوین چاؤلہ (d).نسیم زیدی

10. ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت کس سن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مرکزی جامعہ کا درجہ ملا؟

1978.(a) 1968.(b) 1988.(c) 1998.(d)

12.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. بانی جامعہ نظامیہؒ کے احوال و کوائف بیان کیجیے۔
2. بانی جامعہ نظامیہؒ کی تصانیف کا اجمالی جائزہ لیجیے۔
3. جامعہ نظامیہ کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
4. قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے۔
5. ملک و قوم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کردار پر مختصر نوٹ لکھیے۔

12.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. بانی جامعہ نظامیہ کے علمی، تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کو مفصل بیان کیجیے۔
2. جامعہ نظامیہ کے مشاہیر علماء کی خدمات پر جامع نوٹ لکھیے۔
3. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام پر تحریک عدم موالات کے اثرات کو تفصیل سے بیان کیجیے۔

12.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	مطلع الانوار	:	مولانا مفتی رکن الدینؒ
2.	معارف انوار	:	مولانا مفتی عبد الحمیدؒ
3.	نزھۃ الخواطر	:	علامہ عبد الحئ لکھنوی
4.	بانی جامعہ نظامیہ حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقیؒ شخصیت علمی و ادبی کارنامے	:	پروفیسر ڈاکٹر ایم۔اے حمید اکبر
5.	مرقع انوار	:	شاہ محمد فصیح الدین نظامی
6.	جامعہ کی کہانی	:	عبد الغفار مدہولی
7.	ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک اور جامعہ ملیہ اسلامیہ	:	شمس الرحمن محسنی
8.	ڈرامائی ادب کی ترویج میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کردار	:	ڈاکٹر جاوید حسین
9.	نقوش جامعہ	:	غلام حیدر
10.	جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ: اُردو مصنفین کی نظر میں	:	پروفیسر شہزاد انجم

اکائی 13: جماعت مجاہدین، فرائضی تحریک

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 جماعت مجاہدین

13.3 پس منظر اور قیام

13.4 سید احمد شہیدؒ 1786–1831ء

13.5 جماعت مجاہدین کی تیاری اور ہجرت

13.6 آزاد حکومت کا قیام 1827ء

13.7 معرکہ بالاکوٹ

13.8 مولانا ولایت علی عظیم آبادی کا دور امارت 1852–1846ء

13.9 مولانا عنایت علی غازی کا دور امارت 1852–1858ء

13.10 مولانا عبداللہ صادق پوری کا دور امارت 1862–1902ء

13.11 جماعت مجاہدین کے خلاف انگریز حکومت کے مقدمات

13.12 سازش کے مقدمات کے اہم پہلو

13.13 جماعت مجاہدین پر اجمالی نظر

13.14 فرائضی تحریک

13.15 حاجی شریعت اللہ

13.16 دودو میاں

13.17 اکتسابی نتائج

13.18 کلیدی الفاظ

13.19 نمونہ امتحانی سوالات

13.19.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.19.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.19.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

ہندوستان پر انگریزی اقتدار بنگال کے راستہ سے داخل ہوا۔ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی، 1764ء میں بکسر کی جنگ ہوئی، جس میں انگریزوں نے اودھ، بنگال اور مغل فوجوں کے اتحاد کو شکست دی۔ 1799ء میں دکن میں شیر میسور ٹیپو سلطان نے جام شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد آزادئ وطن کے لئے ریاستوں کی طرف سے منظم کوششوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ ان حالات میں انگریزی اقتدار کے خلاف عوامی تحریکیں شروع ہوئیں، ان عوامی تحریکوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی سماجی، سیاسی اور معاشی اصلاح کا پیغام پورے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ اور تقریباً سوا سو سال تک اندرون اور بیرون ملک میں انگریزوں کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کیا۔ یہ عوامی اقدامات ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے اور بادشاہت و سامراجیت کے خلاف عوامی حکومت لانے کے ہراول دستے تھے۔ جماعت مجاہدین اور فرائضی تحریک ان ہی عوامی کوششوں کے دو نام ہیں۔

13.1 مقاصد

اس اکائی میں ہم ہندوستان کی آزادی کی ابتدائی دو تحریکوں کے بارے میں جانیں گے، اور معلوم کریں گے کہ جماعت مجاہدین اور فرائضی تحریک نے انیسویں صدی کے آغاز سے ایک طویل عرصہ تک اپنی جدوجہد کس طرح جاری رکھی۔ ان تحریکوں کا پس منظر کیا تھا، اہم رہنما کون تھے۔ ہم یہ بھی معلوم کریں گے کہ ان کی جدوجہد نے کس طرح پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ آئندہ سطروں میں ہم ہندوستان میں آزادی کی پہلی تحریک کی حیثیت سے جماعت مجاہدین کی سرگرمیوں اور خدمات کا جائزہ لیں گے۔ اور فرائضی تحریک کے بارے میں جانیں گے۔

13.2 جماعت مجاہدین

جماعت مجاہدین کو تحریک مجاہدین اور تحریک شہیدین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، شہیدین سے مراد حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید ہیں، سید احمد شہید اس تحریک کے بانی تھے، اور شاہ اسماعیل شہید ان کے دست راست تھے۔ دونوں حضرات جنگ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے تھے۔ انگریز مصنفین نے اس کو ہندوستان کی وہابی تحریک کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ جماعت انیسویں صدی

کے آغاز میں قائم ہوئی، اور تقریباسو سال سے زیادہ تک سر گرم اور متحرک رہی۔ اس کی تاریخ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1. پہلا دور: حضرت سید احمد شہید کا دور امارت
2. دوسرا دور: 1831ھ یعنی معرکہ بالاکوٹ سے 1902ء یعنی مولانا عبداللہ صادق پوری کی وفات تک

13.3 پس منظر اور قیام

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک بیرونی طاقت یعنی انگریز بہت تیزی اور چالاکی سے چھاتے جارہے تھے۔ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست دی، اور بنگال کا پورا علاقہ انگریزوں کی عملداری بن گیا۔ 1799ء میں انہوں نے میسور کی سلطنت خداداد کو شکست دی، اور شیر دل، حریت پسند لیڈر ٹیپو سلطان کو شہید کیا۔ اور 1803ء میں دہلی پر حملہ کر کے بادشاہ سے اپنے لئے پروانہ حکومت حاصل کیا، اور مغل بادشاہ کی حیثیت ایک وظیفہ خوار کی ہوگئی۔ اس کے بعد ہندوستان کی منظم ریاستیں یا تو ختم ہوگئیں، یا انہوں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی۔ ان حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیزؒ نے جہاد کا فتوی جاری کیا۔ اس وقت جنوبی ہند میں مرہٹہ ایک ایسی طاقت تھے، جو انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے۔ وسط ہند میں نواب امیر علی خان انگریزوں سے لوہالے رہے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے ان تمام آزاد طاقتوں سے تعلقات تھے، اور آپ کے اس فتوی کا فوری اثر یہ ہوا کہ حریت پسند اور جنگ جو مسلمان ان آزاد طاقتوں سے وابستہ ہوگئے۔ حضرت سید احمد شہید کی برپا کردہ جماعت مجاہدین دراصل شاہ عبدالعزیزؒ کے فتوی کا نتیجہ اور ان کی جانب سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی عملی کوشش تھی۔

13.4 سید احمد شہیدؒ 1786–1831ء

سید احمد شہید شمالی ہند کے قصبہ رائے بریلی کے ایک حسنی خانوادہ میں 1201ھ مطابق 1786ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد عرفان تھا۔ بچپن میں قرآن مجید کی سورتیں حفظ کیں۔ ابتدا میں علم حاصل کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ سترہ سال کی عمر میں تلاش روزگار کے لئے نکلے، پہلے لکھنو گئے۔ پھر علم حاصل کرنے کا شوق ہوا تو دہلی جاکر شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمات میں حاضر ہوئے، اور آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر سے صرف ونحو اور ترجمہ قرآن مجید پڑھا۔ بائیس سال کی عمر میں شاہ عبدالعزیز سے بیعت کی۔ 1810ء میں نواب امیر خاں کے لشکر میں بھرتی ہوگئے۔ چھ سات سال فوج میں رہے، متعدد لڑائیوں میں شرکت کی، ایک دستے کے امیر بنائے گئے، اور نواب امیر خان کے مشیر خاص کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی۔ یہاں سید صاحب وعظ و تبلیغ کا کام بھی کرتے تھے، سپاہی اپنے سماجی اور روحانی مسائل سید صاحب کے سامنے رکھتے، اور آپ ان کو سلجھاتے۔ آپ کے ذریعہ امیر خان کی فوج میں بڑے پیمانے پر اصلاح کا کام ہوا۔

سماجی اصلاح کے لئے دورے اور ان کے نتائج

سید صاحب کے پیش نظر ایک ہمہ گیر سماجی اور معاشی انقلاب تھا۔ جس کے لئے آپ نے ملک کا ایک دورہ کیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ اس قافلہ میں سید صاحب کے ساتھ مولانا عبدالحئ اور مولانا اسماعیل موجود تھے، یہ دونوں آپ

کے سب سے قریبی ساتھی تھے۔ سماجی اصلاح کے اس دورے کے لئے آپ اپنے قافلہ کے ساتھ 1818ء میں دلی سے روانہ ہوئے۔ غازی آباد، میرٹھ، مظفر نگر، دیوبند، سہارن پور، رام پور، بریلی، شاہ جہاں پور، الہ آباد، کانپور، بنارس، سلطان پور اور لکھنو تشریف لے گئے۔ اس دورے میں آپ نے سماج میں پھیلی ہوئی اونچ نیچ کو ختم کیا۔ اسلام کی تبلیغ کی، مساوات کی تلقین کی، انسانی بھائی چارہ قائم کیا۔ اس دورہ میں آپ کو بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی۔ غیر اسلامی، ظالمانہ اور جاہلانہ رسم ورواج کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی سید صاحب کے قافلے کا احترام کرتے تھے۔ آپ نے ہندو مسلم بھائی چارہ کی کوششیں کیں، اور ہندوؤں سے بھی تعلق بڑھایا۔

13.5 جماعت مجاہدین کی تیاری اور ہجرت

سماجی اور معاشی اصلاح کے بعد آپ نے اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد جہاد اور وطن کی آزادی کو قرار دیا تھا، اور اپنے ساتھیوں کو اسی طرز پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ جفاکشی، سپاہیانہ ورزشیں، نشانہ بازی کی مشقیں اور ہتھیار چلانے کی تربیت آپ کے قافلہ کے روز مرہ کے معمولات تھے۔ آپ کا کیمپ فوجی تربیت گاہ تھا۔ آپ نے پورے ہندوستان میں اپنے نمائندے مقرر کر دئے تھے، تاکہ ہجرت کے بعد جہاد کے دوران آپ کو مالی اور افرادی قوت پہونچاتے رہیں۔

یہ تمام تیاریاں کرنے کے بعد سید صاحب نے 1826ء میں وطن عزیز سے ہجرت کی، راجستھان کے راستہ سندھ، قندھار اور کابل ہوتے ہوئے ہندوستان کی شمالی سرحد پہونچے اور سرحدی علاقے کو مرکز بناکر آزاد حکومت قائم کی۔ راستہ میں والیٔ ٹونک امیر خان، اور گوالیار کے راجہ دولت راؤ سندھیا اور ان کے بھائی ہندو راؤ سندھیا سے ملاقات کی۔ سندھیا نے جماعت مجاہدین کا استقبال کیا، اور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ گوالیار ہی میں اپنے قافلہ کو فوجی ترتیب کے مطابق الگ الگ پلٹنوں میں تقسیم کیا۔

13.6 آزاد حکومت کا قیام 1827ء

10/ جنوری 1827ء کو سرحد کے علاقہ میں ایک آزاد حکومت قائم کی گئی، سید احمد صاحب کو اس حکومت کا امیر بنایا گیا۔ تمام ہمراہیوں اور مقامی پٹھانوں نے بیعت کی اور وفاداری کا حلف اٹھایا۔ عدالتی کاروائیوں کے لئے قاضیوں کا تقرر ہوا۔ فوج کا نظام پہلے سے مرتب ہو چکا تھا۔ سفیروں کو ایران اور افغانستان کے قبائل میں بھیجا گیا۔ اس آزاد حکومت کی مقبولیت اس قدر تھی کہ حکومت کے قیام کے چند ہفتے کے اندر ہی آپ کے ساتھیوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہو گئی تھی۔

اس حکومت کی ذمہ داری قبول کرتے وقت ہی سید صاحب نے واضح کر دیا تھا کہ ان کو نہ تو حکومت وقیادت کا شوق ہے، اور نہ وہ مالک بننا چاہتے ہیں، یہ سارا کاروبار اس لئے ہے تاکہ ہندوستان سے انگریزی حکومت ختم ہو، اور وطن آزاد ہو جائے۔ اور اس کے ذریعہ خدا کی رضا حاصل ہو۔

انگریزوں کی حلیف رنجیت سنگھ کی حکومت سے مقابلہ

پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت نے انگریزوں کے ساتھ تعلقات اور معاہدے استوار کر لئے تھے، اور انگریزوں سے لڑنے والی ہندوستانی طاقتوں مثلاً مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خان کو مدد دینے سے نہ صرف انکار کیا تھا، بلکہ ان کے خلاف

انگریزوں سے معاہدہ کیا تھا۔

سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت امامت ہونے کے بعد افغانستان کے خوانین اور رنجیت سنگھ سے کئی مقابلے ہوئے، یار محمد خاں، راجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا گورنر تھا، وہ اور اس کا بھائی سلطان محمد خاں، جو درانی قبائل کے سردار تھے، سید صاحب کی طاقت کو اپنے لئے خطرہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ "زیدہ"، "مایار" اور دوسرے مقامات پر جنگیں ہوئیں۔ اکثر جنگوں میں سید صاحب کی جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی، اور ستمبر 1829ء میں پشاور فتح ہوا۔

پشاور کی فتح کے بعد پنجاب کی حکومت سے سید صاحب کی براہ راست جنگ ہوئی، یہ جنگ شیدو کے مقام پر ہوئی، مقامی قبائل بظاہر آپ کے ساتھ تھے، لیکن اندر سے وہ دشمن سے ملے ہوئے تھے، اس لئے اس جنگ میں شکست ہوئی۔

13.7 معرکہ بالاکوٹ

پشاور کی فتح پنجاب کی حکومت کے لئے ایک زبردست حادثہ تھا، خود انگریزوں کے لئے بھی یہ حادثہ کچھ کم نہیں تھا۔ چنانچہ پہلے سازش کی گئی، اور جماعت مجاہدین کے بارے میں مقامی قبائل کو بدگمان کیا گیا، جماعت مجاہدین پر وہابیت کا الزام لگایا گیا۔ جس کی وجہ سے عوام نے بدظن ہو کر اپنے اپنے محلے میں بسنے والے مجاہدین کا قتل عام کر دیا۔ سید صاحب نے یہ دیکھ کر پشاور کو الوداع کہا، اور ہجرت کر کے کوئی دوسرا مرکز قائم کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔

راستہ میں شیر سنگھ جو رنجیت سنگھ کا بیٹا تھا، اپنی فوج لئے موجود تھا، بالاکوٹ کے مقام پر جماعت مجاہدین اور خالصہ فوج کا مقابلہ ہوا۔ اسی معرکہ میں سید صاحب اور آپ کے ساتھی مولانا اسماعیل نے جام شہادت نوش کیا، سینکڑوں مجاہدین شہید ہوئے۔ بالاکوٹ کا یہ واقعہ 24/ذی قعدہ 1246ھ، 7/مئی 1831ء کو پیش آیا۔

13.8 مولانا ولایت علی عظیم آبادی کا دور امارت 1852-1846ء

سید احمد شہید کی شہادت اور بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد جماعت مجاہدین کی ذمہ داری مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے سنبھالی۔ مولانا ولایت علی کو سید صاحب نے جنوبی ہند میں دعوت و تبلیغ کے لئے روانہ کیا تھا، وہیں ان کو حادثۂ بالاکوٹ کی خبر ملی۔ سید صاحب کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد، پٹنہ واپس ہوئے۔ اور افراد کو از سر نو منظم کرنا شروع کیا۔ بنگال، بہار، دکن اور دوسرے صوبوں کو مبلغ بھیجے۔ خود بھی بنگال تشریف لے گئے، شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ پھر حج کر کے بالاکوٹ پہونچے اور مجاہدین کے امیر مقرر ہوئے۔ اکتوبر 1852ء میں مولانا ولایت علی کا انتقال ہوا۔

13.9 مولانا عنایت علی غازی کا دور امارت 1858-1852ء

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد مولانا عنایت علی کو امیر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے اپنے دور امارت میں انگریزوں کے خلاف مسلسل کاروائیاں کیں، اور انگریزوں کو ان سے مقابلہ کے لئے ایک فوجی اڈہ قائم کرنا پڑا، انگریز حکومت نے 1850ء سے 1857 کے

دوران سولہ مرتبہ جماعت مجاہدین کے خلاف فوجی کاروائیاں کیں۔ جن میں باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد 35 ہزار تھی۔

سرحد کے مجاہدین کو افراد اور مالیہ کی فراہمی ہندوستان سے ہی ہوتی تھی۔ 1857ء میں جب غدر کا واقعہ پیش آیا تو راستے مخدوش ہوگئے، ملک میں افراتفری کی وجہ سے رابطے منقطع ہوگئے، اور مجاہدین کی جماعت کو فاقہ کشی کی وجہ سے درختوں کی کونپلیں چبانی پڑیں، کئی ماہ تک غلہ کا دانہ تک حلق سے نیچے نہیں اترا۔ امیر جماعت کے پاس جتنا پیسا تھا، سب جماعت پر خرچ کر چکے تھے۔ اسی دوران 1858ء میں پشاور سے انگریزی سرکار نے مجاہدین سے مقابلہ کے لئے چھ ہزار فوج روانہ کی، جس کا کمانڈر جنرل کاٹن (Sir Sidney Cotton) تھا۔ مجاہدین نے مقابلہ کیا، اور بھوکے پیٹ بہادری کے جوہر دکھائے، لیکن شکست ہوئی۔ سڈنی کاٹن کی فوج نے مجاہدین کے گاؤں جلا کر خاکستر کر دیئے، ان کے دو اہم قلعوں کو مسمار کر دیا، اور اس علاقہ کو جس کا نام ستھانہ تھا، بالکل تباہ کر دیا۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے 1858ء کے آخر میں انتقال کیا۔

13.10 مولانا عبد اللہ صادق پوری کا دور امارت 1862-1902ء

مولانا عنایت علی کے انتقال کے بعد میر مقصود علی جماعت مجاہدین کے امیر ہوئے، اور ڈھائی سال بعد ان کا بھی انتقال ہوا۔ ان کے بعد مولانا عبد اللہ صادق پوری (وفات: 1902ء) امیر بنے۔ یہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے فرزند تھے۔ مولانا ولایت علی جب دعوت و تبلیغ کے لئے حیدرآباد تشریف لے گیے، تو وہاں شادی کرلی تھی۔ وہیں مولوی عبد اللہ پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد اور چچاؤں سے تربیت حاصل کی۔ اور میر مقصود علی کے بعد جماعت مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔ انتخاب کے فورا بعد ہی جماعت کی فوجی تربیت از سر نو شروع کی۔ ان کے دور میں انگریزوں سے متعدد معرکے پیش آئے۔ ان سے روابط کے الزام میں ہندوستان میں تلاشی اور چھاپوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور پانچ مقدمے جماعت مجاہدین کے خلاف چلائے گئے۔ مولانا عبد اللہ صادق پوری نے اپنی زندگی انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے گذاری۔

جنگ امبیلا

1863 میں انگریز افسروں نے فوج لے کر مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے چڑھائی کی، 18 / اکتوبر کو سر چیمبر لین (Sir Chamber Lain) کی کمان میں سات ہزار انگریزی فوج، توپ خانہ سمیت روانہ ہوئی، مجاہدین اور خوانین نے مل کر فوج کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا۔ فوج کے کمان دار نے کمک کے لئے تار بھیجے، اور کمک بھی آگئی۔ 14 / نومبر تک حالات انگریزی فوج کے قابو سے باہر ہوگئے، اور برطانوی ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے لاہور جا کر لڑائی کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور مزید کمک روانہ کی گئی۔ لیکن نتیجہ میں انگریزی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ جنرل چیمبر لین زخمی ہوا، 847 کی تعداد میں انگریزی فوجی کے سپاہی کام آئے۔ جنگ میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج کی تعداد نو ہزار تک پہونچ گئی تھی، اور مجاہدین کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد نہ تھی۔ سرحدی قبائل نے مجاہدین کی مدد کی تھی، جنگ کے بعد بچی ہوئی فوج کو واپس لانے کے لئے انگریزوں نے ڈپلومیسی سے کام لیا، اور لاکھوں روپیہ دے کر سرحدی قبائل کو الگ کرلیا گیا۔

1868 کی جنگ

چار سال میں مجاہدین نے اپنے آپ کو دوبارہ تیار کیا، اور انگریزوں نے ان سے مقابلہ کے لیے پورے ہندوستان سے منتخب فوج کو بھیجا، چھ ماہ تک لڑائی جاری رہی، اور جنگ ختم بھی ہو گئی، لیکن نہ تو مجاہدین کو اس علاقہ سے نکال سکے، نہ ان سے اطاعت قبول کرا سکے۔

13.11 جماعت مجاہدین کے خلاف انگریز حکومت کے مقدمات

جماعت مجاہدین کے دو حصے تھے، پہلا حصہ سرحد پر انگریزوں اور سامراجیوں سے لڑائی کر رہا تھا، اور دوسرا حصہ ہندوستان میں رہ کر ان کو مالیہ اور افراد فراہم کر رہا تھا، اور ہندوستان میں سماجی و دعوتی سرگرمیاں انجام دے رہا تھا۔ انگریزوں نے سرحد کے مجاہدین کو ختم کرنے کی فوجی کاروائیاں کیں اور کروائیں، اور ہندوستان سے اس تحریک کو ختم کرنے کے لئے ان سے روابط رکھنے والے افراد کو عدالتی مقدمات میں پھانسنا شروع کیا، تاکہ یہاں سے سرحد پر چندہ اور افراد نہ جا سکیں، ان عدالتی کاروائیوں کو "مقدمات سازش" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

1. پہلا مقدمہ سازش انبالہ 1864ء

جنگ امبیلا کی مہم کے بعد انگریزی سرکار کی نگاہ مجاہدین کی سرگرمیوں پر بڑھ گئی تھی۔ مئی 1863ء میں بنگال سے سرحد جانے والے چار افراد پکڑے گئے، اور مزید تحقیق کے بعد حکومت نے ایک مقدمہ درج کیا، جس کو 'مقدمہ سازش انبالہ 1864ء' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کئی لوگوں کی گرفتاریاں ہوئیں، 11 افراد پر فرد جرم عائد ہوئی، اور پانچ افراد سزایاب ہوئے۔ پہلے سزائے موت تجویز ہوئی، جو بعد میں بدل کر "حبس دوام بعبور دریائے شور" میں تبدیل ہوئی۔ ان پانچ افراد کے نام یہ ہیں:

1. مولانا یحیی علی جعفری صادق پوری
2. مولانا عبد الرحیم صادق پوری: سولہ سال انڈومان کے جزائر میں رہ کر رہا ہوئے۔
3. منشی محمد جعفر تھانیسری: یہ بھی سولہ سال بعد رہا ہوئے۔ یہ غدر 1857ء کی لڑائی میں بھی شریک تھے۔
4. میاں عبد الغفار
5. قاضی میاں جان، ان کی جائداد بھی ضبط ہوئی۔ اور انڈومان جانے سے پہلے انبالہ جیل میں ہی وفات پائی۔

2. دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ 1865ء

مقدمہ سازش انبالہ کے بعد حکومت نے اس تحریک سے جڑے ہوئے باقی افراد کو پکڑنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس بار سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری کو ملزم بنایا گیا۔ مولانا احمد اللہ عظیم آباد، پٹنہ کے ممتاز اہل ثروت تھے۔ ان کو پہلے سزائے موت سنائی گئی، پھر کلکتہ ہائی کورٹ نے اس کو عمر قید سے بدل دیا۔ آپ نے سولہ سال انڈومان میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اور وہیں وفات پائی۔

اس مقدمہ کے بعد بہار اور بنگال میں جماعت مجاہدین سے وابستہ افراد کی فہرست بنائی گئی، اور دس سال تک ان کو تنگ کیا جاتا

رہا۔ اور بنگال کے کتنے ہی خوش حال خاندان تباہ ہوگئے۔ مسلمان جاگیرداروں اور زمین داروں کی املاک ضبط کرلی گئیں۔ خاص طور سے علمائے صادق پور، پٹنہ کی جائدادیں ضبط کرکے نیلام کردی گئیں۔ صادق پور کے احاطہ کے مکانات زمین کے برابر کردئے گئے، اور وہاں میونسپلٹی کی عمارت بنادی گئی۔ عورتیں اور بچے دوسرے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ انہدامی کاروائیاں عید کی صبح شروع کی گئیں۔ اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے قبریں تک کھود ڈالی گئیں۔

3. تیسرا مقدمہ سازش مالدہ مئی 1870ء

اس مقدمہ میں جماعت کے کارکن امیر الدین ولد رفیق منڈل کو ملزم بنایا گیا۔ ان کا دائرہ کار پورامالدہ ضلع، نیز راجشاہی اور مرشد آباد کے کچھ علاقے تھے۔ یہ سرحد کے لئے افراد اور روپیہ فراہم کرتے تھے۔ ایک بار گرفتار ہوئے، اور مرشد آباد میں قید ہوئے، پھر چھوڑ دئے گئے تھے۔ ان ہی پر مالدہ میں بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا، املاک ضبط کرنے اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔ 1883ء میں انڈمان سے رہا ہوئے۔

4. چوتھا مقدمہ سازش راج محل اکتوبر 1870

مالدہ کے بعد جلد ہی راج محل میں سازش کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ راج محل مالدہ اور بہار کی سرحد واقع ہے۔ یہاں ابراہیم منڈل نامی ایک شخص کو ملزم بنایا گیا، جو علمائے صادق پور کے مرید تھے، اور راج محل کے علاقہ میں ان کا اثر ورسوخ تھا۔ ان کو بھی املاک کی ضبطی اور 'حبس دوام بعبور دریائے شور' کی سزا ہوئی۔ ابراہیم منڈل 1878ء میں رہا ہوئے۔

5. پانچواں مقدمہ سازش پٹنہ 1871ء

اس مقدمہ میں کل سات ملزم تھے: 1۔ مولانا مبارک علی، 2۔ مولانا تبارک علی، 3۔ حاجی دین محمد، 4۔ حاجی امین الدین، ۵۔ پیر محمد، 6۔ حشم داد خان، 7۔ امیر خان۔

ان میں سب سے دلچسپ امیر خان تھے، یہ پٹنہ کے رہنے والے ایک تاجر تھے، جن کا کلکتہ میں چمڑے کے بہت بڑا کاروبار تھا۔ مولانا ولایت علی سے بیعت تھے۔ جماعت مجاہدین کو زکوۃ کی رقم باضابطہ طور پر ادا کرتے تھے۔ جماعت کے لئے بنگال سے جو چندہ جمع ہوتا، انہی کے واسطے سے آگے روانہ کیا جاتا۔ حکومت کو ان کو سزا دینے اور اور ان کی جائداد ضبط کرنے کے لئے سینکڑوں گواہوں کی لائن لگانی پڑی۔ انہیں عمر قید اور جائداد کی ضبطی کی سزا دی گئی، اور ان کی کروڑوں کی جائداد بیچ کر انگریز حکومت نے اپنے مقدمے کے اخراجات پورے کئے۔ چار سال قید میں رکھ کر ستر برس کے بوڑھے کو رہا کیا گیا، اور رہائی کے دو روز بعد ہی ان کی وفات ہوئی اور جائداد کا ایک پیسہ تک واپس نہ ملا۔

13.12 سازش کے مقدمات کے اہم پہلو

ان مقدمات میں سب سے مشکل کام ثبوت اکھٹا کرنا تھا، جماعت کے ارکان کیر کٹر کے اس قدر مضبوط تھے کہ بقول ولیم ولسن ہنٹر: ان کے خلاف گواہی وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو ان کے مرید ہوں، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اپنے سردار سے غداری کے بجائے

موت کو ترجیح دیتے ہیں۔(علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد 3، صفحہ 654)

جماعت مجاہدین کی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے مشکوک افراد کو گرفتار کرنا عام قانون کے تحت ممکن نہیں تھا، اس لئے انگریز گورنمنٹ نے ان کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کیا۔

مقدمات کے لئے حکومت کا جو پیسہ خرچ ہوا، اس کو ان ملزمین کی جائدادیں قرق کرکے پورا کیا گیا، جو شاید کسی مہذب حکومت نے نہیں کیا۔ جائداد قرقی کرنے کی انگریز حکومت کو بہت جلدی رہتی تھی، سزا سنائے جانے کے ایک دو دن کے اندر ساری جائداد نیلام کردی جاتی تھی۔ بلکہ بعض افراد کو اسی لئے گرفتار کیا گیا کہ ان کی لاکھوں کروڑوں کی جائداد ہڑپ لی جائے۔ رشوت کی گرم بازاری تھی۔ دس سال تک گرفتاریاں ہوتی رہیں، اور پولس نے جس سے جتنا ممکن ہوا، روپیہ اینٹھا۔

کیوں کہ الزام ثابت کرنا مشکل تھا، اس لئے ڈرا دھمکا کر، اور لالچ دے کر بہت سے جھوٹے گواہ حکومت کے کارندوں نے تیار کرلئے تھے، جب بھی ضرورت پڑتی ان کو پیش کرکے رٹا رٹایا سبق پڑھوا دیا جاتا۔ اور انکار کرنے پر عبرت ناک سزا دی جاتی۔

13.13 جماعت مجاہدین پر اجمالی نظر

جماعت مجاہدین کی پوری تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اصلاً ہندوستان کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانے کے لئے اٹھے تھے، یہ جماعت بوڑھی اور کمزور مغلیہ سلطنت کو بھی قائم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ ایک نئے، آزاد اور مبنی بر انصاف نظام کو قائم کرنا چاہتی تھی، جس کے لئے انہوں نے جان ومال اور اعزہ واقارب کی قربانی دی۔ اور اس مقصد کے لئے اپنے لہو کی آخری بوند بہادی۔ اس دوران ان کا سامنا انگریزوں کے حلیفوں سے بھی ہوا، مثلاً کشمیر اور پنجاب کی حکومتیں اور سرحدی قبائل۔ انگریزی سرکار یہ چاہتی تھی کہ جہاں تک ہوسکے، جماعت مجاہدین سے براہ راست ٹکر لینے کے بجائے اپنے حلیفوں کے ذریعہ ان کا خاتمہ کردے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہوا، اور برطانوی فوج سے براہ راست ٹکراؤ کی نوبت کئی بار آئی۔ مجاہدین کے پاس تعداد کے علاوہ ہتھیار اور سامان کی بھی کمی تھی، اس کے باوجود کئی لڑائیوں میں کامیاب ہوئے۔

13.14 فرائضی تحریک

پلاسی اور بکسر کی جنگوں کے بعد جب بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قائم ہوگیا، تو مغربی اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے حالات سب سے زیادہ خراب ہوگئے۔ سیاسی میدان میں ان کا کوئی رہنما نہیں تھا، سماج میں قائدین کا طبقہ مفقود تھا۔ علماء کے مقامی زبان نہ جاننے کی وجہ سے عوام کی مذہب سے دوری بڑھتی گئی، بنگالی مسلمانوں نے ہم وطن ہندوؤں کے بہت سے رسم ورواج اختیار کرلئے تھے۔ ان حالات میں بنگال میں فرائضی تحریک کا آغاز ہوا۔

فرائضی تحریک مشرقی ہندوستان کے صوبہ بنگال کی ایک مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی تحریک تھی، جو انگریزوں اور مقامی غیر مسلم زمین داروں کی طرف سے مسلم کاشت کاروں اور بنکروں پر ظلم وستم کے رد عمل میں پروان چڑھی۔ اس کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے، اس تحریک کو "فرائضی" اس لئے کہا جاتا ہے کہ حاجی شریعت اللہ مذہبی فرائض کی ادائیگی پر زور دیتے تھے، اور گناہوں سے توبہ

کراتے تھے۔

13.15 حاجی شریعت اللہ

حاجی شریعت اللہ مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کے ضلع فرید پور میں 1764ء میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں مکہ معظمہ کا قصد کیا، اور حج کیا۔ اور بیس برس عرب میں مقیم رہے اور تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نجد کی محمد بن عبد الوہاب کی تحریک سے متاثر تھے۔ حاجی شریعت اللہ 1802ء میں واپس وطن لوٹے، اور یہاں سماجی، معاشی اور مذہبی اصلاح کا آغاز کیا۔

حاجی شریعت اللہ نے غیر اسلامی رسومات کے خلاف آواز بلند کی، وہ لوگوں کو قرآن مجید کی سادہ تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کرتے، اور بدعات اور رسم ورواج کی مذمت کرتے تھے۔ وہ مسلم معاشرہ کو سنت رسول اور سلف کے راستہ پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلامی مساوات اور اخوت کی تعلیم عام کرتے۔ حاجی شریعت اللہ نے فارسی یا اردو کے بجائے بنگالی زبان استعمال کی، اور اسلام کی مذہبی تعلیمات اور سماجی اصلاحات کے لئے مقامی زبان میں لوگوں کو مخاطب کیا۔ انہوں نے انگریزی حکومت کے قائم ہونے کی وجہ سے بنگال کے علاقہ کو دار الحرب قرار دیا۔ اور مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ اس ملک کو انگریزوں کے قبضہ سے آزاد کرایا جائے۔ اور اس مقصد کی خاطر جہاد شروع کیا جائے۔

حاجی شریعت اللہ نے جو تحریک قائم کی، اس نے مقامی طور پر ان غیر مسلم تاجروں اور زمینداروں کے خلاف بھی آواز بلند کرنا شروع کی، جو مسلم کاشت کاروں پر ظلم کرتے، اور انگریزوں کی مدد کرتے تھے۔ ان تاجروں اور بنیوں کے مظالم کی وجہ سے تھوڑی ہی مدت میں بنگال میں کپڑا، ریشم اور نمک وغیرہ کی بہترین صنعتیں برباد ہو گئیں تھیں۔

بنگال اور آسام کے علاقوں میں یہ تحریک پھیلتی گئی۔ یہ تحریک مظلوم عوام کی رہنمائی کرتی تھی۔ ان کی اتباع کرنے والوں میں کاشت کار اور کپڑا بننے کا کام کرنے والا طبقہ زیادہ تھا۔ حاجی شریعت اللہ نے یہ انقلابی نظریہ پیش کیا کہ "زمین اللہ کی ہے"۔ اور اس کی تبلیغ شروع کی۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ زمین اللہ کی ہے، اس لئے تمہیں نہ تو زمین داروں کو لگان دینے کی ضرورت ہے، اور نہ حکومت کو۔ انہوں نے شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے عدالتیں بھی قائم کیں۔

1840ء میں حاجی شریعت اللہ کی وفات ہوئی، اور وفات سے پہلے وہ بنگال کے کسانوں میں سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کر چکے تھے۔

13.16 دودو میاں

حاجی شریعت اللہ کے بعد اس تحریک کی قیادت ان کے فرزند مولوی محمد محسن الدین نے کی، جن کو 'دودو میاں' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ 1819ء میں پیدا ہوئے، حصول علم کے لئے ان کو مکہ مکرمہ بھیجا گیا، جہاں انہوں نے پانچ سال تعلیم حاصل کی۔ واپس آکر وہ اپنے والد کے ساتھ ہی تحریک کے انتظام میں شریک ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ تحریک کے ذمہ دار قرار پائے۔

دودو میاں خود بھی مذہبی عالم تھے، ان کے نظریہ کے مطابق چوں کہ ہندوستان دار الحرب تھا، اس لئے ان کے متبعین جن کو

'فرائضی' کہا جاتا تھا، جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں پڑھتے تھے، اس مسئلہ میں عام مسلمانوں نے ان سے اختلاف کیا، فرائضی کہتے تھے کہ ہندوستان دار الحرب ہے، اس لئے یہاں جمعہ اور جماعت جائز نہیں ہے۔ اور عام مسلمان جمعہ، جماعت اور عیدین کی نمازیں پڑھتے تھے۔ جب ان مسائل پر عام مسلمانوں اور فرائضیوں میں ہنگامے ہونے لگے تو فرائضیوں نے اپنے جماعت خانے علیحدہ قائم کر لئے۔

دودو میاں نے اس تحریک کو بہت منظم کر دیا، تحریک میں شامل کرتے وقت وہ بھی اپنے والد کی طرح بیعت لیتے، اور گناہوں سے توبہ کراتے۔ انہوں نے ہر گاؤں میں اپنے نائب مقرر کئے۔ دودو میاں سماجی مساوات کی بات کرتے تھے، اور حکومت کے ناجائز ٹیکسوں کی مخالفت کرتے تھے۔ اس لئے کسانوں اور مظلوم عوام میں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی تھی۔ دودو میاں کے زیر اثر فرائضی تحریک کا دائرہ کار بہت وسیع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کے متوازی ایک متبادل حکومت قائم کرلی، اپنی عدالتیں بنائیں۔ مسلمان اپنے مقدمات انہی عدالتوں میں لے کر جاتے۔ اس تحریک نے سماجی اور مذہبی اصلاح کا بہت زبردست جذبہ پیدا کیا۔

اس تحریک کو کچلنے کے لئے انگریزوں اور ہندو زمین داروں نے اس کے خلاف مورچہ سنبھالا، مقدمات چلائے گئے۔ زمین داروں نے تحریک سے وابستہ افراد کو پکڑ کر سزائیں دیں، ان کی داڑھیاں ایک ساتھ باندھ دی جاتیں، اور منہ میں مرچ ڈال دی جاتی تھی۔

دودو میاں کی انقلابی تحریک کی وجہ سے مقامی زمین داروں اور انگریزوں کے لئے نیل کی کھیتی کرنے والے کسان ان کے دشمن ہو گئے، انہوں نے ان کے خلاف متعدد فوجداری مقدمات دائر کر دئے۔ 1858ء کے بعد دودو میاں کو کلکتہ کی علی پور جیل میں قید کر دیا گیا۔ 1860ء میں وہ رہا ہوئے، اور 24/ ستمبر 1862 کو ڈھاکہ میں ان کا انتقال ہوا۔

13.17 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اٹھارویں صدی کے آغاز میں جب ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار مضبوط ہو گیا، اور ہندوستانی ریاستوں کی جانب سے آزادئ وطن کی منظم کوششوں کا خاتمہ ہوا، تو انگریزی اقتدار کے خلاف عوامی تحریکیں شروع ہوئیں۔
- یہ عوامی تحریکیں سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی اصلاح کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ ان میں دو اہم تحریکیں جماعت مجاہدین اور فرائضی تحریک تھی۔
- جماعت مجاہدین کی بنیاد سید احمد شہیدؒ نے ڈالی تھی، جو 1786ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، دہلی جا کر شاہ عبد العزیز کی خدمت میں حاضری دی، اور بیعت کی۔ سید صاحب نے مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کے لئے ہندوستان کے دورے کئے، سماجی برائیوں کو ختم کیا، مساوات کی تلقین کی۔ ہندو مسلم بھائی چارہ کی کوششیں کیں۔
- سید احمد شہید کی کوششوں کا ایک اہم مقصد ہندوستان سے سامراجیت کا خاتمہ کرنا اور انگریزوں کی غلامی سے وطن کو آزاد کرانا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے 1826ء میں ہندوستان کی شمالی سرحد کی طرف ہجرت کی۔ ان کے ساتھ مولانا

عبدالحئ اور مولانا اسماعیل شہید بھی تھے، جو ان کے سب سے قریبی ساتھی اور مددگار تھے۔ سید صاحب نے سرحد کے علاقہ میں 1827ء میں ایک آزاد حکومت قائم کی۔ سید صاحب اس حکومت کے ذریعہ انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ انصاف کی بنیاد پر نظام قائم ہو، اور اللہ کی رضا حاصل ہو۔

- اس دوران آپ کا مقابلہ انگریزوں کی حلیف پنجاب کی حکومت سے ہوا، ساتھ ہی افغانستان کے مقامی قبائل سے بھی مقابلہ ہوا۔ 1831ء میں بالاکوٹ کے میدان میں آپ پنجاب کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔
- سید صاحب کی شہادت کے بعد جماعت مجاہدین کی کمان مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا عبداللہ صادق پوری نے سنبھالی۔ ان کے دور میں جماعت مجاہدین کے انگریزوں سے متعدد مقابلے ہوئے۔
- ہندوستان کے اندر سے مجاہدین کو کمک پہونچائی جاتی تھی۔ اور پورے ملک میں مالیہ اور افراد کی فراہمی کے لئے ایک نظام پھیلا ہوا تھا۔ انگریز حکومت نے اس نظام کو ختم کرنے کے لئے جماعت مجاہدین کے حامیوں پر فوج داری مقدمات قائم کئے، جن کو 'مقدمات سازش' کہا جاتا ہے۔ جماعت مجاہدین کے مددگاروں کو سزائے موت اور عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں، جائدادیں قرق کرلی گئیں، اور ہر طرح سے ان کو پریشان کیا گیا۔
- فرائضی تحریک بنگال کی ایک مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی تحریک تھی۔ جس کی بنیاد حاجی شریعت اللہ نے 1802ء میں ڈالی تھی۔
- حاجی شریعت اللہ نے بنگال کے کاشت کاروں اور کپڑا بننے والوں میں مذہبی اصلاح کا کام کیا، اور سیاسی بیداری پیدا کی، انہوں نے انگریزوں کی حکومت کو غاصب قرار دیا، اور ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا، اور اپنی عدالتیں قائم کیں۔
- انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے والے ہندو زمین داروں کے خلاف بھی آواز بلند کی، جو کسانوں پر ظلم کرتے تھے، انہوں نے زمین داروں کو محصول دینے سے منع کر دیا۔
- حاجی شریعت اللہ کی وفات 1840ء میں ہوئی، ان کے بعد اس تحریک کی ذمہ داری ان کے فرزند محسن الدین نے سنبھالی، جن کو "دودو میاں" کہا جاتا تھا۔ ان کے دور میں فرائضی تحریک کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا، رفتہ رفتہ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کے متوازی ایک متبادل حکومت قائم کرلی، اور اپنی عدالتیں بنائیں۔
- فرائضی تحریک کو کچلنے کے لئے حکومت اور زمین داروں نے فرائضیوں کو سزائیں دیں، اور فوجی مقدمات دائر کئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد دودو میاں کو قید کر دیا گیا، اور 1862ء میں ان کی وفات ہوئی۔

13.18 کلیدی الفاظ

خانوادہ	خاندان
ہراول دستہ	پہلا دستہ
معرکہ	جنگ
متوازی	ساتھ ساتھ چلنے والی
حریت پسند	آزادی کو چاہنے والا
خوانین	خان کی جمع
کمان دار	سردار، کمانڈر
روابط	ربط کی جمع، تعلقات
فرد جرم	الزامات کی لسٹ
”حبس دوام بعبور دریائے شور“	حبس دوام: عمر قید۔ عبور دریائے شور: کھارے پانی کے سمندر کے پار۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ملزم کو انڈمان کے جزیروں میں عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔
فرائض	وہ ارکان، جن کی ادائیگی ضروری ہے

13.19 نمونہ امتحانی سوالات

13.19.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ہندوستان میں انگریز حکومت قائم ہونے کے بعد جہاد کا فتوی کس نے دیا تھا؟

(a). سید احمد شہید (b). شاہ ولی اللہ (c). شاہ عبد العزیز (d). گذشتہ سب

2. جماعت مجاہدین میں سید احمد شہید کے سب سے قریبی ساتھی کون تھے؟

(a). مولانا اسماعیل شہید (b). شاہ عبد العزیز (c). نثار علی (d). مولانا عبد اللہ صادق پوری

3. گوالیار کے کس راجہ نے سید احمد شہید سے ملاقات کی اور جماعت مجاہدین کی مدد کی یقین دہانی کی؟

(a). امیر خاں (b). راجہ رنجیت سنگھ (c). شیر سنگھ (d). دولت راؤ سندھیا

4. جماعت مجاہدین نے آزاد حکومت کب قائم کی؟

(a).1832ء (b).1827ء (c).1802ء (d).1810ء

5. سید احمد شہید نے کس جنگ میں اور کب شہادت پائی؟

(a).بالاکوٹ، 1831ء (b).جنگ امبیلا، 1863ء (c).جنگ اکوڑہ، 1829ء (d).تمام غلط

6. سید احمد شہید کے بعد جماعت مجاہدین کی کمان کس نے سنبھالی؟

(a).ولایت علی عظیم آبادی (b).مولانا اسماعیل شہید (c).مولانا عبدالحئی (d).مولانا محمد اسحاق

7. ہندوستان میں جماعت مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے جو مقدمے قائم کئے گئے، ان کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a).مقدمات سازش (b).مقدمات بغاوت (c).مقدمات غدر (d).سول مقدمے

8. فرائضی تحریک کے بانی کون تھے؟

(a).حاجی شریعت اللہ (b).تیتو میر (c).دودو میاں (d).کرامت علی جونپوری

9. فرائضی تحریک میں کس طبقہ کے لوگ زیادہ شریک تھے؟

(a).تاجر (b).زمین دار (c).کسان (d).طلبہ

10. دودو میاں کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

(a).1862ء، ڈھاکہ (b).1860ء، کلکتہ (c).1840ء، فرید پور (d).1857ء، دہلی

13.19.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت مجاہدین کا پس منظر بیان کیجیے۔
2. سید احمد شہید کی سماجی اصلاح کا خاکہ کھینچیے۔
3. انگریزوں سے مقابلہ میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کی حصہ داری کا جائزہ لیجیے۔
4. جماعت مجاہدین کے حوالہ سے مولانا عبداللہ صادق پوری کی خدمات کا تعارف کرائیے۔
5. فرائضی تحریک کے بانی کی حیثیت سے حاجی شریعت اللہ پر مختصر نوٹ لکھیے۔

13.19.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جماعت مجاہدین کے بانی کی حیثیت سے سید احمد شہید کی حصہ داری پر گفتگو کیجیے۔
2. جماعت مجاہدین کے خلاف بنائے گئے مقدمات سازش پر مفصل نوٹ لکھیے۔
3. فرائضی تحریک پر مضمون لکھیے۔

13.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد

.1	موج کوثر	:	شیخ اکرام
.2	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	:	مسعود عالم ندوی
.3	سیرت سید احمد شہید	:	ابوالحسن علی ندوی
.4	علمائے ہند کا شاندار ماضی	:	سید محمد میاں
.5	جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین	:	غلام رسول مہر
.6	فرائضی تحریک ایک تاریخی جائزہ	:	معین الدین، ترجمہ: ثروت صولت
.7	ہندوستان میں وہابی تحریک	:	قیام الدین احمد، ترجمہ: محمد مسلم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 14: واقعہ 1857ءاور مسلمانوں کی قربانیاں (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 پس منظر

14.3 تاریخی سماجی اور مذہبی پس منظر

14.3.1 اسباب

14.3.2 تحریک و تنظیم

14.3.3 انقلاب کا دائرہ کار

14.3.4 عسکری طاقت اور حکومت سازی

14.3.5 ہندوستانی مذاہب وطبقات کی حصہ داری

14.3.6 انقلاب کی ناکامی کے اسباب

14.4 واقعہ 1857 کے اثرات

14.5 مسلمانوں کی قربانیاں

14.6 اکتسابی نتائج

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

14.0 تمہید

بھارت کی تاریخ میں 1857ء کا واقعہ، وطن عزیز کی پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی شہریوں کا پہلا اجتماعی جذبۂ حریت کا مظاہرہ جس نے انگریزی سامراج کے خلاف، اختلاف میں اتحاد کا شاندار احساس دلایا۔ 1857ء کا واقعہ تاریخ ہند کا وہ سنگ میل ہے جس پر ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے تو ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستانیوں میں وطن کی فطری محبت و الفت، ہندوستانی قومیت کی روح پھونک گیا، ایک نئے حریت پسند ہندوستان کی بنیاد رکھ گیا جس کے سبب ہندوستانی قومیت و شہریت کی تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہا، جس نے ہندوستانیوں کی ہمت و حوصلے کو جذبۂ حریت کے ساتھ ضم اور مدغم کر دیا۔ حصول آزادی کے لئے استقامت کی روح پھونکی اور حریت پسندانہ استقلال کا قومی جذبہ پیدا کیا۔ ہندوستانی زمین سے وابستگی کے فطری رشتے کو مستحکم کیا، سب سے بڑا کرشمہ یہ ہوا کہ جذبۂ حریت کی ایک ایسی مشعل روشن کر دی جس کی روشنی اگلی صدی تک ہندوستانیوں کو وطن دوستی اور خود داری کی راہ دِکھاتی رہی اور یہی روشنی تحریکِ آزادی کی صورت میں خوب واضح ہو گئی جس کے شرارے ۱۵/ اگست 1947 ء کو آزاد ہند کے ہندوستانی شہریوں نے بہت قریب سے دیکھا۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ واقف ہوں گے کہ 1857ء کے انقلاب میں مسلمانوں نے کس طرح سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قربانیاں پیش کیں۔ اس کے اسباب اور سماجی و مذہبی پس منظر کیا تھا ان سے آگاہی حاصل ہو گی۔ اس انقلاب میں کون سے مذاہب و طبقات نے حصہ لیا، ناکامی کے کیا اسباب رہے ان سب کے بارے میں آپ پڑھیں گے۔

14.2 پس منظر

مطالعے کا موضوع ہے: واقعہ 1857ء اور مسلمانوں کی قربانیاں

یعنی موضوع کے دو حصے اور پہلو ہو گئے: پہلے 1857ء کی تاریخ پھر مسلمانوں کی قربانیوں کا تذکرہ

واقعہ 1857ء کو تاریخ ہند میں تین الگ الگ عنوانوں سے لکھا گیا ہے:

1۔ انقلاب اور پہلی جنگ آزادی۔ 2۔ عوامی غدر۔ 3۔ فوجی بغاوت

مذکورہ تینوں گوشے الگ الگ پس منظر رکھتے ہیں، ہر ایک کے الگ الگ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر الگ الگ نام دیا گیا ہے اور ہر ایک کی الگ الگ صورت حال ہے جس کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے بغاوت اور غدر مان لیا گیا ہے۔ لیکن ہر ظالم شخص اور حکومت و نظام کے خلاف ہونے والے ہنگامی اور اقدامی عمل کو بغاوت کہتے ہیں، اس لئے یہ بھی بغاوت ہے کیوں کہ ہر انقلاب کی ابتدا بغاوت سے ہوتی ہے۔ اب ہمیں

موضوع کے تحت درج ذیل عناصر کو بطورِ خاص یاد رکھنا ہے:

1. واقعہ 1857ء کا تاریخی، سماجی اور مذہبی پس منظر اور تناظر
2. واقعہ 1857ء ہندوستانی مورخین کی نظر میں ر برطانوی مورخین کی نظر میں۔
3. کس کی تحریک پر انقلاب برپا ہوا، کس تنظیم یا گروہ نے بغاوت کا راستہ ہموار کیا، کس نے رہنمائی کی۔
4. انقلاب کا دائرہ: بغاوت اور حکومت کے خلاف نفرت اور غصے کا عملی مظاہرہ کس علاقے سے شروع ہوا، ہندوستان گیر کیسے ہوا۔ کون کون سے علاقوں سے انقلابی مجاہدین شامل تھے اور کون لوگ شامل نہیں تھے۔
5. عسکری طاقت اور حکومت سازی: دہلی کے لال قلعہ پر انقلابیوں کا قبضہ اور نئی حکومت کی تشکیل کیسے ہوئی۔
6. مذاہب وطبقات کی حصے داری: کس علاقے سے کس طبقہ نے کس طرح حصہ لیا۔
7. ناکامی کے اسباب: غداری ر مخبری ر معاشی تنگی ر حکمت عملی کا فقدان۔ کون سا پہلو کس حد تک اثر انداز ہوا۔
8. کیا یہ واقعہ 1857ء کے اثرات ہیں کہ برطانوی حکومت کی سختی اور پالیسی میں تبدیلی اور نرمی آگئی۔ زمین دار، جاگیر دار، انگریزی حکومت میں اتحاد ہو گیا۔ اور۔ پیش پیش رہنے والے مجاہدین کا جینا حرام ہو گیا۔ پھر دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کی قربانیاں کیا ہیں۔

14.3 تاریخی سماجی اور مذہبی پس منظر

1857ء کے تاریخی واقعہ کو ہندوستانی اور غیر ملکی مورخین نے اپنی اپنی دلیلوں اور معلومات کے مطابق الگ الگ نام اور عنوان دیے ہیں۔ جیسے: 1۔ ہندوستانیوں کا غدر۔ 2۔ فوجی بغاوت اور شورش۔ 3: پہلی جنگ آزادی

اگرچہ اِن تینوں نظریات کے مبلغین کی اپنی اپنی دلیلیں ہیں اور مختلف نوعیتوں کے اسباب کو بھی سبھی نے بطورِ ثبوت بیان کیا ہے لیکن پہلے دو نظریات کے مبلغین نے بھی غیر شعوری طور پر واقعہ 1857ء کے جنگ آزادی ہونے کی تائید کر رکھی ہے، اس لئے کسی بھی نظریہ کے حامی مصنف اور مورخ نے براہ راست واقعہ 1857ء کو جنگ آزادی ہونے سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لئے اُسے تقابلی مطالعہ، پیش کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔

واقعہ 1857ء کو 'غدر' قرار دینے والوں میں برطانوی مورخین آگے ہیں اور عہد غلامی کے بہت سے ہندوستانی مصنّفین نے بھی اُسے 'غدر' ہی ثابت کیا ہے لیکن برطانوی مورخین اور مصنّفین کا ایک بڑا طبقہ اُسے محض ایک 'فوجی بغاوت' یا 'فوجی شورش' قرار دیتا ہے۔ حالاں کہ دیگر مصنّفین کی طرح اس طبقہ نے بھی لکھا ہے کہ فوجی بغاوت میں عوام وخواص بھی شریک وشامل ہو گئے اور شواہد بتاتے ہیں کہ 1857ء کی جنگ آزادی کو وطن دوستوں کی رہنمائی اور ہندوستانی عوام کی شرکت وشمولیت اور بہت سے خانوادوں، نوابوں اور جاگیرداروں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

سر سید احمد خاں نے بھی اپنی کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں فوجی بغاوت ہی لکھا ہے لیکن برطانوی حکومت کا تنخواہ دار ہندوستانی

شہری ہوتے ہوئے بھی 'عوامی بغاوت' اور 'فوجی شورش' کے فطری اسباب لکھ کر بڑی جسارت کا مظاہرہ کیا ہے اور صاف لفظوں میں واقعہ 1857ء کو "آزادیِ ہند کا پہلا سنگ میل" قرار دیا ہے۔ یعنی 1857ء کے واقعہ کو پہلی جنگ آزادی تسلیم کرنے والے اکثر ہندوستانی مورخین ہیں جنہوں نے بغاوت اور غدر کو بالکل مسترد کر دیا ہے۔

ہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے 1857ء کے واقعہ کو "انقلاب" قرار دیا ہے اور مجاہدین کو 'انقلابی' کہا ہے۔ اُنہی مورخین میں مولانا فضل حق خیر آبادی بھی ہیں جن کو نواب مصطفی حسین خاں شیفتہ جیسے مورخین نے "قائد انقلاب 1857ء" لکھا ہے اور پی۔ سی جوشی جیسے مورخین نے "واقعہ 1857ء کا روح رواں" تسلیم کیا ہے۔ خود مولانا فضل حق نے کالے پانی کی سزا کاٹنے کے دوران جزیرۂ انڈمان میں ہی عربی زبان میں الثورۃ الھندیۃ لکھا ہے جس کا ترجمہ عبد الشاہد شیر وانی نے "باغی ہندوستان" کے عنوان سے کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اگر انقلاب کو بغاوت اور غدر کہتے ہو تو ہم بھی مانتے ہیں لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ 'پورا ہندوستان باغی تھا' اور بغاوت کی آگ ہندوستان کے ہر گوشے میں بھڑک اٹھی تھی۔ "باغی ہندوستان" میں انقلاب کی فطرت کو بھی قائد انقلاب نے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ آزادی کے لئے برپا ہونے والے دنیا کے ہر انقلاب کی دو خوبیاں ہوتی ہیں۔ اول: یہ کہ حکمراں طبقہ حریت پسندوں کو باغی ہی کہتا ہے۔ دوم: یہ کہ آزادی کا ہر انقلاب، بغاوت سے ہی شروع ہوتا ہے۔

جنگ آزادی تسلیم کرنے والے ہندوستانی مورخین نے 'فوجی بغاوت اور ہندوستانیوں کا غدر' کی تاریخ لکھنے والوں کے نظریات کی کمزوری کو کئی تاریخی صداقتوں سے واضح کیا ہے۔

پہلی صداقت: صرف دس دنوں کے اندر صوبہ اودھ میں انگریز حکومت کے ہوش اور پرخچے اڑ گئے اور نام و نشان باقی نہیں رہا۔ کیا یہ صرف مٹھی بھر فوجیوں کی بغاوت کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

دوسری: بہت سے مقامات پر فوجیوں کی سرکشی سے پہلے ہی ہندوستانی شہریوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا، جس کی بہت سی شہادتیں غدر حامی مورخین نے خود لکھے ہیں۔

تیسری: اُسے فوجی شورش کہنا بالکل بے بنیاد ہے کیوں کہ اگر اُس میں ہندوستانی عوام کا کوئی عمل دخل نہیں تھا تو پھر بے شمار دیہاتی مجاہدین اور شہری انقلابیوں کو کس جرم کی بنیاد پر پھانسی دی گئی اور کیوں جرمانے لگائے گئے؟

چوتھی صداقت: مشرقی علاقوں سے اٹھنے والے جہادِ حریت کے طوفان یا بغاوت کی وہ کون سی آندھی تھی جس نے ہزاروں میلوں تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں قائم کمپنی کے نظام حکومت کا تختہ پلٹ کر دیا۔ انگریزی حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا؟ کمپنی کی خراب صورت حال کو بیان کرنے والے مورخین نے بھی یہی لکھا ہے۔

پانچویں: غدر کی وجہ اگر صرف یہ ہے کہ مسلم فوجیوں نے خنزیر کی چربی اور غیر مسلم فوجیوں نے گائے کی چربی والے کارتوس کو چلانے سے انکار کر دیا تو حکومت نے سختی شروع کی، تب فوجیوں نے بغاوت کر دی تو پھر مسلم رہنماؤں اور علمائے ہند کو دہلی، روہیل کھنڈ، اودھ، کان پور، بھوپال اور مراد آباد (وغیرہ) میں چن چن کر پھانسی کیوں دی گئی؟

چھٹی صداقت: اگر باغیوں کا گروہ بالکل بھی غیر منظم تھا جس کا کوئی جاسوس اور مخبری کا نظام نہیں تھا تو مولوی محمد باقر دہلوی کو باغیوں کی ذہن سازی کے نام پر توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑانے کی سزا کیوں دی گئی؟

ساتویں: اودھ، مرادآباد، ہریانہ، بریلی اور دہلی (وغیرہ) میں انقلابیوں کا کوئی رہنما نہیں تھا تو مرادآباد میں مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی کو چوک پر پھانسی کیوں دی گئی؟ مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے علما کو کالا پانی کی سزا کیوں دی گئی۔

14.3.1 اسباب

معروف تاریخ داں، تلمیذ خلدون نے لکھا ہے کہ انقلاب اور بغاوت کا اصلی سبب، شہنشاہیت پرستوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ تھا۔ جب برطانوی سوداگروں نے پرتگیزی، ولن دیزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے ہندوستان کی تجارت سے بے انتہا منافع کمانے کی داستانیں سنیں تو 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام پر ملکہ الزابیتھ اول سے ہندوستان میں تجارت کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ کمپنی نے ہندوستان میں اتنی منافع بخش تجارت کی کہ اس کے ادنی ملازم بھی برطانیہ واپس ہوتے تو ٹھاٹ باٹ کی رہائش کو دیکھ کر برطانوی شہری انہیں 'نواب' کہہ کر مخاطب کرتے۔ 1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام یوروپی کمپنیوں کو ہندوستان کی منڈی سے نکال باہر کیا اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کی قانونی اجازہ داری کے سبب اتنی ترقی پا گئی کہ حفاظت اور تحفظ کے نام پر محافظ اور فوجی رکھنے کا اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا۔ مزید ترقی ملتے ہی کمپنی نے ہندوستانی حریف تاجروں کو بھی دبانا شروع کیا۔ کمپنی، برطانوی مال پر محصول لیتی لیکن ہندوستانی مال تجارت پر محصول نہیں دیتی اور ہندوستان دفاعی پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ کوئی کارروائی کرے۔ جب ہندوستانی مصنوعات کی مانگ بیرون ممالک میں بڑھی تو ہندوستانی تاجرین کی بجائے برطانوی کمپنی کو تجارتی آمدنی کے سبھی ذرائع میسر آ گئے۔ دوسری طرف برطانوی مصنوعات نے ہندوستانی مصنوعات کی تجارت کو تباہ کر دیا جس کی وجہ سے ہندوستان، خام مال کی منڈی اور برطانیہ تیار مال کی کھپت کا سب سے بڑا بازار بن گیا۔

لارڈ ولیم نے برباد ہندوستانی تاجروں، صنعت کاروں اور کاری گروں کی خستہ حالت پر کمپنی کے ڈائریکٹر کو لکھا کہ "تجارت کی تاریخ میں اس پریشان حالی کی نظیر نہیں ملتی، سوتی کپڑا بننے والے کاری گروں کی ہڈیاں سرزمین ہند پر دھوپ میں سڑ رہی ہیں۔"

تجارت میں زوال نے ہندوستانی تاجروں، صنعت کاروں اور کاری گروں کو سب سے پہلے انگریزوں کا دشمن بنایا۔ مناسب وقت کے انتظار میں ہندوستانی صنعت کاروں نے تجارت کی بجائے زراعت کا پیشہ اپنا لیا لیکن کمپنی نے زراعت پر بھی لگان لگا کر انہیں بدحال کر دیا۔ جاگیرداری یا شہنشاہی نظام میں زمین کی ملکیت کا حق صرف کسانوں کو حاصل تھا لیکن کمپنی کے زمانے میں یہ فرض کر لیا گیا کہ سرکار ہی زمینوں کی سب سے بڑی مالک ہے، اس لئے کمپنی قانون کے تحت سبھی کسان، زراعت پیشہ ہندوستانی، زمین دار وغیرہ سبھی مقروض ہو گئے اور تمام قرض خواہوں میں 'بنیا' سب سے زیادہ بے رحم تھا جسے 'ساہوکار' بھی کہتے تھے۔ کمپنی بھی ساہوکاروں کی پشت پناہی کرتی اور مقروض کی زمین بھی قرض کی ضمانت کے طور پر ساہوکاروں کے حق میں رہن قرار دیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قانون کی آڑ میں "بنیا" کو اِس قدر سہولتیں

میسر تھیں کہ جعلی دستاویز بنانے اور جھوٹے گواہ خریدنے کی کاری گری بھی اس کی پونجی تھی جیسے اس کی تجارتی چیزیں اور بہی کھاتے اس کی پونجی تھے۔

انجام یہ ہوا کہ زمین دار، کسان اور زراعت پیشہ خوش حال ہندوستانی، مٹی کے گھروں میں سمٹنے لگے اور اُن کی جائیداد کھانا پکانے کے چند برتنوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف شہر کے وہ خوش حال تاجر جو شاہی اور جاگیرداروں کے درباروں میں عیش و عشرت کے سامان کا اہتمام کرتے، وہ بے روزگار ہو گئے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے بے شمار غریب مزدور شہری بے کار ہو گئے۔ شاہی درباروں میں برطانوی مصنوعات اور جدید اشیائے عیش و عشرت کی درآمد گی نے ہندوستانی دست کاری، صنعت کاری کے گھریلو کاروبار کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ زراعت، صنعت اور ہندوستانی مصنوعات کی تجارت کی بربادی میں وہ شہری بھی آ گئے جو خوش حالی کے دنوں میں نوکر چاکر رکھتے اور خود کچھ کرنے سے جی چراتے تھے، وہ بھی مفلسی اور تنگ دستی کا شکار ہونے لگے اور ہزاروں نوکر چاکر، ملازم بھی اپنا روزگار کھو بیٹھے۔

ہندوستانیوں کی اقتصادی بدحالی اور معاشی بدتری، وہ بنیادی سبب ہے جس نے عوام و خواص کو بالعموم اور غریب شہریوں کو بالخصوص انگریز حکومت سے شدید بے زار کر دیا۔ 1757ء میں پلاسی بنگال کی جنگ اور 1764ء میں بکسر بہار کی جنگ میں فتح یابی کے بعد مشرقی ہند کا یہ پورا خطہ اِس بیزاری کا پہلا مرکز تھا۔ اسی بیزاری نے 1857ء کے انقلاب کو برپا کرنے میں بھرپور مدد کی لیکن غصہ اور جذبات، شعور مندی اور منصوبہ بندی پر غالب رہے، اس لئے ہر جگہ بعد میں ناکامی ہوئی۔ بہر حال اقتصادی بدحالی اور معاشی بدتری پہلا بڑا سبب ہے انقلاب 1857ء کے برپا ہونے کا۔

دوسرا بڑا سبب: کمپنی کی سرکار نے فوجیوں اور ہندوستانیوں کے مذہب، عقائد اور شعار میں مداخلت کرنے کی کوشش کی جس سے ہندوستانی سپاہی آگ بگولا ہو گئے۔ 1850ء میں ایک قانون بنایا گیا کہ ہندو سے عیسائی ہوئے ہندوستانیوں کو اپنے آبائی میراث اور جائیداد پر قابض رہنے کی اجازت دی جاتی ہے اور سارا برصغیر چوں کہ عیسائی طاقت کے ماتحت ہے، اس لئے ہندوستانیوں کے عیسائی مذہب قبول کرنے پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ اس قانون سے یہ افواہ پھیل گئی کہ کمپنی سرکار کے ہندوستانی ملازموں کو سب سے پہلے عیسائی بنایا جائے گا جس سے حاکم اور محکوم کے درمیان رابطہ ٹوٹنے لگا۔ اِس غلط فہمی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو حکومت میں کوئی عمل دخل نہیں تھا، اس لئے جو بھی قانون پاس ہوتا، لوگ سرکار کے مقاصد سے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو جاتے۔ اس لئے جیسے ہی ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کی قانونی اجازت اور "ستی کی رسم" کو ختم کرنے کا قانون بنا جو کہ بذات خود صحیح قانون تھا، تو غیر مسلم سپاہیوں، عام فوجیوں اور عوام نے یہ یقین کر لیا کہ اُن کا ہر قانون ہم کو ہمارے ایمان و اعتقاد اور مذہبی رسوم و تہذیب سے محروم کرنے کے لئے پاس ہوتا ہے۔ آخر کار ہندوستانی، انگریز سرکار کو "ریت کی دیوار" اور ایک "دیرا ثر زہر" سمجھنے لگے۔ ایسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مٹکاف (Metcalfe) نے یقین کر لیا کہ "ایک دن سہانی صبح کو جب جاگوں گا تو مجھے معلوم ہو گا کہ برطانوی تاج ہندوستان سے محروم ہو چکا ہے۔" کرنل سلیمن نے بھی ڈلہوزی کو لکھا کہ "ممکن ہے کہ دیسی ریاستیں کسی دن جان جوکھم کے کام میں متحد ہو جائیں۔"

اُسی یقینی بحران کے زمانے میں کمپنی نے نئے کارتوس رائج کرنے کا فیصلہ کیا جن پر فوجیوں کے خیال میں گائے اور خنزیر کی چربی لگی

تھی جن کے استعمال سے وہ اپنی ذات، دھرم اور دین سے محروم ہوسکتے ہیں۔ بس یہی اتفاقی چنگاری آگ لگانے والی ثابت ہوئی اور پھر کمپنی سرکار سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اب معزول مسلم راجاؤں، رانیوں، بیگموں، حاکموں، جاگیرداروں، زمین داروں، صنعت کاروں، زراعت پیشہ کسانوں، مزدوروں، مسلم رہنماؤں عالموں، معلموں اور پنڈتوں نے اتحاد و یک جہتی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔ اسی مظاہرے کو تاریخ ہند میں "1857ء کا واقعہ" کہا جاتا ہے۔

14.3.2 تحریک و تنظیم

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ کسی بھی حکومت اور ملک و سلطنت کے باغی اپنی خفیہ تنظیم اور سرگرمیوں کے دستاویز تحریری شکل میں کہیں محفوظ نہیں رکھتے، اس لئے اِس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں کہ انقلابیوں اور باغیوں کی تحریک و تنظیم کس نے کی اور کہاں سے رہنمائی مل رہی تھی۔ البتہ 'ہندوستانی بغاوت کی داستان (A Narrative of the Indian Revolt) کے مصنف نے سرخ کنول کے پھول اور چپاتیوں کی کہانیاں لکھ کر بتایا ہے کہ یہی سرخ کنول کے پھول اور چپاتی روٹی انقلابیوں کی جاسوسی اور مخبری کرتے۔ سر جارج نے لکھا ہے کہ "اسی سرخ پھول نے تمام فوجیوں کو متحد کر دیا" انقلابیوں کی خفیہ تنظیم نے مشاورتی اجلاس اور ملاقات کی سہولت کے لیے تیوہاروں کی تقاریب مل جل کر منانے اور اجتماعی دعوت کا سلسلہ بنا رکھا تھا۔ اُنہی تقاریب کے دوران انگریزی سرکار ہندوستانی فوجی، خفیہ مشاورتی اجلاس کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور منتخب سپاہی صوبے داروں کے گھروں میں ملاقات کرتے لیکن اہم معاملوں کا فیصلہ، انقلابیوں کے اعلیٰ افسروں پر چھوڑ دیا جاتا۔ یعنی فوجیوں اور شہریوں کی تحریک و تنظیم کا کارنامہ بڑے افسران اور صوبے دار ہی انجام دیتے جن کو مذہبی رہنماؤں کی پشت پناہی اور حمایت حاصل تھی۔

تلمیذ خلدون نے لکھا ہے کہ دیہی شہری اور فوجی چھاؤنی کے علاقوں میں دورہ کرنے والے مولویوں، فقیروں، گداگروں، مداریوں، سنیاسیوں، پنڈتوں، گائے بچھڑے کا دیوتا گھومانے والوں، جوگیوں اور عالموں کی داستان گوئی سے اردو، ہندی ادب اور ہندوستان کی تاریخ بھری پڑی ہے جو یہاں وہاں پھرتے اور بغاوت کا پیغام پہنچاتے۔ شورش انقلاب سے پہلے چپاتیوں کی تقسیم، آنے والے انقلاب اور بغاوت کے لئے تیار ہو جانے کا اشارہ تھی۔ یہ چپاتی، گندم اور جو کے آٹے سے بنی ہوتی، انسان کی ہتھیلی کے برابر ہوتی جس کا وزن دو تولہ تھا۔ جس کے پاس بھی جاتی وہ ویسی ہی پانچ چپاتیاں مزید بنوا کر قریب کے دیہاتوں اور قصبوں میں پہنچا دیتا۔

اس عوامی اور عام ہندوستانی خفیہ تنظیمی نظام کے باوجود برطانوی افسران کا خیال تھا کہ بغاوت کی تنظیم میں مسلمانوں کا زیادہ اور براہِ راست ہاتھ ہے۔ انگریزی افسر (یونڈجے کیوبراؤن (Rev. J. Cave Browne) نے انقلاب کے برپا ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ "بغاوت کا آغاز دراصل مسلمانوں کی طرف سے ہوا ہے، مسلمان ہی بغاوت کی تحریک میں پیش پیش ہیں اور ہندو اُن کے آلہ کار۔" بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی سنوائی کرنے والے فوجی کمیشن کے ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل میجر ایف جے ہیرٹ کا بیان ہے کہ 'ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم نے تفتیش کی ہے، مسلمانوں کی سازش کے آثار پاتے ہیں لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقہ کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا

ہو۔ہاں مسلمان بادشاہ، ان کے فریب میں پھنسے ہوئے لوگ اور شریک جرم، ایران و ترکی حکومتوں میں خفیہ سفارت خانے، مسلمانوں کی طرف سے ہمارے زوال کی پیشن گوئی، ہماری حکومت کی وارث مسلم سرکار، اسلامی غلبہ کے لیے جہاد اور بغاوت کے بانی مسلمان سپاہی۔'' یہ الیف جے ہیر ٹٹ کی رپورٹ ہے، اس لئے ''سب ٹرن رابٹس'' فیلڈ مارشل، مسلمانوں کو ہمیشہ یہ دِکھانا چاہتا تھا کہ 'خدا نے چاہا تو، انگریز، اب بھی ہندوستان کے آقا ہوں گے۔'' انگریزوں کو بغاوت میں مسلمانوں کا براہِ راست یقین اس لئے بھی تھا کہ چپاتیوں کے ساتھ کچے گوشت کا ٹکڑا بھی تھا جو کہ سبزی خور ہندو نہیں کر سکتے تھے۔

اِن سبھی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1857ء کے واقعہ کو رونما کرنے میں ہندوستانی مسلمان پیش پیش تھے، اس کی تصدیق و تائید سر چارلس مٹکاف کے اِس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ 'مسلمان اور ہندو ہمارے خلاف متحد تھے اور جہاں کہیں باغی، غلبہ حاصل کر لیتے وہاں گاؤکشی ممنوع قرار دے دی جاتی، اس سے واضح ہے کہ بغاوت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مہم تھی۔ کرنل جی جی مالین کے مطابق اودھ میں فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ سازش اور بغاوت کے بڑے لیڈر تھے۔ فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس کی رپورٹ کے مطابق قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے ساتھ باغیانہ مراسلہ نگاری کرنے والے عظیم اللہ، بہار کے کنور سنگھ، جنرل بخت خاں، علی نقی خاں، رنگو پابو جی، تانتیا ٹوپے اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی باغیوں کے رہنما تھے جن کی وجہ سے 31/ مئی 1857ء کو اتوار کے دن پورے شمالی ہند میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور بنگال کی ساری فوج میں بغاوت 10/ مئی 1857ء کو پھیل گئی لیکن عوامی بغاوت میرٹھ سے شروع ہوئی۔ اچانک اٹھنے والی بغاوت سے باغی رہنماؤں کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے اور مہینوں پہلے سے کی جانے والی کوشش کا نشان ملتا ہے، البتہ متحدہ بغاوت کے لئے جد وجہد کرنے کی منصوبہ بندی اور مرکزی کمان کے فقدان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تنظیم کے مستحکم اور مکمل ہونے سے پہلے ہی بغاوت شروع ہو گئی۔

ہو گیے خاک انتہا یہ ہے　　آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

14.3.3　انقلاب کا دائرہ کار

انگریزی سامراج کے خلاف ہندوستانی شہریوں کا غصہ بغاوت بن کر 10/ مئی 1857ء کو میرٹھ میں ظاہر ہوا جس نے صرف ایک ہفتے میں شمالی ہندوستان میں قائم انگریزی نظام کو بری طرح متاثر کر دیا۔ بنگال اور پنجاب کی حدود کے درمیان صرف آگرہ کے اطراف میں انگریزی حکومت اپنی شان سے باقی رہی اور چند دیگر مقامات پر جہاں انگریزی فوجی دستے موجود تھے۔ میرٹھ کے انقلابی، دلی گیٹ سے پایۂ تخت دہلی میں داخل ہونے میں بغیر کسی مزاحمت کے کامیاب ہو گئے، آخری مغل بادشاہ کے قریب پہنچ گئے اور اس کے ''شہنشاہ ہندوستان'' ہونے کا اعلان کر دیا۔ اودھ کا نظام بھی ریت کا گھروندا بن گیا۔ روہیل کھنڈ میں سبھی دیہی علاقے انقلابیوں کے قبضے میں آ چکے تھے۔ بندیل کھنڈ کے ہندوستانی شہریوں نے بھی انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ گنگا جمنا دونوں دو آبے کے درمیان کا علاقہ پنجاب سے بنگال تک انقلاب کا مرکز بن گیا۔ گویا پورا وسطی ہندوستان انگریزی سامراج کے قبضے سے آزاد ہونے لگا تھا۔ گبنس (Gubbins) نے اعتراف کیا ہے کہ ''برطانوی حکومت، صرف صوبائی دارالخلافہ (آگرہ) اور اُس کے گردنواح تک محدود ہو گئی۔''

کانپور میں ناناصاحب نے انقلابیوں کی رہنمائی کی۔ ہر طرف یہی ایک دھن ہر انقلابی پر سوار تھی کہ ''غیر کے جبر کا جوا، اُتار پھینکنے

کا بس یہی موقع ہے۔" دلی آگرہ کے قریب جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے بھی بغاوت کی حمایت کی۔ پٹنہ اور بنارس بھی انقلابی مزاحمت کے گڑھ بن گئے اور پورا بہار، برطانوی سامراج سے آزاد ہونے لگا۔ جہاں بھی فوجی بغاوت شروع ہوتی تو خبر ملتی کہ ہندوستانیوں نے فوجیوں سے پہلے ہی انقلاب برپا کر رکھا ہے۔ عوامی بغاوت اور فوجی شورش کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری اناج کا گودام، اسلحہ خانہ اور سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ فوجی بیرکوں اور سرکاری عمارتوں میں آگ لگا دی جاتی اور جیلوں کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھول دیے جاتے۔ انقلابیوں نے بہت سے بنیوں اور ساہوکاروں کے بہی کھاتے اور دستاویزات بھی نذرِ آتش کر دیے۔ اپنی زمینوں اور مکانوں سے محروم ہو چکے زمین داروں نے اپنی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا، فاتحانہ انداز میں اپنے مکانوں میں آباد ہو گئے۔ بنیوں اور ساہوکاروں کے قرض اور جبریہ ٹیکس کی مصیبت جھیل رہے لوگوں نے انہیں بھی چن چن کر مارا۔ انگریزوں کے خلاف ماحول ایسا خطرناک ہو گیا کہ تاجروں نے اپنی جان بچانے کے لئے انقلابیوں کی مالی مدد کرنے میں ہی عافیت محسوس کی۔

انقلابیوں کا دائرہ پورے شمالی ہند میں پھیلتا گیا لیکن دارالحکومت دہلی پر پوری طرح توجہ دینا کامیابی کے لئے انتہائی ضروری تھا، اس لئے انقلابیوں نے فوجیوں کی مدد سے دہلی میں واقع انگریز فوجی مراکز میں حکومت کے نشانات کو مٹانے کے بعد تحریک انقلاب کو سیاسی طور پر مستحکم کر لیا۔ لال قلعہ پر قابض ہو گئے جہاں ہر قسم کے جنگی ساز و سامان کا ذخیرہ موجود تھا جیسا کہ ایک اول درجہ کے اسلحہ خانہ میں ہونا چاہیے۔ انگریزوں کا بڑا سرکاری خزانہ اور بارود کا گودام بھی اسی میں تھا۔ لال قلعہ کے اطراف کے مسلمانوں کی اکثریت بھی انگریزوں کی شدید مخالف تھی، اس لئے جنگی مصلحت کے اعتبار سے بھی دہلی دارالسلطنت پر انقلابیوں کا قبضہ شدید کاری ضرب تھا۔ لیکن انقلاب کا دائرہ پنجاب کے سکھ سرداروں، ہریانہ، راجستھان، اُودے پور (وغیرہ) راجپوت ریاستوں اور نظام حیدرآباد کے بغاوت میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان گیر نہیں ہو سکا۔ مرہٹے بھی بغاوت سے دور رہے اور سکھ سرداروں نے اس لئے دوری بنالی کیوں کہ وہ اپنے نویں گرو تیغ بہادر کی شہادت کو یاد کرنے لگے۔ پشاور کے تاجر بھی کمپنی سے اپنے بھاری قرض کی وصول کا خیال رکھتے ہوئے بغاوت سے کنارہ کشی کر لی۔ پنجابی سکھوں کے اِس رویے کو سمجھنا دشوار نہیں کیوں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد بدامنی کے دور میں ٹیکس اور محصول کا جو بوجھ بڑھ گیا تھا، کمپنی سرکار نے اس کو پہلے ہلکا کیا پھر بغاوت سے پہلے، صورت حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بالکل ہی اتار دیا۔ البتہ یہ پوری طرح درست واقعہ نہیں کہ پنجابیوں میں صرف سکھوں نے بغاوت میں حصہ نہ لے کر انگریزوں کا ساتھ دیا بلکہ ہندو، سکھ اور پنجابی مسلموں نے بھی مقامی مفادات کے تحت انگریزوں کا ساتھ دیا۔ خلاصہ یہ کہ انقلابیوں کی بغاوت شمالی ہند میں ہی محدود تھی۔

14.3.4 عسکری طاقت اور حکومت سازی

یہ زمینی صداقت ہے کہ غیر ملکی جابر، انگریز حکومت سے نفرت نے شمالی ہندوستان کے شہریوں کو متحد کر دیا یعنی آزادی سے زیادہ "نفرت" واحد بنیاد تھی متحدہ محاذ بنانے کی۔ یہی وجہ ہے کہ آخری پیشوا کے متبنی بیٹے ناناصاحب نے حمایت ضرور کی لیکن دہلی جانے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف بہت سے راجہ اپنی سیاسی دانش مندی سے بھانپ گئے کہ ادنی طبقات کی اعلیٰ طبقات کے خلاف بغاوت سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ زمین داروں اور جاگیرداروں نے بھی راجاؤں کی طرح سوچنا شروع کر دیا جس وقت 11/ مئی 1855ء کو بہادر شاہ ظفر کو

'شہنشاہ ہندوستان' ہونے کا اعلان ہوا تو بڑی ذات کے ہندوستانیوں نے دیکھا کہ جنرل بخت خاں کے دہلی پہنچتے ہی نئی حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا جس میں بہادر شاہ ظفر، ہندوستان کے بادشاہ ضرور منتخب ہوگئے لیکن اصلی قوت، مجلس عاملہ انتظامیہ کو سونپ دی گئی جس کی ذمہ داری حکومتی معاملات کو دیکھنا تھا۔ یہ مجلس عاملہ دس ارکان پر مشتمل تھی۔ اعلیٰ طبقات کے ہندوستانیوں اور بڑی ذات کے لوگوں نے دیکھا کہ باغی انقلابیوں نے نئی حکومت کا جو دستور العمل تیار کیا ہے وہ نہ تو جامع ہے اور نہ کسی جدید حکومت کے اصولوں کے مطابق۔ جس سے انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ انقلابیوں کو جمہوری حکومت کا کوئی تجربہ نہیں کیوں کہ نئی حکومت کی کارروائی کی بنیاد، پنچایتی طریقے پر لگ رہی تھی۔ 8/ اگست 1858ء کو جاری ہونے والے حکومتی فرمان کے بعد بہت سے بڑی ذات کے غیر مسلم زمین دار، جاگیر دار، صنعت کار، اور تاجر انقلابیوں سے الگ ہونے لگے۔ جولائی 1858ء میں مرزا مغل اور جنرل بخت خاں میں جاری کشمکش نے بھی اپنا رنگ دِکھانا شروع کر دیا۔ اُدھر لکھنؤ میں بھی دہلی کی نئی حکومت کے ماتحت ایک نئی مجلس انتظامیہ بنی جہاں انقلابیوں نے سابق بادشاہ کے بیٹے "برجیس قدر" کو تخت پر بٹھایا۔ دونوں جگہ کی مجلس عاملہ یہ غور و خوض کرتی کہ انگریزوں کے خلاف کس طرح کے اقدامات کیے جائیں۔ یعنی انقلابیوں کی سیاسی تنظیم اور متحدہ محاذ کا سب سے بڑا چہرہ جنرل بخت خاں تھے اور نئی حکومت کی مجلس انتظامیہ ہی وہ تنظیم تھی جس کے تحت انقلابیوں کی باغیانہ سرگرمیاں جاری تھیں لیکن مغل شہزادوں اور جنرل بخت خاں کے درمیان اقتدار کی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے کے اندر کی خبر، انگریزوں کو ملنے لگی۔

دہلی دارالسلطنت کی سیاسی اور حکومتی صورت حال یہ تھی کہ انقلابیوں کے ذریعہ ہندوستان کے بادشاہ بنائے گئے بہادر شاہ ظفر نے 16/ جولائی 1858ء کو سوچا کہ اب وہ فقیر بن جائے اور حکومت سے دست بردار ہو جائے، کیوں کہ بحیثیت بادشاہ بھی خود مختار نہیں تھا لیکن جنہوں نے اُسے بادشاہ بنایا تھا، اُن کے ہر ناز و نخرے کو برداشت کرنا اس کی طبیعت کا شیوہ بن گیا۔ لال قلعہ کے بھرے اقتدار خانے میں وہ تنہا محسوس کرتا۔

14.3.5 ہندوستانی مذاہب وطبقات کی حصہ داری

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ طبقہ کے بے شمار لوگ بھی انقلابیوں کی کامیاب بغاوت کا بنیادی حصہ تھے۔ 10/ مئی سے اخیر جولائی 1858ء تک بغاوت کا ابتدائی دور، کامیابی کا دور ہے۔ اس کے بعد انگریزوں سے نفرت کی بنیاد کمزور پڑنے لگے جب مسلح عوام نے اپنے اپنے علاقوں میں آقا بننا شروع کیا۔ دراصل بقول سر سید احمد خاں انقلابیوں کی اکثریت محکوموں کی تھی، حاکموں اور حکمراں طبقے سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ مجلس عاملہ کے ارکان اور منتخب سپہ سالاروں اور بڑے عہدوں پر فائز نئی حکومت کے اہل کاروں کے علاوہ انقلابیوں کی اکثریت نے اعلیٰ طبقات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو بغاوت سے ہی نفرت دِلانا شروع کر دیا۔ اس لئے اعلیٰ طبقوں کے لوگ بغاوت کی ناکامی سے زیادہ بغاوت کی کامیابی سے خوف زدہ ہوگئے یعنی دولت مندوں، زمین داروں، جاگیر داروں، تعلق داروں، بنیوں، ساہوکاروں اور تاجروں نے اگرچہ بغاوت میں حصہ لیا، انقلابیوں کا مالی تعاون بھی کیا، سیاسی پشت پناہی کی اور جنگی سامان فراہم کرنے میں تعاون کرتے رہے اور بہت سے خاموش تماشائی بنے رہے لیکن انہیں خوف ستانے لگا کہ جن انقلابیوں کی اکثریت ہمارے معاشی اور سماجی ظلم و تشدد کا شکار ہو

چکی ہے، وہ کامیاب ہوتے ہی ہم پر غالب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بھاری نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم سے اپنے استحصال کا بدلہ بھی لے سکتے ہیں، اس لیے اِس سوچ اور اندیشہ والے اعلیٰ طبقات کے ہندوستانیوں نے بغاوت سے خود کو دور کر لینا بہتر سمجھا لیکن بہت سے انگریزوں کی حمایت اور تعاون بھی کرنے لگے، برطانوی فوج کو زندگی کی ضرورتوں کا سامان فراہم کرنے لگے اور بھاگے ہوئے برطانوی فوجیوں کو پناہ دینے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ اس کا انعام بھی انہیں بغاوت کے بعد مل گیا کہ سب کی جائیدادیں بحال ہو گئیں اور بہتوں کو اتنے حقوق حاصل ہو گئے کہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اس انقلابی تحریک میں پارسی تاجر، انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی اور انگریزی سرکار کے تنخواہ دار حاکموں کی اکثریت نے بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ یا تو بالکل خاموش رہے یا اپنی ملازمت سے جڑے رہے۔ دوسری طرف والیانِ ریاست بھی بغاوت میں شامل نہیں ہوئے۔ راجاؤں میں صرف جھانسی کی رانی نے مارچ 1858ء میں باضابطہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت شروع کی ورنہ ابتدائی بغاوت میں وہ غیر جانب رہی۔ پہلی جنگ آزادی 1857ء کے انقلاب میں ہندوستان کے سبھی طبقات کے لوگوں نے حصہ لیا لیکن یہ سب شمالی ہندوستان کے شہری تھے جب کہ ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں نے پوری شدت کے ساتھ غیر ملکیوں اور جاگیرداروں کی غلامی سے آزادی کے لئے جانوں کی بازی لگا دی۔ البتہ ان کی رہنمائی کرنے والوں کی اکثریت فارسی دانوں اور مسلم مذہبی رہنماؤں کی تھی یعنی شروع شروع میں بغاوت کی تنظیم اس لئے کی گئی تا کہ انگریزوں سے آزاد ہو کر قدیم معیشت کو بحال کیا جائے لیکن آخر میں یہ بغاوت ملکی زمین داروں اور غیر ملکی انگریزی سامراج کے خلاف کسانوں کی جنگ بن گئی۔

14.3.6 انقلاب کی ناکامی کے اسباب

انقلابیوں نے دہلی، لکھنؤ، جھانسی اور گوالیار میں خوب ڈٹ کر انگریزوں سے کامیاب جنگ کی اور قابل قدر فتوحات بھی حاصل کر لیں لیکن یہ تاریخی سچائی ہے کہ یہ فتوحات اور کامیابیاں، باغی فوجیوں اور جانباز ہندوستانیوں کی کثیر تعداد کی بدولت حاصل ہوئیں، کسی جنگی تدبیر، فوجی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے طفیل نہیں ملیں۔ ہندوستانی مؤرخین کی طرح ایک برطانوی سر جان لارنس نے بھی ایک رپورٹ میں اعتراف کیا ہے کہ ''اگر باغیوں میں ایک بھی قابل رہنما ہوتا تو ہماری نجات کی کوئی امید نہیں تھی لیکن انقلاب کی ناکامی کا بنیادی سبب زمین داروں، تاجروں، صاحبِ جائیداد طبقوں اور اعلیٰ طبقہ کے ہندوستانیوں کی غداری تھی۔'' ان کے علاوہ بھی ہندوستان کی سیاسی اور معاشی آزادی کی جنگ میں انقلابیوں کی شکست اور ناکامی کے چند دیگر اسباب تھے۔

ایک بڑا سبب ناکامی کا یہ تھا کہ جب بغاوت ہوئی تو برطانوی فوج نے افغانستان سے معاہدہ کر کے خود کو محفوظ کر لیا پھر بغاوت سے نپٹنے کے لئے ہندوستان پہنچ گئی اور ہندوستانیوں کی حوصلہ شکنی پر مامور کر دی گئی۔ دوسری طرف انقلابیوں کو مال و دولت کی شدید قلت تھی اور سامان جنگ کی بھرپور کمی بھی پریشان کر رہی تھی۔ چارلس بال کہتا ہے کہ ''اگر بنگال کی فوج کے پاس مینی رائفل بھی ہوتی تو دہلی اب بھی مغلوں کی ملکیت اور قبضے میں ہوتا۔'' ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے پاس ٹیلی گراف کی ایجاد تھی جسے انہوں نے باغیوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس برقی تار نے ہندوستانیوں کے خلاف انگریزی فوجوں کی بڑی مدد کی اور برطانوی فوج کو ناکارہ اور شکست خوردہ ہونے سے بچا

لیا۔ یہ نئی ایجاد باغیوں کے پاس نہیں تھی، اس لئے بروقت کوئی رائے اور ہنگامی فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ایک بڑا سبب ناکامی کا یہ ہے کہ ابتدائی بغاوت بڑی منظم تھی اور چپاتی روٹی اور کنول کا پھول برقی تار کی خدمت دیتے رہے لیکن 1857ء کا سال ختم ہوتے ہوتے اُن کی حیثیت باقی نہ رہی اور وہ منظم جمعیت بکھر تی گئی جس کے بغیر کسی بڑے اور طاقتور دشمن کے خلاف کوئی بھی بغاوت دیر پا نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھانت بھانت کی بولیوں اور تہذیبوں والے مختلف مذاہب کے ہندوستانی انقلابیوں کا شیرازہ بکھر تا گیا جس کی انقلابی فصیلوں میں انگریزوں کی فریبی مخبری اور مغل شہزادوں کے خط و کتابت نے دراڑ ڈال دیا۔

14.4 واقعہ 1857 کے اثرات

یہ حقیقت ہے کہ صرف دو سالوں کے اندر بغاوت کا جوش ختم ہو گیا، بغاوت کچل دی گئی اور بہت سے انقلابیوں کا حوصلہ پست ہو گیا لیکن اس کے اثرات دیر پا ضرور ثابت ہوئے۔ سب سے بڑا یہ اثر ہوا کہ برطانوی حکومت کی سختی اور سخت پالیسیوں میں نرمی آگئی جو عام ہندوستانیوں کے حق میں مفید تھی۔ سر ہنری مین لکھتا ہے کہ '1857ء کے خوف ناک واقعات کے بعد ہندوستان کے برطانوی حکام ملکی رسوم کو بدلنے سے اس طرح خوف کھانے لگے گویا، ان کی رگ رگ میں دہشت سمائی ہوئی ہے۔ "لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا تعلق براہِ راست غیر مسلم ہندوستانی سماج کے لوگوں کے رسوم سے تھا، مسلم سماج کا عوامی طبقہ نے بھی برطانوی فوجی کی نرمی سے فائدہ اٹھایا مگر مسلم سماج کا مذہبی رہنماؤں کا طبقہ کسی بھی طرح برطانوی فوج کی نظر میں قابل معافی نہیں تھا۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے مسلمانوں کی قربانیوں کی خونچکاں خوف ناک داستان۔

14.5 مسلمانوں کی قربانیاں

انقلاب 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں دو طرح کی ہیں:

پہلی یہ کہ مسلم مذہبی رہنماؤں نے خود ہی اپنی شرکت و شمولیت کے ذریعے اپنی قربانی پیش کی اور مجاہدانہ کردار کے ساتھ اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کیا۔ دوسری یہ کہ انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریز حکومت چوں کہ باغی ہندوستانی فوجیوں اور مسلمانوں کو براہ راست بغاوت کا محرک و معاون سمجھتی تھی اس لئے ان کا جینا حرام کر دیا۔ پورے شمالی ہند میں چن چن کر مسلمانوں اور بطورِ خاص مسلم رہنماؤں کو شہید کیا، پھانسی دی اور توپ سے اڑا دیا۔ سب سے پہلے انگریزی سرکار کے ملازم دو لاکھ نوجوانوں کو برطرف کیا گیا جن میں فوجی پولیس کے آدمی زیادہ تھے۔ اس کے بعد عام مسلمان انگریزی غضب اور ظلم و تشدد کے شکار ہوئے جن میں اکثر مسلم مجاہدین اور مسلم رہنماؤں پر فوجیوں کو بغاوت پر اکسانے اور غدر کی منصوبہ بندی کرنے کا مقدمہ چلایا پھر کالے پانی کی سزا دی اور پھانسی دے ڈالی۔ منظر نامے سے غائب رہنماؤں کی تلاش میں آسانی کے لئے جھجھر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے بہت سے مسلم نوجوانوں اور 24/ مغل شہزادوں کو پھانسی دے دی گئی تاکہ لوگ خوف کے مارے اپنے یہاں چھپے ہوئے رہنماؤں کا پتہ بتا دیں۔ اس کے بعد بغاوت میں شریک مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ غیر منتقل جائیدادوں کو تباہ کر دیا گیا، جن پر شمولیت کا شبہ تھا، ان مسلمانوں کی غیر منقولہ جائیداد کا 25/ فیصد

حصہ بطور تعزیری سزا جرمانہ وصول کر لیا جب کہ غیر مسلموں سے صرف دس فیصد وصول کیا گیا۔ اسی طرح جب دہلی پر دوبارہ قبضہ ہوا تو غیر مسلموں کو چند ہی مہینوں میں واپسی کی اجازت مل گئی لیکن مسلمانوں کو 1859ء کے دسمبر تک رہائی کی مہلت نہیں ملی۔

ایک قربانی تو یہ بھی پیش کی کہ بہت سے مسلمانوں نے انگریزی عصری تعلیم سے دوری بنالی اور اپنی نسلوں کو بھی اُس وقت کی عصری تعلیم سے آشنا نہیں ہونے دیا جس کا نقصان یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے مقابلے میں ہندوستانی مسلمان مادی ناداری اور علمی انحطاط کے شکار ہو گئے۔ آنے والے دور میں سرکاری انتظامیہ میں مسلمانوں کا تناسب گھٹ کر چار پانچ فیصد رہ گیا جب کہ اس پچھلے سو سالوں میں تعلیمی ترقی کی بنیاد پر اُنہی کی اجارہ داری تھی۔ مسلم حکومتوں کا زوال ہوتے ہی فارسی زبان کی اہمیت نہ رہی، اس لئے فارسی زبان جاننے والے بھی سرکاری ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کم حیثیت کی ملازمتوں سے بھی مسلمانوں کو دور کر دیا گیا۔ دوسری طرف عصری تعلیم یافتہ غیر مسلم، سرکاری ملازمت اور تجارت میں قدم جما چکے تھے۔

اِس طرح ہندو مسلم دونوں طبقے میں تعلیمی توازن باقی نہ رہنے کی وجہ سے ہندوستان میں ہندو مسلم فرقہ پرستی کی بیماری پیدا ہو گئی اور مستقبل میں اک نیا مسلم دیش پاکستان کے قیام کا سبب بن گئی جس میں ہندوستان کا بہت سا تعلیم یافتہ اور خوش حال مسلم طبقہ اور خاندان و خانوادہ تھا، وہ پاکستان ہجرت کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی بحران اور عصری تعلیم کے فقدان کا، ناسور، آج بھی مسلمانوں کو پریشان کرتا ہے۔ لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی

مسلمانوں کی قربانیوں کا دوسرا پہلو انتہائی دردناک ہے۔ انقلاب 1857ء کی ناکامی کے بعد شمالی ہند کے کئی مقامات پر پوری پوری مسلم آبادی کو شہید کر دیا گیا، معروف اور ممتاز مسلم علماء کو خاص طور پر ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا، بہتوں کو سر عام چوک چوراہوں پر پھانسی دی گئی اور توپوں سے اڑا دیا گیا، جن علماء پر انقلابیوں کی رہنمائی اور بغاوت پر اکسانے کا مقدمہ چلا، ان کو جزیرۂ اندمان میں کالے پانی کی سزا کاٹنے کے لئے بھیج دیا گیا جن میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سر فہرست ہیں۔ انبالہ اور پٹنہ کے بہت سے علماء کو بھی کالا پانی کی سزا ملی جن پر وائے سرائے ہند، لارڈ میوم، کے قتل کی سازش کا مقدمہ چلا۔

14.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- کوئی بھی انقلاب، بغاوت سے شروع ہوتا ہے، اسی لئے تاریخ نگار، کبھی کبھی اُسے بغاوت اور غدر بھی لکھ دیتے ہیں جیسے انقلاب 1857ء کو برطانوی مورخین نے بغاوت اور غدر ہی لکھا ہے لیکن یہ ان کی تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ ہے، نہ کہ بھول چوک۔
- سر سید احمد خاں نے واقعہ 1857ء کو بغاوت قرار دیا ہے اور ''اسباب بغاوت ہند'' نامی کتاب لکھی ہے لیکن انہوں نے ہندوستانی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انقلاب، بغاوت اور غدر سے ہی شروع ہوتا ہے اور صاف لکھا ہے کہ بغاوت کے بغیر، انقلاب برپا کرنا بڑا مشکل ہے۔

- اکثر مورخین نے واقعہ 1857ء کو اگرچہ پہلی باضابطہ جنگ آزادی لکھا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس کے سو سال پہلے سے انگریزوں سے آزادی کی جنگ جاری تھی جیسے پلاسی، بکسر، جوڑہ بریلی اور سرنگا پٹنم کرناٹک کی جنگ لیکن یہ جنگیں الگ الگ علاقوں میں ہوئی ہیں جن میں کسی ایک مسلم حکمران اور نواب کا برطانوی فوج سے مقابلہ ہوا ہے لیکن 1857ء میں ہر طبقہ کے ہندوستانی شہری اور شمالی ہند کے سبھی حکمران، امیر، حاکم اور نواب بھی شامل تھے۔
- واقعہ 1857ء کا دائرۂ کار، شمالی ہندوستان تک ہی محدود تھا کیوں کہ اس میں جنوبی ہندوستان کے حکمران، نواب اور کوئی راجہ مہاراجہ شامل نہیں تھا، اس لئے وہاں کے شہری بھی شامل نہیں تھے۔
- واقعہ 1857ء کے بہت سے اسباب تھے لیکن بنیادی اسباب دو ہی تھے۔ پہلا سبب اقتصادی بدحالی اور معاشی بدتری ہے اور دوسرا سبب مذہبی جذبات سے کھلواڑ کرنے کی برطانوی غلطی جس نے ہندو مسلم فوجیوں میں آگ لگادی۔
- ناکامی کے بعد ناوے فیصد مسلم رہنماؤں، مسلم شہریوں کو ہی اذیت ناک سزائیں دی گئیں، اس لئے کہ برطانوی سرکار کی نظر میں انقلاب 1857ء کے محرک اور قائد مسلم رہنما ہی تھے جیسا کہ پی سی جوشی نے لکھا ہے کہ برطانوی افسران کی نظر میں علامہ فضل حق خیر آبادی دہلی میں اور مولانا احمد اللہ فیض آبادی اودھ میں انقلابیوں کے روح رواں تھے۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کالاپانی کی سزا کاٹتے ہوئے "الثورۃ الھندیہ" کس نے لکھی؟

(a). مولانا فضل حق خیر آبادی (b). مفتی عنایت احمد (c). مولانا حسین احمد مدنی (d). سب صحیح

2. عبدالشاہد شیروانی نے کس کتاب کا ترجمہ کیا؟

(a). الثورۃ الھندیہ (b). کلیلہ ودمنہ (c). دونوں (d). تمام غلط

3. ہندوستانی شہریوں کا غصہ بغاوت بن کر 1857 میں کہاں ظاہر ہوا؟

(a). میرٹھ (b). حیدرآباد (c). پنجاب (d). ہریانہ

4. کس شہر میں نانا صاحب نے انقلابیوں کی رہنمائی کی؟

(a). میرٹھ (b). مرادآباد (c). کانپور (d). غازی پور

5. سرخ کنول کے پھول اور چپاتی روٹی کا واقعہ 1857 میں کیا کردار ہے؟

(a). محض ایک مشرقی سماجی محاورہ اور عوامی طریقہ کار تھا (b). پراسرار مخبری کی علامت تھی

(c). پراسرار جاسوسوں کا رازدارنہ علامتی اصطلاح (d). تینوں خوبیوں نے اپنا اپنا کردار پیش کیا۔

6. برطانوی افسران کی نظر میں مولانا احمد اللہ فیض آبادی کس جگہ انقلابیوں کے روح رواں تھے؟

(a). اودھ (b). ہریانہ (c). دہلی (d). کیرالا

7. واقعہ 1857 کا دائرہ کار کہاں تک محدود تھا؟

(a). مغربی ہندوستان (b). شمالی ہندوستان (c). مشرقی ہندوستان (d). جنوبی ہندوستان

8. مولانا فضل حق نے "الثورۃ الھندیۃ" کس زبان میں تصنیف کی؟

(a). اردو (b). فارسی (c). عربی (d). ہندی

9. کتاب "اسباب بغاوت ہند" کا مصنف کون ہے؟

(a). مولانا حالی (b). سر سید احمد خان (c). مولانا شبلی نعمانی (d). محسن الملک

10. پلاسی کی جنگ کس سن میں ہوئی؟

1750.(a) 1757.(b) 1764.(c) 1770.(d)

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. واقعہ 1857ء کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
2. واقعہ 1857ء کا دائرہ کار کتنا تھا؟ نوٹ لکھیے۔
3. 1857ء میں عسکری طاقت اور حکومت سازی پر گفتگو کیجیے۔
4. انقلاب کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔
5. ہندوستان مذاہب و طبقات کی حصہ داری کا جائزہ لیجیے۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. واقعہ 1857ء میں مسلمانوں کی قربانیوں کا خلاصہ پیش کیجیے۔
2. واقعہ 1857ء کا تاریخی، سماجی و مذہبی پس منظر بیان کیجیے۔
3. واقعہ 1857ء کے اسباب پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ جنگ آزادیِ ہند اٹھارہ سو ستاون۔ مولف: سید خورشید مصطفی رضوی۔ رضا لائبریری، رام پور
2. انقلاب اٹھارہ سو ستاون۔ مولف: سی، پی، جوشی۔ این سی پی یو ایل، نئی دہلی۔ 2013ء
3. باغی ہندوستان۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، مترجم عبدالشاہد خاں شیروانی۔ المجمع الاسلامی، مبارک پور
4. اسباب بغاوت ہند۔ سر سید احمد خاں۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی۔ 1985۔
5. اکمل التاریخ۔ مولانا ضیاء القادری بدایونی۔ تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں۔ 2008

اکائی 15: واقعہ 1857ء اور مسلمانوں کی قربانیاں (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 اسباب

15.3 تنظیم / مذاہب وطبقات کی حصے داری

15.4 علمائے ہند کا کردار

15.4.1 واقعہ 1857 کا مرکزی کردار

15.5 قربانیاں اور تشدد بھری سزائیں

15.6 واقعہ 1857ء، 1947 کی مکمل آزادی کا پیش خیمہ

15.7 واقعہ 1857ء کے خونچکاں اثرات

15.8 واقعہ 1857ء تصویر کا دوسرا رخ

15.9 اکتسابی نتائج

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی سے وابستہ ہے۔ دہلی سلطنت اور مغلیہ دور کی تقریبا آٹھ سو سالہ

حکومت اسی لیے ممکن ہو سکی کیوں کہ اسلام کی خوبیوں نے یہاں کی عوام کو فطرت سے قرب کی بنا پر متاثر کیا اور انہوں نے اس کو قبول کیا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے مسلمان حکمرانوں نے کبھی مذہبی منافرت کو پنپنے نہ دیا بلکہ تکثیری سماج کی ایک عمدہ مثال قائم کی ۔اس لیے جب انگریزوں نے دھوکہ سے ہندوستان کی سیاست اور معیشت کو اپنے قبضہ میں لے لیا تو انہوں نے ہندوستان کی عوام کو اپنا غلام بنالیا۔ اور ان کے خلاف جو احتجاج اور جنگ ہوئی وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ظلم کے خلاف جنگ تھی اور کسی ایک مذہب کے بجائے اس میں تمام ہندوستانی مذاہب اور سماج کے لوگوں نے اسے اپنا فرض سمجھا۔ اس جنگ میں جس نے سب سے پہلے اپنی قربانیاں پیش کی ان میں مسلمان شامل ہیں۔ اس اکائی میں آپ ان ہمہ صفت اور بہادر و بے باک مسلم رہنماؤں کے بارے میں پڑھیں گے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے قائدانہ کردار ادا کیا اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اسی کے ساتھ آپ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے ظلم کے بارے میں بھی آگاہ ہوں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے رول کے بارے میں جانیں اور ملک کی آزادی میں ان کی قربانیوں کا جائزہ لے سکیں۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ مسلمان علماء کے قائدانہ کردار اور ان پر مظالم پر گفتگو کر سکیں گے اور ان کے خلاف انگریزوں کی سازشوں اور اقدامات کا تنقیدی جائزہ پیش کر سکیں گے۔

15.2 اسباب

شمالی ہند میں اپنے استحکام کے بعد انگریزوں نے سازشوں کا جال بچھا دیا۔ ایک طرف ہندوستان کی زراعت اور تجارت و صنعت پر پنجے گاڑ دیے تو دوسری طرف اپنی فریبی حکمت عملی سے اقتدار و حکومت کی کرسی تک پہنچنے کی کامیاب پیش قدمی شروع کر دی۔ اس کے لئے مال و منصب کی لالچ اور دھونس و دھمکی کی ہر تدبیر کو اپناتے ہوئے زمین داروں، تاجروں، بنیوں، راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کے درمیان ایسے "وفادار غدار" تیار کر لیے جو اُن کے اشاروں پر رقص کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے، اس لئے جب سامراجی فریب کاریاں حد سے بڑھنے لگیں تو جنوبی ہند کی طرح شمالی ہند میں بھی جنگی محاذ آرائی کی نوبت آگئی اور بھارت میں انگریزوں سے پہلی باقاعدہ جنگ "پلاسی" بنگال کے میدان میں ہوئی۔ یہ خوں ریز جنگ علی وردی خاں کے نواسے نواب سراج الدولہ اور برطانوی انگریزوں کے درمیان 1757 میں ہوئی جس میں میر جعفر کی غداری سے نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور بنگال کو شدید نقصان پہنچا۔ اِس میں انگریزوں کی زبردست کامیابی کے بعد کمپنی کے فورٹ ولیم کلکتہ میں گویا سونے چاندی کی بارش ہونے لگی اور مرشد آباد ویران ہو کر کلکتہ آباد ہو گیا۔ دولت و کاشتکاری، ہر لحاظ سے بنگال ایک نہایت خوش حال ریاست تھی، اس لئے انگریز اُس سے چمٹ گئے اور اُس کا خون چوسنے لگے۔

اس کے بعد میر قاسم اور نواب شجاع الدولہ سے دوسری باقاعدہ جنگ 1764ء میں بکسر (بہار) کے میدان میں ہوئی جس میں انگریز فوج کامیاب ہو گئی۔ تیسری باضابطہ جنگ 1794ء میں نواب غلام محمد خاں ولد نواب فیض اللہ خاں رامپوری سے "دوجوڑہ" بریلی میں

لڑی گئی، اس سے پہلے 1774ء میں انگریزوں سے حافظ رحمت خاں روہیلہ بھی روہیل کھنڈ میں جنگ میں اپنی طاقت کو تسلیم کرا چکے تھے اور سن 1800ء سے پہلے آخری فیصلہ کن جنگ 1799ء میں ٹیپو سلطان سے سرنگا پٹنم میں ہوئی جس میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک انگریز فوجی کمانڈر نے کہا "آج سے ہندوستان ہمارا ہے" یہاں بھی ایک مسلمان غدار میر جعفر نے اندر سے انگریزوں کی سازشی مدد کی اور ٹیپو سلطان کو شہید کرا دیا۔

اُدھر 1707ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد مغل حکومت کا بھی زوال شروع ہو گیا پھر جتنے بھی مغل حکمراں ہوئے، وہ سب جہاں بینی کی تدبیر، بادشاہی عزم و حوصلہ اور حکمرانی کی صلاحیت سے خالی تھے۔ اس لئے 1803ء میں شاہ عالم کی برائے نام بادشاہت باقی رہ گئی۔ جس حیثیت کی انگریز حکومت کے ایک وظیفہ خوار کی تھی ٹھیک اسی طرح 1801ء میں لکھنؤ کے واجد علی شاہ کو بھی انگریزوں نے ایک معاہدے کا پابند بنا دیا یعنی بادشاہت اور نوابی اگرچہ برائے نام جاری رہی لیکن حکومت انگریزوں کی تھی اور جنوب سے شمال تک پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اگرچہ بہت سی ریاستوں اور علاقوں میں راجاؤں اور مہاراجاؤں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم تھیں۔

1857ء کی عام ناراضگی کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے عدالت عالیہ مدراس و ممبر کونسل "سر میلکم" نے لندن کے ایک رسالہ میں لکھا تھا کہ:

"ہم نے ہندوستانی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مال گذاری وصول کی۔ اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کیے۔"

15.3 تنظیم / مذاہب و طبقات کی حصے داری

اب تاریخی نوعیت کا ایک سوال یہ ہے کہ جب سبھی نواب اور بادشاہ اپنی حکمرانی کھو چکے اور غیر مسلم راجاؤں اور مہاراجاؤں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی تو پھر 1857ء کا واقعہ کیسے پیش آیا؟ کس نے انقلاب کی روح ہندوستانیوں میں پھونک ڈالی اور کیسے انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی انقلابی بن گئے؟ تو یاد رکھیں کہ انقلاب 1857ء کا واقعہ کسی ایک اور کسی اچانک سبب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے کئی ایک تاریخی اسباب تھے۔

پہلا یہ کہ بھارت کے لوگ بطورِ خاص شمالی ہند کے لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہماری زمینوں کی پیداوار کا اصل فائدہ انگریز ہی اٹھا رہے ہیں اور ہماری تجارت و صنعت کا بیشتر فائدہ بھی برطانیہ پہنچ رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ بھارت کے لوگ یہ احساس کرنے لگے کہ ہمیں تو اَن پڑھ رکھنے کی کوشش جاری ہے یا پھر ہماری نسل کو ایسی تعلیم دینے کی تدبیر اپنائی جا رہی ہے کہ وہ بظاہر ہندوستانی ہوں لیکن ان کا دل و دماغ انگریزی ہو۔ تیسرا یہ کہ ہندوستانی عوام نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ انگریز ہمارا سماجی ڈھانچہ توڑنے اور ہندو مسلم منافرت پھیلانے

کی لگاتار کوشش کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے پادریوں اور عیسائی مشینری کے ذریعہ ہمارے مذہب پر حملہ کر رہے ہیں اور ہماری نسل کو عیسائی بنانے کی سازش کامیاب ہونے لگی ہے۔ ہمارے معزز شہریوں کو ذلیل کیا جارہا ہے اور ہمارے علماء کی توہین کی جارہی ہے۔ چوتھا اور مضبوط سبب یہ رہا کہ ہندوستانی عوام نے یہ محسوس کر لیا کہ ہماری زمینوں پر بیرونی انگریز حکومت کر رہے ہیں اور ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کر رہے ہیں۔

یہ چند بنیادی اسباب تھے جو 1857ء کے واقعہ کی بنیاد ہیں لیکن مجموعی طور پر مذہب اور مذہبی جذبات ایسا بنیادی سبب ہے جو سبھی اسباب پر فوقیت رکھتا ہے کہ ہمیں ہماری نسلوں کو زبردستی عیسائی بنادیا جائے اور یہ سوچ شمالی ہندوستان کے ہندو مسلم سبھی مذہبوں کے شہریوں کی مشترکہ سوچ تھی جس نے اپنے اپنے سماج میں 1857ء کے لئے انقلابی پیدا کیے۔

15.4 علمائے ہند کا کردار

روہیل کھنڈ، اودھ اور دہلی، واقعۂ 1857ء کا مرکزی میدان تھے اور ہر جگہ بنیادی طور پر مذہبی رہماؤں کی حوصلہ افزائی اور مقامی پشت پناہی اور علماے ہند کے فتاویٰ، جوشیلے خطابات اور جذباتی خطوط انقلابیوں کا بنیادی سرمایہ تھے۔ دراصل مسلم رہنماؤں کی پشت پناہی نے ہی اودھ، روہیل کھنڈ اور دہلی کے انقلابیوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کا حوصلہ دیا۔ اسی لئے تاریخ ہند میں واقعۂ 1857 کے پیچھے علماے ہند کی تمام کتابوں میں انقلابیوں کی پشت پناہی اور لال قلعہ پر قبضہ کے بعد بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی میں بنی نئی حکومت میں انقلابیوں کی نمائندگی کرنے والے مذہبی رہنماؤں میں سرفہرست مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی، مولانا فیض اللہ عثمانی بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی کفایت علی کافیؔ مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رضا علی بریلوی، مولانا امام بخش صہبائی اور مولانا وہاج الدین مرادآبادی (وغیرہ) شمار کیے جاتے ہیں۔

تاریخی شواہد کہتے ہیں کہ آرہ (بہار) سے فیض آباد (اودھ) لکھنؤ، ککرالہ، بدایوں، میرٹھ اور دہلی تک عوامی شرکت و شمولیت علماے ہند کی قیادت اور سیاسی رہنمائی کی بدولت ہی ممکن ہوسکتی تھی۔ اسی لئے انقلاب 1857 کی ناکامی کے بعد اُس میں کسی طرح بھی اپنا کردار پیش کرنے والوں کو چن چن کر شدید سزائیں دی گئیں اور ان علماے ہند میں صرف مفتی صدر الدین دہلوی، دہلی میں اپنے گھریلو سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے سزایاب نہیں ہوئے لیکن باقی سبھی علماے ہند کو سخت ترین سزائیں دی گئی اور ہر ایک نے اپنی جان ومال کی قربانی پیش کردی۔ ان علماے ہند کے علاوہ بھی بہت سے دیگر مسلم اور مذہبی رہنماؤں کے نام تاریخ ہند میں درج ہیں جیسے:

مولوی محمد باقر دہلوی، بی آمنہ آبادی بیگم، عنایت علی صاحب، بیگم حضرت محل، شہید پیر علی صاحب، علی وارث صاحب، بطخ میاں انصاری، اشفاق اللہ خاں، نواب خاں بہادر، شیخ بخاری صاحب، بہادر شاہ ظفر، بیگم زینت محل، مولانا ابراہیم خاں الوری، شیر علی فریدی، نواب احمد مرزا خاں، مولوی نور علی صاحب، مولوی محمد مرید، مولانا حسن افغانی، آسیہ خاں میواتی، تیتو میر صاحب، عظیم اللہ خاں، خاں عبدالصمد خاں، مولانا محمد میاں، نواب محمد علی خاں، مولانا فقیر محمد راٹھو (وغیرہ)

15.4.1 واقعہ 1857 کا مرکزی کردار

مسلمانوں کی مزید قربانیوں کا تذکرہ پڑھنے سے پہلے تاریخ کی یہ دو سچائی یاد رکھیں:

پہلی یہ کہ واقعۂ 1857ء کی انقلابی پیش قدمیوں کے وقت جنوبی ہند میں سناٹا رہا، وہاں انگریزوں کے خلاف کوئی ہنگامہ اور جنبش نہیں ہوئی۔ نظام حیدرآباد چون کہ انگریز نواز تھے، اس لئے وہ پہلے بھی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے رہے اور 1857 کے عوامی انقلاب میں کوئی مدد نہیں کی اور کسی طرح حصہ نہیں لیا۔ صوبہ پنجاب بھی واقعہ 1857ء سے الگ تھلگ رہا۔ روہیل کھنڈ میں نواب رام پور، نظام حیدرآباد کی طرح انگریز سرکار کے حامی رہے اور مرادآباد میں ان کی ہی پشت پناہی کی۔

دوسرا یہ کہ تانتیہ ٹوپے، ناناپیشوا، منگل پانڈے، رام کنور سنگھ، رانی لکشمی بائی، راجہ ناہر سنگھ، راؤ تلارام جیسے غیر مسلم انقلابی ضرور پیش پیش رہے لیکن مجموعی طور پر ہندو سماج میں وہ جوش و جذبہ نہیں دیکھا گیا جو مسلمانوں نے دِکھایا۔ حالاں کہ انگریز ہندو مسلمان دونوں کا مشترکہ دشمن تھا کیوں کہ ہندو مسلمان ہی ہندوستان کی غالب اکثریت تھے، اسی لئے کئی جگہوں پر ہندو مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور جان و مال کی قربانیاں پیش کیں۔

سی پی جوشی کے مطابق مولانا فضل حق خیر آبادی انقلاب 1857ء کے روح رواں تھے جن کے ہمراہیوں میں مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی تھے۔ یہ دونوں انگریزی سرکار کے اعلیٰ ملازم تھے لیکن انقلاب کی منصوبہ بندی اور آزادی کے ساتھ باغیوں کی رہنمائی کے لیے ملازمت چھوڑ دی اور منصب کو بھی قربان کر دیا۔ ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی کو کالا پانی کی سزا ہوئی اور وصال بھی قید خانے میں ہوا۔ سیلولر جیل کے پاس پورٹ بلیئر میں آپ کا مقبرہ ہے جو مقامی لوگوں کے لئے بڑی درگاہ تسلیم کی جاتی ہے اور مفتی صدر الدین آزردہ اپنے اثر ورسوخ کی بدولت شدید سزا سے محفوظ رہے اور جاں بخشش ہوئی۔ چراغ دہلی میں خواجہ نصیر الدین چشتی کے مزار سے متصل ان کی قبر ہے۔

اِن کے علاوہ دہلی، میرٹھ، مرادآباد، بریلی، بدایوں، رام پور، لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، کان پور، بجنور، آگرہ، شاہجہاں پور کے بہت سے مجاہدین اور قائدین انقلاب کو شدید قسم کی سزائیں دی گئیں جن کی قربانیوں کو دیکھ کر میر تقی میرؔ نے یوں مبارک بادی پیش کی ہے کہ:

شکست و فتح تو قسمت سے ہے، ولے اے میرؔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

انقلابیوں کی رہنمائی کرنے والے اور قیادت کا مجاہدانہ کردار پیش کرنے والے مشہور علمائے ہند کو تاریخ ہند نے الگ سے بطور خاص محفوظ کر رکھا ہے۔ علماء کی فہرست بڑی لمبی ہے لیکن ان کی مرکزی کردار کی بدولت عام طور سے مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین وغیرہ تاریخی علمائے انقلاب کے ساتھ مندرجہ ذیل علمائے ہند کا نام بھی درج پائیں گے۔ علماء کی فہرست یہ ہے:

مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی، مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی، مولانا سید احمد اللہ شاہ فیض آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی (وغیرہ) یہ وہ علمائے ہند ہیں جنہوں نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ یا فتوائے جہاد پر دستخط کیا، جہاد کو عوامی ذہنوں میں پیوست کر کے اُن کے اندر حریت کا جذبہ بیدار کیا،

انقلاب کی عاجلانہ منصوبہ بندی کی، عملی طور پر پیش قدمیوں میں پیش پیش رہے اور بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں روہیلہ، شہزادہ فیروز شاہ مغل اور نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں مرادآبادی کو عسکری قیادت کے لئے تیار کیا۔ مولانا غلام امام شہید، مفتی عبدالوہاب اور منشی رسول بخش کاکوروی نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں انقلابیوں کی قیادت کی اور آزادی کے لئے قربان ہوگئے۔ شہید اشفاق اللہ خاں اور شہید بھگت سنگھ جیسے ہندوستانی انقلابیوں کو قوت فراہم کرنے میں منشی رسول بخش جیسے مذہبی رہنماؤں نے بنیادی کردار ادا کیا۔

15.5 قربانیاں اور تشدد بھری سزائیں

یہاں ایک سچائی تاریخ ہند میں مزید درج ہے کہ ہندو سماج کے مقابلے میں مسلم مذہبی رہنماؤں اور عام مسلم شہریوں میں انقلابی جوش وجذبہ کی واحد وجہ، مسلم مذہبی رہنماؤں اور علمائے ہند کی زبانی اور تحریری رہنمائی اور فتوے کا علم ہونا تھا، علماے ہند کے جہادی فتوے اتنے عام تھے کہ ہر ہندوستانی شہری کی زبان پر اپنے رہنما عالم دین کا نام اور فتویٰ سنا جاسکتا تھا۔ اسی سلسلے کی دوسری بڑی تاریخی سچائی یہ بھی تاریخ میں درج ہے کہ انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو ہی سب سے زیادہ نشانہ بنایا، سب سے زیادہ انہی پر ظلم و تشدد کیا، لاکھوں شہریوں کے ساتھ ہزاروں علمائے ہند کو پھانسی دی اور کالا پانی جزیرۂ انڈمان بھیج دیا۔ اگر ہندو شہری بھی واقعۂ 1857 میں برابر کے شریک ہوتے اور جنگ میں حصہ لیا ہوتا تو مسلمانوں کی طرح انہیں بھی انگریزوں کے ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑتا لیکن وہ محفوظ رہے.

لیفٹیننٹ رابرٹ نے 21 جون 1857 کو جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط برطانیہ بھیجا جس میں اپنی برطانوی قوم کے عزائم اور متحدہ ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک سزائیں دینے اور توپوں سے اڑادینے جیسے افعال کو جس فخریہ انداز میں لکھا وہ انگریزی سرکار کی مشترکہ ذہنیت کی صحیح تصویر ہے اور جس سے یقین کی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے کہ واقعہ 1857 کے بعد برطانوی افسران اور فوجیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جتنا وحشت ناک برتاؤ کیا. مولانا غلام رسول مہر نے اس کے خط کے ایک اقتباس کا ترجمہ اپنی کتاب میں لکھا ہے، اسے پڑھیے:

"سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑادیا جائے کہ یہ ایک بڑا ہی خوف ناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہوسکتے.... ہمارا مقصد ان حریت پسند بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے."

صرف دہلی شہر میں اور اطراف دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو ظالمانہ سلوک کیا، اس کا تصور بھی انتہائی دردناک اور نہایت وحشت ناک ہے، قیصر التواریخ میں سید کمال الدین حیدر نے پورے منظر نامے کا خلاصہ تین چار سطروں میں بیان کردیا ہے:

"ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی کی سزا پائی، سات دنوں تک برابر قتل عام ہوتا رہا جس کا حساب نہیں، انگریز نے اپنے نزدیک گویا، نسل تیموریہ کو نہ رکھا بلکہ مٹادیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو بدسلوکی کیا، وہ بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے بھی دل دہل جاتا

ہے۔"

جب دہلی کے مسلم باشندوں کو خاک وخون میں ملا دیا، ان کے ساتھ بہت سے غیر مسلموں کو بھی نہیں بخشا، بچے کھچے افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک تیموریہ خاندان کو ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں: ایک مغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر حرماں نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر جو، انگریزوں کی قید بامشقت میں تھا، دوسری چیز دہلی کی خالی عمارتیں. اب دل تھام کر ایک انگریز افسر اعلیٰ کا وضاحت نامہ دیکھیں جو دہلی کے افسران اور فوجیوں سے کیا گیا ہے:

"دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دیا جائے کہ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود، دفتری حکومت کا ممنون ہے، دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے ہیں."

(انگریزی روزنامہ "کرانیکل" لاہور 17 اکتوبر 1857)

جن کے خون پسینے کی کمائی سے انگریز ہندوستان میں پھلے پھولے تھے اور جن کی پشتہا پشت کی جمع پونجی کو لوٹ کر برطانیہ جیسے غریب اور پس ماندہ دیش مال دار، صنعتی اور ترقی یافتہ بن بیٹھے تھے، دولت اور آزادی کو چھین لینے کے بعد ان کے مذاہب اور مساجد وعبادت گاہوں میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ 1857 کے انقلاب کے بعد اور آزادی کی چاہت رکھنے کے جرم میں وہ مظالم ہندوستانیوں پر ڈھائے کہ ان کے ذکر سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے. دہلی کی طرح ہندوستان کے باقی دیہاتی علاقوں اور شہروں میں بھی کیا صورت حال تھی، اس کی ایک جھلک دیکھ لیں:

"الہ آباد اور اس کے نواح میں ظلم وجور کی بھٹیاں دہکار کھی تھیں، دو روز میں بیالیس آدمیوں کو پھانسی دی گئی، اور بارہ آدمیوں کو صرف اس لئے موت کی دردناک سزا دی گئی کہ جب "کالم" کوچ کرتا ہوا ان کے پاس سے گزرا تو انہوں نے اپنے منہ کیوں پھیر رکھے تھے. "رینا و" جب کہیں پڑاؤ ڈالتا تو سامنے کے تمام دیہات کو آگ لگوا دیتا."

ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لئے فوجی کمیشن کے روبرو پیش کیا جاتا، یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا، موت کے سوا کوئی سزا نہ تھی اور اثبات جرم کے سوا کسی بھی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا، انگریزی سرکار کا مقصد اس ظالمانہ یک نوعیت کی فوجی عدالت سے یہی ظاہر کرنا تھا کہ بچے کھچے حریت پسندوں اور انقلابیوں کا ساتھ دینے والوں بلکہ انگریزوں کے خلاف خاموش رہنے والوں کو بھی ایسی ہی اذیت ناک سزائیں دی جائیں گی.

خلاصہ یہ کہ انگریزوں نے واقعہ 1857 میں کامیابی کے بعد حریت پسند انقلابیوں اور ان کی حمایت میں خاموش رہنے والوں کے ساتھ بغیر کسی جنسی امتیاز کے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کے اوپر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑ دیے، بطور خاص مسلم گروپوں اور مسلم محلوں دیہاتوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں، ان کی آبادی والے دیہات جلوا دیے، گولا لاٹھی لگا کر درختوں سے الٹے لٹکائے یعنی دیسی پھانسی دی گئی، بے شماروں کو توپ سے اڑا دیا، مال واسباب چھین کر زمین جائداد سے محروم کر دیا، ذاتی اور پشتینی گھروں سے باہر نکال کر شہر بدر کر دیا، اضافی جائدادیں بھی ضبط کر لی گئیں، جن کو زیادہ بڑا مجرم اور انقلابیوں کا رہنما سمجھا، انہیں کالے پانی کی سزا کاٹنے کے لئے جزیرہ انڈمان کے

سلولر جیل میں قید کر دیا گیا، چند ایسی بھیانک سزائیں بھی برطانوی فوجیوں نے ایجاد کیں جن کو برطانوی مصنفین اور برطانیہ کے عوام نے بھی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا ہے.

انگریزوں نے ان مسلم رہنماؤں کو بھی ایک زمانے تک چن چن کر اور تلاش تلاش کر بھیانک سزائیں دی تھیں جنہوں نے فتوی جہاد کی تائید و تصدیق کے طور پر "بیعت جہاد" لینے کی تحریک شروع کی اور خود بھی بیعت جہاد لے کر شمالی ہندوستان میں انقلابیوں کو تیار کرتے رہے اور مجاہدین 1857 کو تازہ دم کرتے رہے لیکن منظر نامے سے ہمیں شہ روپوش رہے یا پھر برطانوی فوجیوں سے مقابلہ کی یا جنگ سے خود کو دور رکھا. جیسے دلاور جنگ بن محمد علی، نواب چیپایین، میر قربان علی جے پوری، محراب شاہ قلندر گوالیاری سے مولانا احمد اللہ شاہ نے 1840ء میں ہی بیعت جہاد لینے کا وکیل بنا دیا تھا پھر ایسے تمام لوگ بیعت جہاد لے کر انقلابیوں کو مجلس علماء تک پہنچاتے یا مقامی انقلابی رہنماؤں تک پہنچا دیتے. مفتی انتظام اللہ شہابی کے بقول بیعت جہاد کی تحریک کمپنی سرکار کے ملازمین میں زیادہ کامیاب رہی کیونکہ کمپنی سرکار کے ہندوستانی ملازمین کمپنی کی بد عہدی، خود غرضی اور بد نیتی کو روزانہ کی بنیاد پر دیکھ رہے تھے اور فرنگیوں کو بالکل قریب سے بے نقاب دیکھا، اسی لئے ان کے اندر کی آگ اور دلوں کا غبار آتش فشاں بن کر 10 مئی 1857 کو پھوٹ پڑا جس کی وجہ سے انگریزی سرکار کو بہت بڑا نقصان ہوا، اسی لئے برطانوی افسران نے بیعت جہاد کے ذریعے انقلابیوں کے دل و دماغ میں آزادی کی روح پھونکنے والوں کو تلاش تلاش کر بھیانک سزائیں دیں.

دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ صاحب بڑے سیاسی اثر و رسوخ والے تھے، انھوں نے بھی فتویٰ جہاد کی تصدیق و تائید کر دی تو صدر الصدوری کا منصب، جائداد منقولہ اور غیر منقولہ چھین لی گئی. چند مہینوں تک نظر بندی کی سزا جھیلتے رہے، رہا ہوے تو غیر منقولہ جائیداد تو واپس مل گئی لیکن منقولہ جائداد نیلام کر دی گئی اور سب سے بڑی سزا یہ دی گئی کہ تین لاکھ روپے کی مالیت کا قیمتی کتب خانہ بھی ضبط کر لیا جس کو واپس حاصل کرنے کے لئے لارڈ کارنس سے پیروی کے لئے لاہور بھی گئے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ.

علمائے ہند کی فہرست میں ایسے بے شمار انقلابی رہنما بھی شامل ہیں جن میں سے بعض تو میدان جنگ میں شہید ہوئے، بہتوں کو روپوشی کی حالت میں گولیوں سے بھون دیا گیا، کتنوں کو پھانسی دے دی گئی اور جو شدید مجرم قرار دیے گئے، انہیں کالے پانی کی سزا کاٹنے کے لئے جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا جیسے مولانا تراب علی خواجہ، مفتی ریاض الدین، مولانا غلام جیلانی، مولانا کریم اللہ، مولانا غلام احمد شہید، مفتی عبد الوہاب، مولانا سرفراز علی شاہجہاں پوری، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا اعتقاد علی بیگ، مولانا نور الحسن اور مولانا رضی الدین بدایونی (وغیرہ)

انگریزی سرکار نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی جواں مردی اور جہاں بانی و حکمرانی حقیقت میں ان کی ایمانی قوت اور اسلامی غیرت کا نتیجہ ہے، اگر ان کے اندر سے یہ سرمایۂ حیات نکال دیا جائے تو بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسکولی تعلیم اور مشینری تبلیغ کے ذریعے مسلم ہندوستانی عوام کو عیسائیت سے قریب کرنے اور مسلم بچوں کو اسلامی تعلیمات و مدارس سے محروم رکھنے کی حکمت عملی شروع کی گئی اور مسلم جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے فرقہ بازی کی سازش رچی گئی اور ایسا ماحول تیار کیا گیا کہ

مسلمانوں کی اکثریت اس تخریب کو تعمیر، بگاڑ کو بناؤ، دشمنی کو دوستی، فریب کاری کو رواداری، فساد کو فلاح و اصلاح اور دین میں مداخلت کو موافقت سمجھنے کی غلطی کرنے لگی اور ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس طریقے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں کہ انڈو اسلامک اسکول، اینگلو عربک اسکول اور اینگلو انڈین مدرسہ کے نصاب اور نظام تعلیم سے دینیات اور اسلامیات کو ایسے نکال باہر کیا گیا کہ آج دینی علوم و فنون کے الگ اسلامی مدرسے ہیں اور عصری دنیاوی علوم کے الگ اسکول کالج کا نظام رائج ہے۔

15.6 واقعہ 1857ء، 1947 کی مکمل آزادی کا پیش خیمہ

بہت سے مورخین نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ 1947ء کی آزادی، واقعۂ 1857ء کے انقلاب کا تاریخی نتیجہ ہے، اس لئے کہ 1947ء کے لئے تحریک آزادی کے حوصلہ مند شہری اور قائد 1857ء سے ہی ملے اور 1857ء کی قربانیوں کی بنیاد پر ہی ان میں لگاتار تحریک آزادی کے لئے لگے رہنے کا حوصلہ دیا یعنی 1947ء میں ملنے والی آزادی کے لئے تحریک کی خاطر پسینہ بہانے والے شہریوں کو واقعۂ 1857ء میں خون بہانے والے قائدین اور قربانیاں پیش کرنے والے ہندو مسلم شہریوں سے ہی ہمت و حوصلہ ملا ہے اور تحریک آزادی میں ہندو مسلم یک جہتی بھی جنگ آزادی 1857ء کی قومی یکجہتی کی بنیادوں پر قائم رہی اور مکمل آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

15.7 واقعہ 1857ء کے خونچکاں اثرات

واقعۂ 1857ء میں مسلمانوں کی قربانیوں کی داستان بڑی تشویش ناک ہے۔ جو ہندوستانی شہری راست انقلاب کا حصہ تھے، ان کو جو سخت سزائیں اور پھانسیاں دی گئی، وہ اپنی جگہ شدید ترین انتقام کی مثال ہیں لیکن جو شہری پشت پناہی کر رہے تھے یا کسی طرح سے مدد کرنے والوں میں شامل تھے، ان کو بھی جان و مال اور مکان کی قربانی دینی پڑی اور بے شمار شہری ایسے بھی تھے جو کسی طرح بھی انقلاب کا حصہ نہیں تھے، انہیں بھی انگریزی افسران کے انتقامی غصے کا شکار ہونا پڑا جس کی گواہیاں خود انگریزوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھ کر محفوظ کر دی ہیں یا بغاوت کی روداد میں بیان کر دیا ہے۔

ایک انگریز فوجی افسر ہنری کوٹن (Henry Cotton) اپنی رپورٹ میں بیان کرتا ہے کہ وہ دہلی دروازہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہو گا جن پر انقلاب کی طرح سے زیادہ سے زیادہ تر کے ردِ عمل اور اُسے کچلنے کے لئے ہم نے ایک یا دو عالم دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ اندازہ کے مطابق تقریباً بائیس ہزار عُلماء کو پھانسی دی گئی۔ (ممتاز عُلمائے انقلاب۔ ص 47)

مسلمان مجاہدین کے نام سے لکھی گئی اپنی کتاب میں ایک غیر مسلم مورخ لکھتا ہے کہ:

"پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا، اُس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور درخت کے نیچے لے جا کر، ان کی گردن میں پھندا ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا گیا۔ لاشیں پھندے میں جھول گئیں، آنکھیں اُبل پڑیں، زبان منہ سے باہر نکل آئیں۔" (ممتاز عُلمائے انقلاب۔ ص 47)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجاہدین اور انقلابیوں کے ساتھ انگریزوں نے کس قدر شدید ظلم و تشدد کا

برتاؤ کیا۔

میجر تھامس (Thamos) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ:

"دہلی کے مسلمانوں کے قتل عام کی عام منادی کی گئی، حالاں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری حکومت کے خواہش مند تھے مگر ہمارے افسر نوجوان تو محض خون بہانے کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی آردلیوں اور پوربی گھسیاروں کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔"

15.8 واقعہ 1857ء تصویر کا دوسرا رخ

1925ء میں مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے "تصویر کا دوسرا رخ" The Other Side of the Medal اس کا ترجمہ شیخ حسام الدین نے 1930ء میں کیا۔ اس کتاب میں انگریزی مظالم کی الگ اور انقلاب 1857ء کی ناکامی کے بعد انقلابیوں اور عام ہندوستانی شہریوں کے ساتھ کیے گئے انگریزی ظلم و تشدد کی الگ داستان لکھی ہے۔ اس کتاب میں مسٹر نکلسن (Nicholson) کا ایک خط درج ہے جو مسٹر ایڈورڈ (Edevards) کے نام ظلم و تشدد کی اجازت لینے کے لئے لکھا ہے اس میں لکھتا ہے:

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کا قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ ہی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر اُن کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں جس ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔" (تصویر کا دوسرا رخ)

نہیں معلوم کہ ایسا کوئی قانون بنا کہ نہیں لیکن خط میں شامل ہر خواہش کو انگریز افسروں اور فوجیوں نے دل کھول کر پوری کی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی جس کی گواہی جنرل نیل (Neill) کے ہدایت نامے میں واضح لفظوں میں موجود ہے جو اُس نے کان پور کے میجر رینا ڈ (Renavd) کو جاری کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"بعض دیہات کو اُن کی مجرمانہ حرکات کی بنیاد پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہو گا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیے جائیں جو، اپنے چال چلن سے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہہ تیغ کر دیا جائے کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں کے سر کاٹ کر وہاں کی بڑی عمارت پر لٹکا دیے جائیں۔" (تصویر کا دوسرا رخ۔ ص 75)

محاصرہ میں لیے گئے ہندوستانیوں کی نگرانی پر مامور سول کمشنر مسٹر گریتھ (Greathed) لکھتا ہے کہ: "دو انگریزوں کے قتل کے عوض پانچ سو باغیوں کی جان لینا ایک ایسا خوف ناک بدلہ ہے جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔" (تصویر کا دوسرا رخ۔ ص 97)

رینا ڈ (Renavd) نامی انگریزی افسر کے ساتھ انگریزی دستے میں شامل ایک فوجی بیان کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اِس کثرت کے

ساتھ پھانسی پر لٹکایا گیا جو بیان سے باہر ہے۔ دو دن کے اندر 42 آدمیوں کو سڑک کنارے پر پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو صرف اِس جرم کی سزا ملی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری تو اُن کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کیے وہاں قرب وجوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔(ص98)

رینالڈ دستے کے اسی فوجی نے بیان دیا کہ آج بھی برطانوی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں حکومت ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آدمی میں سے عورتوں، مردوں، بچیوں اور بوڑھوں کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔ نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی مارنے کی تکلیف کی گئی ہو۔ ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چہار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے، سنگینوں سے وہیں پر ختم کر دیے گئے۔ ایسے بد قسمت انسانوں کی تعداد بہت تھی۔ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو، اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے جن سے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیوں کہ ہم نے اسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔(تصویر کا دوسرا رخ۔ ص112)

انقلاب کے بعد دہلی کے گمنام بازاروں میں ایک منظر پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب ایک انگریز افسر اپنے 20 سپاہیوں کو لے کر شہر میں گشت کو نکلتا ہے تو ہم نے راستے میں 14 عورتوں کو لاشوں میں لپٹے ہوئے بازار میں دیکھا جن کے سر، دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کر دیے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے رونما ہوا کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو، وہ اُن کی عصمت دری کریں گے، اسی لئے اپنے ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب سمجھا گیا جس کے بعد انہوں نے خود بھی خودکشی کر لی۔ ہم نے ان کے خاوندوں کے لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔"(تصویر کا دوسرا رخ۔ ص114)

انگریزوں کے قتل عام اور ظالمانہ تشدد سے متعلق دہلی کا یہ خوفناک پہلو پڑھیے:

"باغیوں کے جرائم کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی کہ ہزارہا مرد و عورت اور بچوں کے بے گناہ خانمابرباد ہو کر ویرانوں اور جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے اُن سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کو کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضے میں کر لیا، باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جن کو وہ اٹھا کر نہیں لے جاسکتے تھے۔"(تصویر کا دوسرا رخ۔ ص116)

اِس سلسلے کا آخری اقتباس ملاحظہ کریں جن میں قربانی کی ایک الگ داستان ہے:

"دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد، انگریز فاتحین نے باشندگانِ دہلی کا قتل عام کیا، باضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے حالاں کہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔"(ص124)

"تصویر کا دوسرا رخ" کتاب کے مصنف ایڈورڈ ٹامسن اس کے باب دوم میں "غدر کے اثرات" عنوان کے تحت اعتراف کرتا ہے کہ:

"غدر سے متعلق تقریباً تمام دستاویزیں، زبان حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔۔"(ص 125)

15.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- برطانوی سرکار کے اعلیٰ افسران اور فوجیوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ہندوستان میں بغاوت یقینی ہے اور قریب ہے کہ اُن کے خون میں اُبال آجائے لیکن انہیں اپنی فوجی طاقت اور عسکری نظام وانتظام پر غرور تھا۔
- بھارت میں انگریزوں سے پہلی باقاعدہ جنگ 1757ء میں "پلاسی" بنگال میں ہوئی جس میں نواب سراج الدولہ کی ناکامی اور برطانوی فوج کی کامیاب کے بعد مرشد آباد بنگال کی دولت فورٹ ولیم کلکتہ میں سمٹ کر چلی آئی اور 1838ء میں کلکتہ برطانوی سرکار کا دارالحکومت بن گیا۔
- سبھی نواب اور بادشاہ اپنی حکمرانی کھو چکے اور غیر مسلم راجاؤں اور مہاراجاؤں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی، اس کے باوجود 1857ء کا واقعہ پیش آیا، شمالی ہند کے شہریوں اور فوجیوں میں انقلاب کی روح داخل ہوگئی۔ انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی انقلابی مجاہدین بن گئے۔ انہوں نے اپنے بنیادی حقوق اور فطری سہولتوں کو غصب ہوتے دیکھا، انہوں نے محسوس کیا کہ آج قربانی نہیں دی تو ہماری نسلوں کو ہمیشہ غلام بنا کر رکھیں گے۔
- شمالی ہند ہی انقلاب کا مرکزی میدان تھا، جن میں روہیل کھنڈ، اودھ اور دہلی یہی تین علاقے انقلابیوں کا مرکزی دائرۂ کار تھے، یہاں ہر جگہ بنیادی طور پر مسلم مذہبی رہنماؤں کی حوصلہ افزائی، مقامی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی پشت پناہی اور علمائے ہند کے فتاویٰ، ان کے جوشیلے خطابات اور تقریریں اور جذباتی خطوط ہی انقلابیوں کا بنیادی سرمایہ تھے۔
- مسلم مذہبی رہنماؤں کی پشت پناہی کی بنیاد پر دہلی کے دور دراز علاقوں سے انقلابیوں کو دہلی کے لال قلعہ تک پہنچانے میں آسانی ہوئی۔ سرمایہ داروں نے خفیہ پشت پناہی اور خود کو انقلاب سے دور رکھنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی اور مجاہدین کو میدان جنگ میں انگریزوں کے خلاف اتار دینا کتنی بڑی حمایت اور پشت پناہی تھی، یہ انقلاب کی ناکامی کے بعد معلوم ہوا جب مسلم مذہبی رہنماؤں اور علمائے ہند کو چن چن کر شدید ترین اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. علامہ فضل حق خیر آبادی، انقلابیوں کے روح رواں تھے یا صرف مسلمانوں کے؟

(a). دونوں کے (b). صرف مسلمانوں کے (c). بہادر شاہ ظفر کے معاون (d). 1857 کے روح رواں

2. انگریز حکومت نے "وفادار غدار" کس طبقے سے حاصل کیے؟

(a). زمین داروں اور تاجروں (b). بنیوں اور صنعت کاروں (c). راجاؤں مہاراجاؤں سے (d). مذکورہ تین طبقے

3. واقعہ 1857 کن کن اسباب کا نتیجہ ہے؟

(a). ہندوستانی شہریوں کا ذلیل کیا جانا (b). ہندوستانیوں کے مذہبی رسوم ورواج کی توہین کرنا

(c). عبادت خانوں کے جاگیروں کو ضبط کرنا (d). اونچے خاندانوں کو برباد کرنا

4. روہیل کھنڈ / اودھ کا انقلاب درج ذیل علمائے ہند کی جاں بازیوں کا نتیجہ ہے؟

(a) مفتی عنایت احمد کاکوروی (b). مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی

(c). مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (d). نار حمت اللہ کیرانوی

5. ہندوستان کے کون سے راجا، مہاراجہ اور نواب 1857 کا حصہ نہیں تھے؟

(a). ریاست پنجاب کے راجہ مہاراج (b). نظام حیدر آباد

(c). نواب رامپور (d). تینوں کے ہم نوا نواب / ریاستیں اور جاگیر دار

6. بکسر کی جنگ میں کس کو کامیابی ملی؟

(a). انگریز فوج (b). افغان فوج (c). ہندوستانی فوج (d). سب غلط

7. بکسر (بہار) کی جنگ کب واقع ہوئی؟

1764.(a) 1526.(b) 1206.(c) 1857.(d)

8. پلاسی کی جنگ میں کس شخص نے غداری کی؟

(a). میر جعفر (b). شاہ عبد العزیز (c). شاہ رفیع الدین (d). شاہ محمد فضل اللہ

9. پلاسی کی جنگ انگریزوں اور کس کے درمیان ہوئی؟

(a). ٹیپو سلطان (b). سراج الدولہ (c). بہادر شاہ ظفر (d). سب غلط

10. بھارت میں انگریزوں سے پہلی جنگ کہاں ہوئی؟

(a). پلاسی (b). بکسر (c). دہلی (d). سیالکوٹ

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. 1857 کی جنگ آزادی کے کیا اسباب تھے؟ بیان کیجیے۔
2. ہندوستان کے شمال میں انگریزوں نے حکومت کے استحکام کے بعد کیا کیا؟ واضح کیجیے۔

3. واقعہ 1857 کے مابعد ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔
4. واقعہ 1857ء میں علمائے ہند کے کردار کو اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔
5. سر میلکم لوئین نے ہندوستانیوں کی عام ناراضی کے کیا اسباب لکھے ہیں؟ بیان کیجئے۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. لارڈ ڈلہوزی نے جس انقلاب کی آہٹ کا اشاریہ دیا تھا، اس کی وضاحت کیجئے۔
2. ناکامی کے اثرات کیا ہوئے اور کیا قیامت برپا ہوئی؟ اپنی معلومات قلم بند کریں۔
3. انقلاب 1857ء کے بعد زیادتر مسلمانوں پر تشدد کیے جانے کی وضاحت تحریر کریں۔

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تحریک آزادی میں علماء کا کردار۔ محمد فصیل ندوی۔ ادارۂ تحقیقات ندوہ، لکھنؤ 2006ء
2. تذکرۂ علمائے ہند۔ مولوی رحمٰن علی۔ مترجم: محمد ایوب قادری۔ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، کراچی 1961ء
3. تواریخ عجیب کالا پانی۔ محمد جعفر تھانیسری۔ دینی تعلیمی بورڈ گلی قاسم جان، دہلی۔ 1969ء
4. دہلی کی آخری بہار۔ راشد الخیری۔ مرتب: سید ضمیر الحسن دہلوی۔ اردو اکادمی، دہلی۔ 2003ء
5. سرگزشت مجاہدین۔ غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور 1956ء
6. شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب۔ محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی 2006ء
7. مکاتیب مرزا مظہر جانِ جاناں۔ مترجم: محمد عمر۔ خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ 1995ء
8. مولانا فضل حق خیر آبادی۔ سلمہ سیہول۔ ممتاز پبلی کیشن، لاہور۔ 2001ء
9. انقلاب ۱۸۵۷ء (تحقیقی مضامین) مرتب: پی سی جوشی) قومی کونسل، نئی دہلی 2013ء
10. سرگزشت دہلی۔ درخشاں تاجور۔ رضا لائبریری، رام پور

اکائی 16: ریشمی رومال اور خلافت تحریک

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 تحریک ریشمی رومال

16.2.1 تحریک کا پس منظر

16.2.2 تحریک کا آغاز

16.2.3 اہم قائدین وارا کین

16.2.4 تحریک کا مقصد اور طریقہ کار

16.3 تحریک خلافت

16.3.1 تحریک کا پس منظر

16.3.2 تحریک کا آغاز

16.3.3 اہم قائدین وارا کین

16.3.4 تحریک کا مقصد اور طریقہ کار

16.3.5 تحریک کے اثرات

16.4 اکتسابی نتائج

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

16.0 تمہید

1857 کی جنگ آزادی کے بعد غیر منقسم ہندستان میں متعدد دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکات کا آغاز ہوا۔ ان میں سے کچھ ختم ہو گئیں اور کچھ آج تک باقی ہیں۔ جو تحریکات ختم ہو گئیں اُن میں دو تحریکات سب سے ممتاز ہیں۔ ایک تحریک ریشمی رومال (Silk Letter Movement) اور دوسری تحریک خلافت (Khilafat Movement) ۔ ان دونوں تحریکوں کے تذکرے کے بغیر ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آیئے! ان دونوں تحریکات کے متعلق بنیادی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہو گا کہ تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت کا آغاز کب اور کیوں ہوا؟ ان کے آغاز کا کیا پس منظر تھا؟ ان تحریکات کے بانیان اور اہم رہنما کون تھے؟ یہ دونوں تحریکیں کن مقاصد کو لے کر اٹھی تھیں؟ ان کا طریقہ کار کیا تھا؟ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان دونوں تحریکوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے اور یہ تحریکات کس طرح اپنے انجام کو پہنچیں؟ ان تمام بنیادی باتوں کو جاننے کے بعد ہمارے ذہن میں ان دونوں اہم تحریکوں کا مرتب خاکہ نقش ہو جائے گا۔

16.2 تحریک ریشمی رومال

ہندستان کی تحریک آزادی میں 1857 کے بعد سب سے بڑی تحریک ریشمی رومال کی تحریک تھی۔ کیوں کہ انگریزوں کو اس تحریک کا جو نقشہ ہاتھ لگا تھا، وہ ایک ریشمی کپڑے پر بنایا گیا تھا، اس لیے انہوں نے اس تحریک کو تحریک ریشمی رومال کا نام دیا۔ پھر اسی نام کو شہرت حاصل ہو گئی۔ یہ نام تحریک کے بانیان و قائدین کا دیا ہوا نہیں ہے۔ یہ ایک خفیہ اور انقلابی تحریک تھی، اس لیے اسے کوئی مستقل نام دینا مصلحت کے خلاف تھا۔

16.2.1 تحریک کا پس منظر

1857 کا انقلاب ناکام ہونے کے بعد پورے ملک میں انگریزی مظالم اپنی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے۔ انگریز انتقامی جذبات سے بھرے ہوئے تھے تو ہندستانیوں پر شدید مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ 1857 کے انقلاب نے امید کی جو کرن روشن کی تھی، وہ ختم ہو چکی تھی۔ انگریز دوبارہ پورے ملک کا کنٹرول سنبھال چکے تھے اور انقلاب کا بدلہ لینے کے لیے ہندستانیوں پر بدترین ظلم و ستم کر رہے تھے۔ ان مظالم کا اصل شکار مسلمان تھے، کیوں کہ 1857 کے انقلاب کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس انقلاب کے سرپرست آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے۔ انگریزوں نے ان کے خلاف عدالتی کارروائی کر کے انہیں جلاوطن کر دیا تھا۔ ان کی جلاوطنی کے ساتھ مغل شہنشاہیت کا سورج غروب ہو گیا۔ ایک طرف مغل شہنشاہیت کے خاتمے کا غم اور اوپر سے انگریزی مظالم۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر مسلمانوں کو سب

سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکے تھے اور یاس و قنوط کے سمندر میں ڈوب رہے تھے۔

اس مایوسی کی تاریکیوں سے امید کی کئی کرنیں روشن ہوئیں۔ ایسی کرنیں جنہوں نے آگے چل کر سورج چاند کی شکل اختیار کرلی۔ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، دیوبندی تحریک اور دارالعلوم دیوبند، تحریک ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی عظیم الشان تحریکیں دراصل اُسی احساس ناکامی کا نتیجہ ہیں، جس احساس نے 1857 کے بعد پوری مسلم قوم کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ایسی ہی تحریکات میں ایک لاثانی تحریک کو تحریک ریشمی رومال کے نام سے جانا جاتا ہے۔

16.2.2 تحریک کا آغاز

سوال پیدا ہوتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز کب ہوا؟ یہ تحریک کس تاریخ کو یا کس سن میں شروع ہوئی؟ لیکن مؤرخین اس سلسلے میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس لاعلمی کی دو بنیادی وجہیں ہیں :

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی خفیہ تحریک تھی، جو انگریزی حکومت کے خلاف چلائی جارہی تھی۔ اس تحریک کا مقصد انگریزی حکومت کا خاتمہ اور اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس تحریک کی بھنک حکومت کو نہ لگ سکے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس تحریک میں سب سے مرکزی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔ تحریک ریشمی رومال برپا کرنے کی پاداش میں انہیں جلاوطن کرکے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے رہائی ملی تو اس کے چند ماہ بعد ہی 30/نومبر 1920ء کو شیخ الہند کی وفات ہوگئی۔ تحریک کے آغاز وارتقاء کے سارے راز ان ہی کے سینے میں موجود تھے۔ اُن کی وفات سے یہ راز ہمیشہ کے لیے راز ہی رہ گئے۔

اس کے باوجود اندازہ یہ ہے کہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز 1857 کے انقلاب کی ناکامی کے کچھ برسوں بعد ہوا۔ کیوں کہ 1857 کی ناکامی کی تلافی کرنے کے لیے 1866 میں دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا۔ اس ادارے کے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ دارالعلوم میں استاد مقرر ہوگئے۔ تمام تاریخی حوالے بتاتے ہیں کہ شیخ الہند نے دارالعلوم میں تدریس کے ساتھ ساتھ انقلابی مزاج بنانے پر بھی پوری توجہ رکھی۔ اس ذیل میں وہ خاص طور پر افغانستان اور صوبۂ سرحد کے طلبہ کی خصوصی تربیت کرتے رہے۔ آگے چل کر جب تحریک اپنے عروج پر پہنچی تو اس کے اہم قائدین و کارکنان میں اکثر لوگ اُن کے شاگرد ہی تھے۔ اس لحاظ سے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز 1857 کے پندرہ بیس برس بعد ہوا۔

16.2.3 اہم قائدین وارا کین

تحریک ریشمی رومال میں سب سے مرکزی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔ ان ہی کو اس تحریک کا بانی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے فوجی تربیت، عسکری تنظیم اور عوام میں انگریزوں کے خلاف بغاوت پیدا کرکے ان کے اندر جذبہ جہاد پیدا کرنے کے لیے متعدد شاگردوں اور فیض یافتگان کو متعین کیا تھا۔ آیئے! ان شخصیات کے متعلق مختصر معلومات حاصل کرتے ہیں:

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

مولانا محمود حسن دیوبندی 1851 میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزز اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اسلامیات اور عربی زبان و ادب کے ممتاز عالم اور دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ مولانا محمود حسن دیوبندی نے اپنے چچا مولانا مہتاب علی سے درس نظامی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور 1869 میں تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد دو سال بانیِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس قیام کرکے حدیث کی اعلیٰ کتابیں خصوصیت کے ساتھ پڑھیں۔ مولانا حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے تصوف و سلوک کی تربیت لی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ 1873 میں دارالعلوم دیوبند میں استاد مقرر ہوئے، 1878 میں طلبہ کی ذہن سازی اور فکری تربیت کے لیے ثمرۃ التربیۃ کے نام سے ایک انجمن قائم کی، 1909 میں اس تنظیم کو وسعت دے کر جمعیۃ الانصار کے نام سے مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تنظیم کی شکل دے دی، 1913 میں معاشرے میں قرآن کی روح بیدار کرنے، علماء کو قرآن سے وابستہ کرنے اور دانشوروں کو اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب فراہم کرنے کے لیے نظارۃ المعارف القرآنیۃ کے نام سے ایک تنظیم کا آغاز کیا اور دہلی کو اس کا صدر دفتر قرار دیا۔ اس درمیان وہ تحریک ریشمی رومال کے لیے قائدین اور کارکنان کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ لیکن اب تک اُن کو ایک عام عالم دین اور تدریس کے فرائض انجام دینے والا ماہر استاد ہی سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ مسند تدریس پر بیٹھے بیٹھے نہایت خاموشی کے ساتھ کتنی عظیم انقلابی تحریک برپا کیے ہوئے ہیں۔

انگریزوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ مولانا محمود حسن دیوبندی کی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ اُن کی نظر میں مولانا کی سرگرمیاں مشکوک تو تھیں، لیکن ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ 1915 میں انگریزی حکومت نے مولانا محمود حسن دیوبندی سے ایک فتوے پر دستخط کرانے چاہے۔ اُس فتوے میں خلافت عثمانیہ کی مخالفت کی گئی تھی اور خلافت کو مسلمانوں کی نمائندہ حکومت نہ قرار دیے جانے کی بات کہی گئی تھی۔ مولانا نے انگریزوں کی اس خواہش کو بری طرح ٹھکرا دیا اور اُس فتوے پر دستخط نہیں کیے۔ انگریزوں کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا اور وہ مولانا کی گرفتاری کی تیاری کرنے لگے۔ مولانا کو انگریزوں کے عزائم کا علم ہو گیا اور وہ دارالعلوم دیوبند میں اپنے شاگردوں کو ذمہ داریاں سونپ کر حجاز مقدس روانہ ہو گئے۔ مولانا کی شہرت اور مقام کی وجہ سے انگریزی حکومت چپ چاپ گرفتاری کرنا چاہتی تھی، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور مولانا حجاز پہنچ گئے۔

حجاز جاکر انہوں نے ترکی خلافت کے وزیر دفاع (Defence Minister) انور پاشا، ترکی کے گورنر غالب پاشا اور شام کے گورنر جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں۔ انہیں اپنی تحریک کے تعاون پر آمادہ کیا اور اپنی تحریک کے مقاصد کا حامی بنایا۔ اسی درمیان انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

اُدھر ہندستان میں انگریز جب مولانا محمود حسن دیوبندی کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مولانا کے رشتہ داروں، شاگردوں، مریدوں اور قریبی لوگوں پر سختیاں کرنی شروع کر دیں۔ بہت سے لوگوں کو بڑے بڑے لالچ بھی دیے گئے۔ آخر کار انہیں جاسوسی کے نتیجے میں مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک کا سراغ مل گیا۔ اس سے انگریزوں کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی اور انہوں نے کسی

بھی قیمت پر مولانا کی گرفتاری کا فیصلہ کرلیا۔ مکہ مکرمہ کا گورنر شریف حسین جسے عام طور پر شریف مکہ جاتا ہے، اُن دنوں ترکی سلطنت سے غداری کرکے انگریزوں کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے مولانا محمود حسن دیوبندی کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے مولانا اور ان کے رفقاء کو کالا پانی بھیج دیا۔ یہ 1916 کا واقعہ ہے۔

مئی 1920 میں مولانا محمود حسن دیوبندی کو رہا کر دیا گیا۔ وہ پانی کے جہاز سے بمبئی پہنچے تو ان کا استقبال کرنے کے لیے گاندھی جی سمیت اکثر مسلم قائدین موجود تھے۔ اُس وقت ملک میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ اگرچہ ریشمی رومال تحریک ختم ہو چکی تھی اور مولانا محمود حسن دیوبندی مسلسل بیمار رہنے لگے تھے، اس کے باوجود انہوں نے تحریک خلافت کو بھرپور تقویت پہنچائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس میں حصہ لیا اور تاسیسی اجلاس کی صدارت فرمائی۔ جمعیۃ علماء ہند کو مضبوط کیا۔ اس طرح کی متعدد سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے 30 / نومبر 1920 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ حادثہ دہلی میں پیش آیا۔ جنازہ دیوبند لے جایا گیا۔ دہلی سے دیوبند تک متعدد مقامات پر جنازے کو روک کر نماز ادا کی گئی۔ آخر کار دیوبند میں اپنے استاد مولانا محمد قاسم نانوتوی کی پائنتی میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی 1872 میں ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتداء سے تلاش و جستجو کا ذہن پایا تھا۔ اس لیے اپنے آبائی مذہب پر غیر مطمئن رہے۔ کم عمری میں ہی اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کی اور مسلمان ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تربیت میں رہے۔ قرآن کریم کے متخصص اور امام ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار کے ماہر تھے۔ آگے چل کر شیخ الہند نے انہیں دیوبند اور دہلی میں ہندوستان کے مشہور اور بڑے مسلم لیڈروں اور سیاستدانوں سے متعارف کرایا۔ تحریک ریشمی رومال میں کلیدی ذمہ داریاں دیں اور پھر ان کو کابل بھیج دیا۔ تحریک ریشمی رومال کا تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ جلاوطنی میں گزارا اور بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ افغانستان، ترکی، روس، عرب اور ایران وغیرہ کا سفر کرکے تحریک آزادی کی کامیابی کی راہیں ہموار کرتے رہے۔ انگریزی حکومت کی پابندی کی وجہ سے پچیس سال ہندستان سے باہر رہے۔

شیخ الہند کے انتہائی معتمد رفیق، اور جانثار شاگرد بلکہ ان کے دست راست تھے۔ نہایت ذکی، ذہین و فطین، مدبر، سیاستداں اور بہترین منصوبہ ساز دماغ پایا تھا۔ برطانوی حکومت کی رپورٹوں میں ریشمی رومال تحریک کا بانی انہی کو بتایا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ الہند کو اپنے منصوبے میں شریک کیا تھا۔ لیکن خود مولانا عبید اللہ سندھی کی کتابیں اس کی تردید کرتی ہیں۔ انہوں نے بہت وضاحت کے ساتھ بار بار لکھا ہے کہ انہیں اُن کے استاد و مرشد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے تحریک میں لگایا تھا اور انہیں مختلف ذمہ داریاں سونپی تھیں۔

جب تحریک ریشمی رومال ختم ہو گئی اور اس کے تمام ارکان گرفتار ہو کر انگریزوں کے شکنجے میں آ گئے تو مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی کابل میں نظر بند کر دیا گیا۔ پھر جلد ہی رہا کر دیے گئے تو کچھ دن عرب میں گزارے۔ 1939 میں دوسری جنگ عظیم کی ابتداء میں صوبوں میں جب کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں تو اسی دور میں ان پر لگی پابندی اٹھالی گئی اور مولانا ہندوستان واپس آ سکے۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے

مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے لاہور پہنچے اور وہیں مستقل قیام فرمایا۔ وہاں بیت الحکمت قائم کر کے علماء کو فلسفۂ ولی اللّٰہی کا درس دینے لگے۔ 1944 میں وفات پائی۔ ایک درجن کتابیں علمی یادگار چھوڑیں۔

مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری

مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری کی پیدائش 1854 میں انبالہ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم رامپور میں اور اعلیٰ تعلیم مظاہر علوم سہارنپور میں حاصل کی تھی۔ وہ اپنے عہد کے مشہور بزرگوں میں تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ تھے۔ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ شیخ الہند کے نہایت مخلص و معتمد دوست تھے۔ شیخ الہند نے ابتدا میں ان کو اپنی تحریک میں شریک نہیں کیا تھا، لیکن مولانا رائے پوری کو جب یہ خبر پہنچی کہ شیخ الہند لوگوں سے انگریزوں سے بیعت جہاد لے رہے ہیں تو وہ سخت پریشان ہوئے کہ اگر حکومت کے مخبروں نے یہ خبر پہنچادی تو اس کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا عبد الرحیم رائے پوری نے شیخ الہند سے ملاقات کی اور تنہائی میں کھل کر ساری صورت حال پر گفتگو کی۔ شیخ الہند نے انگریزی حکومت کے ظلم و ستم، مسلمانوں کے مسائل اور ممالک اسلامیہ پر انگریزوں کے حملے اور ترکی خلافت کو مٹانے کی کوششوں کا ذکر کر کے بتایا کہ اس حکومت کا تختہ پلٹنا ہماری مذہبی ذمہ داری ہے۔ اس تفصیلی گفتگو کے بعد مولانا رائے پوری شیخ الہند کے ہم خیال ہو گئے، پھر تو یہ روابط اتنے مضبوط اور مستحکم ہو گئے کہ ہر اہم مسئلہ میں باہمی صلاح و مشورہ ہوتا۔ جب اپنی تحریک کے سلسلہ میں شیخ الہند حجاز گئے تو مولانا رائے پوری کو اپنا قائم مقام بنایا اور تمام کارکنوں کو ہدایت فرمائی کہ مولانا رائے پوری کو میرا قائم مقام سمجھنا، اہم معاملات میں ان سے مشورہ لینا اور ان کو حالات سے ہر وقت باخبر رکھنا۔ شیخ الہند کے حجاز جانے کے بعد مولانا رائے پوری نے ہی تحریک ریشمی رومال کا سارا نظام سنبھالا۔ وہ پوری احتیاط اور حکمت کے ساتھ مسائل حل کرتے اور ضروری ہدایات دیتے تھے۔ 1919 میں وہ بیمار ہوئے اور کچھ دن بعد وفات پائی۔ شیخ الہند کو مالٹا کی جیل میں جب یہ خبر پہنچی تو شیخ الہند کو سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے ایک مرثیہ بھی لکھا۔

خان عبد الغفار خاں

ہندستان کی جنگ آزادی میں خان عبد الغفار خاں کا نام اور کام روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ پشتون قوم کے سب سے بڑے لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ 1890 میں پیدا ہوئے اور 1988 میں وفات پائی۔ گاندھی جی کے بڑے مداح اور ان کے عدم تشدد کے نظریے کے پرجوش حامی ہونے کی وجہ سے انہیں ''سرحدی گاندھی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرحدی علاقوں میں وہ ''باچاخان'' کے نام سے معروف تھے۔ انہوں نے ''خدائی خدمت گار'' کے نام سے ایک تنظیم شروع کی تھی، جسے سرخ پوش فوج بھی کہا جاتا ہے۔ اس تنظیم نے سرحد میں انگریزی ڈپلومیسی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تحریک عدم تعاون یا نان کو آپریشن کی تحریک کے زمانہ میں بڑے جرات مندانہ کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے اپنی فوج کے ساتھ برطانوی حکومت کے خلاف قصہ خوانی بازار میں انگریزی توپوں اور مشین گنوں کا مقابلہ کھلے ہوئے سینوں سے کیا تھا، جس کے نتیجے میں انگریزی فوج نے سات سو لاشیں بچھادی تھیں۔

خان عبدالغفار خاں کے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ الہند سے بیعت بھی تھے۔ شیخ الہند سے ان کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال کے ہم نوا بھی تھے۔

خان عبدالغفار خاں نے تحریک خلافت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ اس کی پاداش میں تین سال جیل کاٹی۔ گاندھی جی کے نمک آندولن میں بھی پیش پیش رہے۔ انہوں نے 1960 سے 1970 کی مدت بھی جلاوطنی میں گزاری۔ 1987 میں انہیں ہندستانی حکومت نے بھارت رتن سے نوازا۔ اس طرح وہ بھارت رتن حاصل کرنے والی پہلی غیر ہندستانی شخصیت بن گئے۔ اگلے ہی سال 1988 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے تقریباً سو سال عمر پائی۔ یہ پوری عمر بہت افراتفری، ایثار اور قربانیوں سے بھری ہوئی تھی۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہندوستان کے ایک نامور ڈاکٹر، مشہور سیاستداں اور قد آور رہنما تھے۔ وہ مسلم لیگ کے بھی صدر رہے اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے بھی۔ گاندھی جی سمیت ملک کے تمام بڑے لیڈران ہی کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے۔ اُن کی کوٹھی دریا گنج، دہلی میں واقع تھی اور آزادی ہند کا بڑا مرکز تھی۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری 1880 میں محمد آباد، غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں اور اعلیٰ تعلیم مدراس میڈیکل کالج، اور لندن، انگلینڈ سے حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی ہندستان کی تحریک آزادی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ وہ اُس وقت کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے وابستہ رہے۔ دونوں کو قریب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ تحریک ریشمی رومال اور اس کے بعد تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ 1928 سے 1936 تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر رہے۔ 1936 میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی لیے وہ شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال میں بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔ دہلی میں شیخ الہند اُن کی کوٹھی پر بھی قیام کرتے تھے۔ اپنے مرضِ وفات میں شیخ الہند ان ہی کے زیر علاج تھے اور ان ہی کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ وہیں شیخ الہند کی وفات ہوئی اور وہیں اُن کی پہلی نماز جنازہ ادا کی گئی۔

تحریک ریشمی رومال میں ڈاکٹر انصاری کے کردار اور شیخ الہند سے ان کے قریبی مراسم کے متعلق اسیر اَدروی کا یہ بیان اہمیت کا حامل ہے کہ ”اگرچہ ان کی آمدورفت دیوبند نہیں تھی لیکن شیخ الہند سے بے انتہا عقیدت اور ان کی تحریک سے وابستگی رکھتے تھے۔ دہلی میں رہ کر مالی تعاون برابر کرتے رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق کی دیوبند آمدورفت زیادہ تھی۔ وہ شیخ الہند سے غالباً بیعت بھی تھے۔ ڈاکٹر انصاری کی اونچی سوسائٹی اور حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کے یہاں آمدورفت تھی، بہتوں سے روابط اور تعلقات تھے، اس لیے بہت سے ایسے امور سے بھی ان کو واقفیت ہو جاتی تھی جن سے دوسروں کو نہیں ہوتی تھی۔ انہیں ذرائع سے شیخ الہند کے بارے میں حکومت کے اندرونی حلقوں میں جو گفتگو چل رہی تھی ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ملی۔ انہوں نے ہی شیخ الہند کو سفر حجاز کا مشورہ دیا تھا اور ان کے رفقاء کے اخراجات ٹکٹ اور سفر خرچ کا انتظام اپنی جیب خاص سے کیا تھا۔

تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی حضرت شیخ الہند اور ان کی تحریک اور سیاسی سرگرمیوں سے کتنا قریب تھے۔ حجاز میں شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد ہندوستان میں پولیس نے ان تمام لوگوں سے باز پرس کی جن کے نام سرکاری کاغذات میں درج تھے، انہیں میں ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی حکیم عبد الرزاق صاحب کے نام بھی شامل تھے۔ سرکاری کاغذات میں ان حضرات کے مالی تعاون کا صرف ذکر تھا اور کوئی فرد جرم نہیں لگایا گیا تھا، ان حضرات نے صاف صاف اقرار کیا کہ بیشک ہم نے مولانا موصوف کی مالی مدد کی ہے، مولانا ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں، ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا ان کی خدمت کرنا فرض تھا اور ہم اپنا فرض ادا کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ پولیس نے کہا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی ہیں اور آپ ان کی مدد کرتے ہیں؟ ڈاکٹر انصاری نے کہا مولانا باغی نہیں ہیں اور نہ ان پر جرم بغاوت لگانا صحیح ہے۔ جب پولیس نے رپورٹیں دکھائیں اور جرم بغاوت ثابت کرنا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا مخبر نے آپ کو جھوٹی اطلاعات دی ہیں، یہ اطلاعات ناقابل یقین ہیں، مگر پولیس جرم بغاوت پر اصرار کرتی رہی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے پوری جرأت سے کہا کہ ہم تو مولانا محترم کو اپنا مذہبی پیشوا اور اپنا شیخ و مرشد سمجھ کر مدد کرتے رہے ہیں، اگر حکومت کی نگاہ میں وہ باغی ہیں تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں، حکومت جو چاہے مجھے سزا دے سکتی ہے، عدالت ان کی جرأت حق گوئی سے متاثر اور مرعوب ہوگئی۔ یہ سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کی سزا کا مطلب پورے ملک میں سیاسی ہلچل پیدا کرنا ہے اور حکومت اس ہلچل سے گھبراتی تھی، اس لیے دونوں بھائیوں کو باعزت بری کر دیا۔

تحریک ریشمی رومال کے جن قائدین کا تذکرہ کیا گیا، یہ وہ لوگ تھے جن کے حالات کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کئی اہم افراد ایسے تھے جو تحریک میں تو بہت نمایاں کردار نبھا رہے تھے لیکن مختلف وجوہ سے ان کے حالات کتابوں میں نقل نہیں ہو سکے۔ اسیر اَدروی نے اپنی کتاب ''شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی'' کچھ معلومات جمع کی ہے۔ یہاں اسے نقل کیا جارہا ہے۔

سیف الرحمن قندھاری

''یہ قندھار، افغانستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباء واجداد قندھار سے پشاور منتقل ہوگئے تھے۔ وہیں سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہ ہندستان پہنچے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے ہوئی۔ پھر رابطہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ چونکہ وہ خود بھی دل میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبہ رکھتے تھے، اس لیے جب شیخ الہند نے ان کو اپنا مشن سمجھایا تو وہ اس مشن پر دل و جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ کچھ مدت بعد شیخ الہند نے انہیں یاغستان جاکر لوگوں کی ذہن سازی کرنے اور انگریزوں کے خلاف جذبۂ جہاد پیدا کرنے کی ہدایت دی۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور ملازمت ترک کرکے یاغستان چلے گئے۔ شیخ الہند نے ان کی یکسوئی کے لیے ماہانہ تنخواہ کا نظم کیا۔ مولانا قندھاری اپنے مشن میں لگے رہے اور آزاد قبائل میں وعظ و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے، اس لیے ان کی تقریروں نے بیشتر قبائل میں جہاد کا جذبہ عام کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ ان آزاد قبائل نے بعد میں انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔''

مولانا فضل ربی پشاوری

انہوں نے دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ شیخ الہند کے شاگردوں میں ہیں۔ پشاور کے رہنے والے تھے۔ بہت ہی پر جوش اور مشتعل مزاج تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے وطن میں علمی مشاغل میں مصروف تھے، جب شیخ الہند نے ضرورت محسوس فرمائی تو ان کو مطلع فرمایا کہ آپ آزاد علاقہ یاغستان چلے جائیں اور وہاں کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کریں اور تمام علاقوں میں گھوم پھر کر مسلمانوں کو تیار کریں کہ جب ملک وملت کو ضرورت پیش آئے تو پورے جوش وخروش کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ جب انہوں نے آزاد قبائل میں جاکر تقریریں کیں تو پوری فضابدل دی۔ ہر شخص جوش جہاد سے سرشار نظر آنے لگا اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے اپنے نام پیش کیے کہ ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ خود مولانا موصوف اس علاقہ کے مشہور مجاہد وسپہ سالار ترنگ زئی کے ساتھ معرکوں میں شریک رہے۔ تحریک ختم ہونے کے بعد وہ کابل چلے گئے اور پوری زندگی حکومت افغانستان میں معزز عہدوں پر رہے۔

مولانا اکبر یاغستانی

دار العلوم کے فاضل اور حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں ہیں یاغستان کے باشندے تھے جو شیخ الہند کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اسی کو مجاہدین آزادی کی چھاؤنی قرار دیا تھا، یہ بہت ذی علم تھے، منطق وفلسفہ میں درجہ کمال حاصل تھا، حدیث شیخ الہند سے پڑھی تھی، فراغت کے بعد وہ افریقہ چلے گئے اور وہاں علمی خدمات انجام دے رہے تھے، پھر اپنے وطن یاغستان واپس آئے، شیخ الہند کو ان کی واپسی کا علم ہوا تو آپ نے ان کو جہاد آزادی میں شامل ہونے اور پورے علاقہ میں جہاد کی فضا بنانے کا پیغام بھیجا۔ انہوں نے تعمیل حکم کی اور پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا چوں کہ وہ خود اس علاقہ کے باشندے تھے، بااثر اور ذہین وفطین عالم تھے اس لیے ان کو کامیابی ملتی رہی۔ مختلف قبیلوں میں جو آپسی اختلافات تھے انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ان اختلافات کو دور کیا اور قبائل میں اتحاد واتفاق پیدا کیا اور آزادی کی تحریک میں ان کو ہم آواز اور ہم خیال بنانے میں کامیاب رہے۔"

مولانا فضل محمد پشاوری

شیخ الہند کے تلامذہ میں ہیں۔ آپ ضلع پشاور کے رہنے والے تھے۔ شیخ الہند نے ان کو بھی آزاد قبائل میں تبلیغ جہاد اور جد وجہد آزادی اور دینی زندگی کی تازہ روح پھونکنے کے لیے بھیجا تھا۔ انہوں نے وہاں جاکر بڑی سرگرمی سے کام شروع کیا اور ہر امکانی جدوجہد کر کے وہاں کے عام باشندوں کے دلوں میں دین وملت پر فدا ہونے کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی جدوجہد کا بہت بہتر اثر پڑا۔ آخر تک آپ اس مہم میں لگے رہے بہت سے معرکوں میں خود بھی شریک ہوئے، شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد جب تحریک ختم ہو گئی تو روپوشی کی زندگی اختیار کی اور بڑی مشکلیں جھیل کر اپنے وطن پہنچے اور گمنامی کی زندگی بسر کی۔ انگریزی حکومت کی نگاہوں میں ان کا جرم بغاوت بہت بڑا تھا اور ہر طرح کی سزا کا اندیشہ تھا، اس لیے یاغستان سے واپسی کے بعد پھر کسی نے ان کو نہیں دیکھا۔

مولانا محمد احمد چکوالی

مولانا موصوف پنجاب کے علاقہ چکوال کے رہنے والے تھے۔ دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ

میں تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی کے مخلص دوستوں میں تھے۔ اندرون ملک جو بغاوت کے مراکز متعین کئے گئے تھے ان میں ایک مرکز پنجاب میں بھی تھا مولانا موصوف اس کے صدر اور اہم ذمہ دار تھے۔ جب سے ان کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی بڑی جرأت اور استقلال کے ساتھ خفیہ جدوجہد کر کے تحریک میں پرجوش اور مخلصانہ حصہ لینے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ارد گرد ایک مضبوط طاقت فراہم کرلی تھی جو وقت آنے پر ملک وملت کے جاں نثار سپاہی ثابت ہوتے۔ صلاح ومشورہ کے لیے دیوبند شیخ الہند کی خدمت میں برابر آتے رہتے تھے۔

شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد وہ بھی گرفتار ہوگئے، مقدمہ چلا مگر پولیس ثبوت عدالت میں پیش نہ کر سکی، وہ چھوڑ دیئے گئے، پھر پولیس کے ہاتھوں بہت سے ایسے کاغذات اور فائلیں آگئیں جن سے جرم ثابت ہوتا تھا تو پولیس نے ان کو پیش کر کے اقبال جرم کرالیا۔ ان سے عہد نامہ لکھوا کر کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لیں گے رہا کر دیا گیا۔

مولانا فضل واحد پشاوری

یہ اپنے علاقہ کے مشہور پیر طریقت تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کے چشم و ابرو کے اشاروں پر کٹ مرجانے والے پٹھانوں کا ایک جم غفیر تھا۔ یہ نام کے بجائے حاجی ترنگ زئی کے نام سے مشہور تھے۔ ترنگ زئی پشاور کی تحصیل چارسدہ میں واقع ہے۔ شیخ الہند نے ان کو اپنی تحریک کا اہم نوا اور سرگرم قائد بنایا تھا۔ حاجی صاحب کے پیر اور ان کے مریدین بہت غیور اور بااثر مجاہد رہے ہیں۔ انگریزی اقتدار کے خلاف برسہابرس جنگ کرتے رہے۔ حاجی صاحب پر بھی یہی رنگ غالب تھا۔ انگریزی حکومت کے تئیں ان کے دل میں سخت نفرت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس معاملہ میں وہ اپنے پیر طریقت کے نقش قدم پر تھے۔ آزادی کے لیے جنگ اور دین کے لیے جہاد کرنا ان کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھا، تحریک میں شمولیت سے پہلے انگریزی علاقہ پشاور میں تبلیغ دین اور تزکیہ باطن میں مصروف تھے ضلع پشاور اور آزاد علاقہ یاغستان میں ان کے ہزاروں مخلص مریدین تھے، آزاد قبائل میں ہر طرف ان کو جاننے والے اور ماننے والے پائے جاتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے دور میں ان سے زیادہ کوئی دوسری مقبول شخصیت نہیں تھی۔ شیخ الہند سے ان کی براہ راست ملاقات نہیں تھی، البتہ شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا عزیر گل پشاوری کو ان کی خدمت میں بھیجا تھا، ان دونوں حضرات نے تحریک کی اہمیت اور اس کی دینی افادیت حاجی صاحب کے ذہن نشین کی اور ان سے درخواست کی کہ آپ مجاہدین آزادی کی کمان سنبھال لیں اور اس مقصد کے لیے پشاور کے بجائے یاغستان میں قیام فرمائیں اور اس علاقہ میں تحریک کے مرکز کے سربراہ ہو جائیں۔ یہ گفتگو جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے کی ہے، جب 1914 میں جنگ شروع ہوگئی تو حاجی صاحب پشاور منتقل ہو کر یاغستان کے علاقہ میں پہنچ گئے اور اس کو اپنا مستقل مستقر بنالیا اور مجاہدین کی کمان سنبھال لی۔

مولانا عزیر گل پشاوری

شیخ الہند کے شاگرد اور خادم خاص تھے۔ انتہائی وفادار، تحریک شیخ الہند میں جان ہتھیلیوں پر رکھ کر ابتدا سے انتہا تک اپنے فرائض

اور ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ حضرت شیخ الہند کے محرم راز اور قاصد خاص تھے۔ آزاد قبائل کو اہم ہدایات اور اطلاعات انہیں کے ذریعہ پہنچائی جاتی تھیں۔ آپ بار بار شیخ الہند کے حکم سے آزاد قبائل میں جاتے رہے اور پیغام پہنچاتے رہے۔ پہاڑی علاقوں میں عام طور پر پیدل ہی سفر کرتے رہے۔ شاہراہ سے جانے میں گرفتاری کا خطرہ تھا اس لیے غیر معروف راستوں سے باہر جاتے تھے۔ بسا اوقات بھیس بدل کر سفر کرنا پڑتا تھا مگر وہ اپنی ذمہ داری سے سر مو بھی انحراف نہیں کرتے تھے، شیخ الہند کو آپ کی ذات پر بڑا اعتماد تھا۔ ہر مصیبت میں ثابت قدم رہے حجاز میں شیخ الہند کے ساتھ گرفتار کر کے مالٹا بھیجے گئے اور وہاں جیل کاٹ کر شیخ الہند کے ساتھ ہی ہندوستان واپس آئے۔

مولانا ابوالحسن تاج امروٹی

آپ سرحدی علاقہ امروٹ ضلع سکھر کے رہنے والے تھے۔ اس علاقہ کے مشہور پیر حافظ محمد صدیق کے خلیفہ تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا ان سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ موصوف عابد وزاہد، متقی اور پر جوش مسلمان تھے، پورے ضلع سکھر میں ان کو اعزاز و احترام حاصل تھا، ہزاروں لاکھوں مسلمان ان سے بیعت تھے، حضرت شیخ الہند سے ان کا تعارف مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ ہوا۔ موصوف کئی بار شیخ الہند سے ملاقات کے لیے دیوبند آئے اور خود شیخ الہند بھی امروٹ ان سے ملنے گئے تھے، آپ تحریک شیخ الہند کے دل سے ہوا خواہ تھے اور اس کی کامیابی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ دین کا دل میں شدید جذبہ تھا، یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت میں بھی انہوں نے بھر پور حصہ لیا تھا۔ امروٹ ضلع سکھر تحریک شیخ الہند کا ایک مرکز تھا، موصوف کی وجہ سے ان کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد اس مرکز سے وابستہ ہوگئی، موصوف کے ذریعہ مجاہدین یاغستان کی مدد آسان ہوگئی اور خود بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ تحریک کے خاتمہ کے بعد انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کیا لیکن کوئی فرد جرم عائد کرنے میں پولیس ناکام ہوگئی کیوں کہ کوئی ان کے خلاف شاہد بننے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے کچھ ہی دنوں کے بعد رہا کر دیے گئے۔

مولانا غلام محمد دین پوری

موضع دین پور علاقہ خانپور ریاست بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ اس دیار کے مشہور پیر طریقت تھے، اس لیے بڑی شہرت و عزت حاصل تھی، ان کے مریدوں کی تعداد بے شمار تھی، مولانا عبید اللہ سندھی نے ان کا شیخ الہند سے تعارف کرادیا اور انہیں کے ذریعہ ان کو تحریک سے واقفیت ہوئی، پھر وہ دل و جان سے اس تحریک سے وابستہ ہوگئے، ان کے وطن دین پور میں تحریک کا ایک بڑا مرکز بنایا گیا، موصوف اس کے صدر تھے۔ آپ کے حلقہ بگوش مریدین تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اپنے ذرائع سے انہوں نے جدوجہد کر کے بہت سے اسلحہ جمع کر لیا تھا، تاکہ بوقت ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔

تحریک کے ختم ہونے کے بعد پورے ملک میں جب چھاپے پڑے تو مشتبہ افراد میں آپ کا بھی نام تھا، اس لیے ایک انگریز افسر فورس لے کر ریلوے اسٹیشن خان پور میں اترا، شام کا وقت تھا، مخلصین کو پتہ چل گیا کہ فوج ہمارے پیر و مرشد کے یہاں تلاشی لینے اور گرفتار کرنے کے لیے جارہی ہے۔ فوراً وہاں سے دوڑے اور دین پور پہنچ کر مولانا موصوف کو صورت حال سے باخبر کر دیا، راتوں رات ساری

رائفلیں، بندوقیں اور کارتوس کی پیٹیاں مختلف مقامات پر منتقل کر دی گئیں۔ انگریز افسر رات اسٹیشن پر گزار کر صبح کو فوج لے کر دین پور پہنچا اور گھر کا محاصرہ کر لیا۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر کوئی مشکوک چیز وہاں نہیں ملی۔ مخبروں نے جو اطلاعات فراہم کی تھیں ان میں سے کوئی اطلاع صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ موصوف کے گھر کے محاصرہ سے مریدوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا اور ہر طرف سے مسلمان جمع ہونے لگے، سب جوش و جذبہ سے بھرے ہوئے تھے، اس لیے انگریز افسر نے اپنا رویہ نرم رکھا، صرف ان سے درخواست کی کہ ہمارا افسر فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے آپ وہاں چل کر اس سے بات کر لیں۔ لیکن یہ جھوٹ تھا، وہ مولانا موصوف کو فریب دے کر دین پور سے نکال لے گیا اور جالندھر لے جا کر نظر بند کر دیا کچھ عرصہ بعد ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔

شیخ عبد الرحیم سندھی

حیدر آباد سندھ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے مشہور کانگریسی لیڈر اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر ان کے مخلص دوستوں میں شامل ہو گئے۔ جہاد آزادی کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ تحریک شیخ الہند میں بعض موقعوں پر جان کی بازی لگا کر بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ان کا اصل مشن تھا غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ۔ ان کے ہاتھوں پر بہتوں نے اسلام قبول کیا۔ جب مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل جانے کا حکم ملا تو وہ کئی طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے اور سفر خرچ ہندوستان میں ختم ہو گیا، دوسرے عام راستہ سے سفر کرنا ممکن نہ تھا، سی آئی ڈی کا خطرہ لگا ہوا تھا، عبد الرحیم سندھی نے ان دونوں موقعوں پر ان کی بھر پور مدد کی۔ غیر معروف راستہ سے اونٹ کے ذریعہ افغانستان کی سرحد میں داخل کرایا۔ جنگ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ چلے گئے اور کئی سال تک وہیں رہ گئے، پھر سندھ واپس آئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جب تک کابل میں رہے ان سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ اتفاقاً ایک بار مولانا سندھی کا ایک خط جو ان کے نام تھا خفیہ پولیس کے ہاتھ آ گیا اور راز فاش ہو گیا۔ خفیہ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی، جب انہوں نے سمجھ لیا کہ گورنمنٹ مجھے گرفتار کر کے اذیتیں دے کر تحریک کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرے گی تو انہوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ روپوش ہو جائیں، چنانچہ پولیس کی تمام تگ و دو کے باوجود وہ ہاتھ نہیں آئے۔ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، ساری زندگی وہیں گزار کر راہی ملک بقا ہوئے۔ مدینہ منورہ کی سرزمین میں مدفون ہوئے۔

مولانا محمد منصور انصاری

مولانا محمد منصور انصاری جن کا اصل نام محمد میاں ہے، یہ بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نواسے ہیں۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، شیخ الہند سے حدیث پڑھی، فراغت کے بعد دار العلوم معینیہ اجمیر میں مدرس ہو گئے، پھر شیخ الہند نے ان کو ترجمہ قرآن میں اعانت کے لیے دیوبند بلا لیا۔ اس دوران تحریک کی سرگرمیاں بڑھیں تو وہ بھی شریک ہو گئے۔ تحریک میں شرکت کے بعد جان کی بازی لگا کر انتہائی خطرناک اور اہم ترین ذمہ داریاں ادا کیں۔ پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی، پوری جان سپاری کے ساتھ حضرت شیخ الہند کا حکم بجالاتے رہے۔ شیخ الہند کے ساتھ سفر حجاز میں شریک رہے، گورنر حجاز غالب پاشا کا پیغام لے کر حجاز سے ہندوستان یہی آئے تھے یہ خط بڑا اہم تھا۔ اس کی فوٹو کاپیاں آزاد قبائل میں تقسیم کرنی تھیں تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ ترکی حکومت ان کی

مدد کرے گی۔ جب وہ غالب پاشا کا خط لے کر ہندوستان پہنچے اس وقت حجاز میں شیخ الہند گرفتار ہو چکے تھے، پورے ہندوستان میں دارو گیر کا سلسلہ جاری تھا، پولیس مولانا انصاری کی گرفتاری کے لیے تیار کھڑی تھی، انہوں نے بھیس بدل لیا اور محمد میاں کے بجائے منصور انصاری نام رکھ لیا اور غیر معروف راستہ سے یاغستان کے لیے چل پڑے۔ ان کو بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ آزاد قبائل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، پولیس ہاتھ مل کر رہ گئی۔ کچھ دنوں یاغستان میں قیام کیا، وہیں شادی کر لی۔ چونکہ تحریک کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، اس لیے کچھ عرصہ بعد یاغستان سے کابل چلے گئے، وہاں ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ برطانوی حکومت نے امیر افغانستان، حبیب اللہ خاں پر دباؤ ڈالا کہ جو لوگ ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے مجرم رہے ہیں اور وہ کابل میں مقیم ہیں ان کو شہر بدر کر دیں۔ امیر افغانستان انگریزوں کے دباؤ میں آ گیا، اس نے مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف اللہ صاحب کو جنہوں نے تحریک شیخ الہند کو یاغستان میں پھیلانے میں اہم کام سرانجام دیا تھا وہ بھی کابل ہی میں قیام پذیر تھے ان دونوں حضرات کو کابل سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ یہ دونوں پھر یاغستان واپس آ گئے لیکن کچھ عرصہ بعد حبیب اللہ خان کے بعد امان اللہ خاں سربراہ حکومت ہوئے تو وہ انگریزوں کے اثر سے باہر تھے، اس لیے اس کے عہد حکومت میں مولانا منصور انصاری کابل پھر لوٹ آئے۔ چونکہ بہت ذی استعداد، ذہین عالم تھے اس لیے بہت جلد حکومت افغانستان میں اعتماد حاصل کر لیا اور قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے اور حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ امیر امان اللہ خاں نے ایک خیر سگالی وفد ترکی بھیجا تو اس میں مولانا انصاری بھی شریک رہے۔ ایک اور وفد روس بھیجا گیا تو حکومت افغانستان کی جانب سے آپ نے اس وفد کی سربراہی کی۔ کابل میں وزارت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، پوری زندگی وہیں گزار کر راہی ملک بقا ہوئے۔

مولانا احمد اللہ پانی پتی

پانی پت (ہریانہ) کے رہنے والے تھے، شیخ الہند کے انتہائی رازدار اور معتمد آدمی تھے، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، شیخ الہند سے حدیث پڑھی ہے، مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، پھر شیخ الہند نے ان کو دیوبند بلا لیا اور ان کو اپنے ترجمہ قرآن میں معاون بنایا، یہ ابتدا ہی سے شیخ الہند کے منصوبہ اور پروگرام میں شریک اور رازدار رہے۔ شیخ الہند کو ان پر مکمل اعتماد تھا۔ آپ کی ڈاک کا نظم انہیں کے سپرد تھا، جب کہ خطوط ہی حکومت کے لیے سب سے بڑا ثبوت بن سکتے ہیں، اس لیے ڈاک اور خطوط اسی کو سپرد کیا جاتا ہے جس پر اپنی ذات ہی کی طرح بھروسہ ہو۔ مولانا احمد اللہ یہی نازک اور اہم ترین ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ بہت سے خطوط کے جوابات بھی انہیں کو لکھنے کا حکم فرماتے تھے اور جب شیخ الہند سفر حجاز پر گئے تو تنظیم سے متعلق جملہ امور کا ان کو نگراں بنایا تھا اور اندرون ملک تحریک کے ممبروں اور بیعت جہاد کرنے والوں کا رجسٹر بھی انہیں کے پاس رہتا تھا۔ مالیات اور آمد و خرچ کی دیکھ بھال بھی انہیں کی ذمہ داری تھی۔ شیخ الہند جب دیوبند سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے تو سارے کاغذات اور رجسٹر اٹھا کر پانی پت لے گئے کیوں کہ اگر راز افشا ہو گیا تو سب سے پہلے شیخ الہند کے گھر پر چھاپہ مارا جائے گا اور سارے کاغذات برآمد ہو جائیں گے، پانی پت ایک غیر معروف اور غیر متعلق جگہ ہے، پولیس وہاں تاخیر سے پہنچے گی، وہ حسب ضرورت حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورے لیتے رہتے تھے، شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد مخبر کی اطلاع کے مطابق پولیس مولانا احمد اللہ کے گھر پانی پت پہنچی، چونکہ موصوف ہر دم حالات پر نظر رکھتے تھے اس لیے

شیخ الہند کی گرفتاری کی خبر آتے ہی آپ نے یقین کر لیا کہ پولیس امروز و فردا میں میرے گھر پر پہنچ جائے گی، اس لیے آپ نے سارے کاغذات رجسٹر اور ایسی چیز کو جس سے شک و شبہ پیدا ہو دوسری جگہ منتقل کر دیا اور گھر ایک دم خالی کر دیا تھا، پولیس کی ساری کوششوں کے باوجود اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا، پولیس نے حسب معمول سختی اور نرمی سے معلومات حاصل کرنی چاہی، مگر انہوں نے کسی بات کا اقرار نہیں کیا۔ پھر بھی پولیس مطمئن نہیں ہوئی اور ایک مسلمان سی آئی ڈی کو ان کے گھر کی نگرانی کے لیے متعین کر دیا جو انتہائی اخلاص کا مظاہرہ کرتا، آپ سے بیعت بھی ہو گیا اور ذکر و شغل میں بھی سرگرمی دکھائی، اپنی دینداری دیانتداری کا مظاہرہ بھی کرتا رہتا اور وہ مولانا احمد اللہ کا اتنا خدمت گار مرید ہو گیا کہ دن رات ان کی خدمت ہی اس کا مشغلہ بن گیا۔ مولانا نے بھی اس پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ وہ عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہا، کامل اعتماد کی وجہ سے بہت سی باتیں موقعہ بموقعہ ذکر کرتے رہے، جب مکمل معلومات اس نے حاصل کر لیں تو ایک دن یک بیک وہ غائب ہو گیا اور پوری رپورٹ افسران بالا کو دے دی۔ فوراً تھانے سے پولیس آئی اور مولانا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا، مگر مولانا موصوف نے کاغذات کے بارے میں کبھی ذکر نہیں کیا کہ وہ کہاں رکھے گئے ہیں۔ اس لیے پولیس کے پاس کوئی کاغذی ثبوت نہیں تھا، اس لیے سزا دینے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ملا، مگر پنجاب کے کسی علاقہ میں نظر بند کر دیا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد ان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ پانی پت لوٹ آئے اور تعلیم و تدریس کے مشغلے میں پوری زندگی گزار کر آزادی سے کچھ ہی دنوں پہلے پانی پت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

16.2.4 تحریک کا مقصد اور طریقہ کار

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال کا کیا مقصد تھا؟ یہ تحریک کیوں برپا کی گئی تھی؟ اس تحریک کے بانیان و قائدین کے ذہن میں کیا عزائم تھے؟ اب جب کہ اس تحریک کے تمام دستاویزات سامنے آ چکے ہیں، ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ الہند بزور طاقت انگریزی اقتدار کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے روابط تمام قابل ذکر سیاسی رہنماؤں سے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے، لیکن ہندستان سے انگریزی سامراج کے خاتمے کے لیے وہ اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ انگریز ہندستان پر اپنی طاقت کے ذریعہ قابض ہیں۔ یہاں کے لوگ انگریزوں کے حامی نہیں ہیں، اس کے باوجود انگریز ہی ان کے حکمراں ہیں۔ لہٰذا ان کی طاقت کو توڑنا ضروری ہے۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں ان کی طاقت کا جواب طاقت ہی سے دینا ہو گا۔ اس لیے اُن کا اور ان کی تحریک ریشمی رومال کا مقصد ہندستان میں بغاوت پھیلا کر برطانوی نظام حکومت کو درہم برہم کرنا اور انگریزوں کے وجود سے ہندستان کی سر زمین کو پاک کرنا تھا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے دو محاذوں پر کام شروع کر رکھا تھا:

(الف) ہندستانی عوام کی ذہن سازی اور انہیں انگریزوں کے خلاف ایک بڑے انقلاب کے لیے تیار کرنا۔ اس کے لیے انہوں نے ہندستان کے تمام مخلص اور بااثر مسلم رہنماؤں کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنایا۔ خطوط لکھے، ملاقاتیں کیں، جلسے کیے، جلسوں میں شرکت کی اور ذہن سازی کے لیے جو بھی مناسب طریقہ نظر آیا، اسے اختیار کیا۔ مسلم اسکالرز، غیر مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے مسلم نوجوانوں اور مسلم عوام کو قرآن کریم سے وابستہ کرنے کی جدوجہد کی۔ اس محاذ پر بھی انہیں بڑی حد تک کامیابی مل گئی تھی۔

(ب) ہندستان اور افغانستان کے درمیان آزاد قبائل کا علاقہ تھا۔ جہاں تحریک شہیدین کے بچے ہوئے مجاہدین اب بھی اقامت گزیں تھے۔ یہ قبائل بہادر بھی تھے اور دین کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ اکثر لوگ غیور اور نڈر پٹھان تھے۔ یہی شیخ الہند کی غیر منظم فوج تھی۔ اگر ان کو مزید اسلحہ اور رسد فراہم کر دی جاتی تو وہ نا قابل شکست طاقت بن سکتے تھے۔ اگر حکومت افغانستان اور ترکی خلافت ان بہادر پٹھانوں کی اسلحہ اور رسد سے مدد کر دیتی تو ان کی طاقت کئی گنا بڑھ سکتی تھی۔ ان آزاد قبائل میں آزادی اور دین کی سربلندی کا جذبہ عام کرنے اور ان کو منظم کرنے کے لیے شیخ الہند کئی دہائیوں سے محنت کر رہے تھے۔ وہ اپنے ان شاگردوں کو جو انہیں علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، مسلسل ان علاقوں میں بھیج کر پٹھانوں کو منظم کرنے اور ان میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے آپسی اختلافات کو ختم کر کے ان میں اسلامی اخوت کی روح پھونکنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے شعلہ بیان مقرروں اور خطیبوں کو اس علاقہ میں مسلسل بھیجتے رہے اور وہ لوگ جاں گسل مشقتیں برداشت کر کے اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ تحریک ریشمی رومال کے خاتمے کے بعد بھی یہ لوگ مختلف طریقوں سے انگریزوں کی نیند حرام کرتے رہے۔

تحریک کا خاتمہ

پیچھے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے تذکرے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک طرف انہوں نے حجاز جا کر ترکی خلافت کے وزیر دفاع (Defence Minister) انور پاشا، ترکی کے گورنر غالب پاشا اور شام کے گورنر جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں۔ انہیں اپنی تحریک کے تعاون پر آمادہ کیا اور اپنی تحریک کے مقاصد کا حامی بنایا۔ تو دوسری طرف ہندستان میں انگریزوں نے مولانا محمود حسن دیوبندی کے رشتہ داروں، شاگردوں، مریدوں اور قریبی لوگوں پر سختیاں کرنی شروع کر دیں۔ بڑے بڑے لالچ اور خطرناک دھمکیاں دیں۔ آخر کار انہیں مولانا کی تحریک کا سراغ مل گیا۔ انہیں ریشم کے کپڑے پر بنا ایک ایسا نقشہ بھی ہاتھ آ گیا، جس سے مولانا کی تحریک کے مقصد کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان تمام چیزوں کے سامنے سے انگریزوں کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی اور انہوں نے کسی بھی قیمت پر مولانا کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا۔

اُس وقت مکہ مکرمہ کا گورنر شریف حسین ترکی سلطنت سے غداری کر کے انگریزوں کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے مولانا محمود حسن دیوبندی کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے مولانا اور ان کے رفقاء کو جلاوطنی کی سزا دی اور کالا پانی بھیج دیا۔ 1916 میں یہ واقعہ پیش آیا تو انگریزی حکومت پوری طرح چوکنی ہو گئی۔ انہوں نے ہندستان میں تحریک کے قائدین و کارکنان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سخت سزائیں دینی شروع کیں۔ عرب اور افغانستان میں جہاں جہاں اُن کے اثرات تھے، وہاں اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے تحریک کو کچلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک اپنے اصل مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر ختم ہو گئی۔ انگریزوں کے دل و دماغ پر اس تحریک کا شدید خوف طاری تھا، اس لیے تحریک کے خاتمہ کے کئی سال بعد تک وہ چوکنے رہے اور لوگوں کو سزائیں دیتے رہے۔

تحریک کے اثرات

آپ پڑھ چکے ہیں کہ تحریک ریشمی رومال کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف بغاوت کرکے طاقت کے زور پر ان کی حکومت کا خاتمہ کرنا تھا، لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ تحریک کے بانی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی گرفتاری کے بعد تحریک کے خلاف ہونے والے کریک ڈاؤن کی وجہ سے تحریک اپنے اصل مقصد کو حاصل نہیں کر سکی۔ اس کے باوجود تحریک نے متعدد دیرپا اثرات چھوڑے:

1. اس تحریک نے مسلمانوں کو اُس مایوسی کے دلدل سے نکالا، جس دلدل میں وہ 1857 کے بعد پھنس گئے تھے۔
2. ہندستان میں انگریزوں کے خلاف عام ماحول بنا۔ یہ ماحول آگے چل کر تحریک خلافت اور دوسری تحریکات میں کام آیا۔
3. انگریزوں کے خلاف ملک میں اچھی قیادت (Leadership) پیدا ہوگئی، جس نے مستقبل میں محاذ سنبھالا۔
4. سرحدی علاقوں کے مسلمانوں کو اپنی اصلاح کی توفیق ہوئی اور مدتوں سے جاری رہنے والے اختلافات ختم ہوئے۔
5. انگریزوں کو یہ اندازہ ہوا کہ اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ 1857 میں مسلمانوں کی طاقت کو ختم کر چکے ہیں۔

تحریک ریشمی رومال کے ان اثرات کا نتیجہ تھا کہ انگریزوں نے اس تحریک کو اپنے سامراج کے لیے بہت بڑے خطرے کے طور پر پیش کیا۔ اس تحریک کے متعلق کتابیں لکھیں اور رپورٹیں شائع کیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند نے 2013 میں تحریک کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

16.3 تحریک خلافت

تحریک ریشمی رومال ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہندستان میں تحریک خلافت کا شور بلند ہو گیا۔ تحریک ریشمی رومال کے قائدین اور کارکنان کو جیلوں میں ٹھونسا جارہا رہا تھا، بدترین سزائیں دی جارہی تھیں اور انگریزی حکومت چین کی سانس لینے والی تھی کہ اچانک پورا ملک خلافت کے نعروں سے گونج اٹھا۔ یہ تحریک اپنی نوعیت کے لحاظ سے ریشمی رومال تحریک سے مختلف تھی۔ ریشمی رومال کی تحریک خفیہ طور پر چلائی جارہی تھی، جب کہ خلافت تحریک سڑکوں، گلی محلوں اور ایوانوں کی تحریک تھی۔ اس لیے اس تحریک کا غلغلہ ایسی زور سے بلند ہوا کہ انگریزی حکومت کے ہوش وحواس گم ہوگئے۔ آیئے! اس تحریک کا پس منظر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

16.3.1 تحریک کا پس منظر

خلافت اسلامیہ کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ فروری 1920 میں بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے خطبۂ صدارت میں مسئلۂ خلافت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا:

اسلام کا قانونِ شریعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحبِ حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجرا و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔

صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے۔ اور اس وقت از روئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی، جس نے ان کے مقابلہ میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا، اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔ اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہیں، پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا مسئلہ نہ ہو گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہو گا کہ یہ اس قبضہ کو وطن سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔

اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریف۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جان کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلوں کے قبضہ میں نہ جانے دیں، علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہو گا بلکہ بیک وقت و بیک دفعہ تمام مسلمانان عالم کا فرض ہو گا۔

نو مسلم انگریز مصنف و مترجم قرآن محمد مارماڈیوک پکتھال نے ڈاکٹر سید محمود کی کتاب "خلافت اور اسلام" کے دیباچہ میں لکھا ہے :

"مذہبِ اسلام حیاتِ انسانی کا مکمل قانون ہے اور تہذیب و شائستگی کا مخزن ہے جو ابھی تک اپنے عروج کو نہیں پہنچا ہے۔ خدا کے قوانین جو بنی نوع انسانی پر کلیتاً حکمران ہیں اور وہ قوانین جن کی پابندی پر انسانی زندگی کی اخلاقی ترقی مبنی ہے، سوائے قرآن شریف کے اور کسی کتاب میں صراحت کے ساتھ درج نہیں ہیں۔"

"اسلامی تہذیب قوانین الٰہی پر مبنی ہے، خلیفہ اس کا دنیوی سردار ہے، خواہ اہل عرب ہو یا غیر اہل عرب۔ خواہ اس کا دارالحکومت بغداد ہو، مدینہ ہو یا قسطنطنیہ اور اسلامی تہذیب اور ترقی کا مرکز، مرکز خلافت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔"

مولانا آزاد اور مسٹر پکتھال کے ان دونوں اقتباسات سے یہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خلافت کی کیا اہمیت ہے؟ اور مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ کی کیا حیثیت ہے؟ اسلامی نظام میں خلافت اور خلیفہ کی اس اہمیت کو ناپسند کرتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اور خاص طور پر انگریزوں نے اسلامی خلیفہ کو رومن کیتھولک کے پوپ سے تشبیہ دی، جو حکمرانی سے محروم ہونے کے بعد بھی اپنا نظام اور وقار قائم کیے ہوئے ہیں۔ جب مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت وفد لائڈ جارج سے ملا اور ان سے بحث کی کہ خلافت مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اور حکومت برطانیہ کو اس میں مداخلت نہ کرنی چاہیے تو لائڈ جارج نے اپنی جوابی تقریر میں کہا:

خلافت کی دنیوی طاقت کا ایک دوسرا مسئلہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر محمد علی اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ایک روحانی پیشوا

کی دنیوی طاقت کا مسئلہ صرف اسلام کے ساتھ لاحق نہیں ہے۔ عیسائی دنیا میں بھی یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے، رومن کیتھولک گرجا کے سربراہ سے دنیوی اختیارات کے سلسلے میں ایک نسل سے زیادہ مدت کے خوفناک تنازع جاری ہیں۔ کچھ رومن کیتھولک تو دنیاوی اختیارات کے حق میں ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اپنی رائے تو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں لیکن جب پوپ کو اس کی دنیاوی طاقت سے محروم کر دیا گیا تو اس کی روحانی قوت ویسی ہی عظیم رہی بلکہ عظیم تر ہو گئی۔

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے آخری جواب میں یہ بات کہہ کر ختم کر دی تھی :

"ہم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ خلیفہ کی دنیاوی طاقت برقرار رکھنے، مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اس کی نگرانی کو بحال اور ان پر قبضہ تسلیم کرانے کے معاملات کو اچھی طرح پیش کریں۔ ہم نے وائسرائے اور مسٹر نشر کے سامنے یہ مسائل پیش کیے۔ آپ سے یہ بھی کہنا ہے کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے۔"

اس اعتراض کا منطقی جواب مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضمون "مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ" میں اس طرح دیا ہے:

" یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سلطنت اور خلافت کی تفریق کی تائید میں جس قدر توجیہات کی جارہی تھیں اور وظائف اور اعمال کی تقسیم کے رنگ میں اسے دکھلایا جارہا تھا۔ محض کاغذی نمائش تھی۔ عملی طور پر کسی ایسی تقسیم کا وجود تھا اور نہ وجود میں آسکتی تھی"۔

پوپ سے جب سلطنت علاحدہ کر لی گئی تو اس کے کاروبار کے بہت سے صیغے باقی رہ گئے۔ مثلاً گناہوں کی معافی، پروانہ ہائے تجارت کی تقسیم، احکام شرع میں ترمیم و تنسیخ اور رومن کیتھولک چرچ کی بادشاہت، کلیسائی اعمال اور جمعیات کی نگرانی وغیرہ۔ لیکن اس نئے منصب پر متمکن ہو کر خلیفہ عبدالمجید خان کے لیے کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ گناہوں کی معافی اور جنت و دوزخ کا کاروبار تو یہاں تھا ہی نہیں۔

اس پوری بحث سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ خلافت کا قیام، اس کا تحفظ، اس کی بقاء اور اس کا دفاع خالص اسلامی معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بیسویں صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی سازشیں اپنے انجام کو پہنچنے لگیں تو پورا عالم اسلام اور خاص طور پر ہندستانی مسلمان شدید اضطراب کا شکار ہو گیے۔ انہوں نے خلافت تحریک شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گھن گرج سے پورا ملک گونجنے لگا۔ یہ گھن گرج اتنی تیز ہوئی کہ برطانوی تاج بھی اس کا لرزہ محسوس کرنے لگا۔

"تحریک خلافت" کے مصنف قاضی عدیل احمد عباسی نے تحریک خلافت کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت خوب منظر کشی کی ہے:

ترکی خلافت یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ یہ زوال پذیر تھی اور مغرب والوں نے اس کا نام یورپ کا "مرد بیمار" رکھا تھا مگر اس مرد بیمار سے اعزا اور خاندان والے اس وقت تک امید افاقہ و صحت رکھتے ہیں جب تک کہ واقعی اس پر موت نہ طاری ہو جائے۔ ترکی کے حصے بخرے ہو رہے تھے لیکن اس کے اصلاح و احیاء کی تدبیریں بھی جاری تھیں جن میں خاص کر نوجوان ترکوں کا منظر عام پر ظہور تھا، اس لیے امیدیں جاگ رہی تھیں۔ اب ایک دم جب ایسی صورت پیش آئی کہ امید کی نبض ڈوبنے لگی تو

اضطراب اپنی حد کو پہنچ گیا۔

رائٹ آنریبل سر میر علی نے جو سرکار برطانیہ کے معاملہ میں معتدل اور محتاط رویہ رکھنے والے تھے وہ بھی اس پر مجبور تھے۔ انہوں نے ٹائمز آف انڈیا آف لندن میں ایک معرکتہ الآراء مضمون لکھا جس کا ماحصل وہی تھا جو اوپر بیان ہوا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر خلافت ترکیہ قائم نہ رہی تو مسلمانان عالم مایوسیوں کے گرداب کی نذر ہو جائیں گے۔ وہ آج تک ترکی کو محافظ اسلام سمجھتے آئے ہیں اور اس کے زوال کو اسلام کا زوال تصور کرنے پر مجبور ہوں گے۔

16.3.2 تحریک کا آغاز

تحریک خلافت کے آغاز اور بانیان کے سلسلہ میں تاریخ نگاروں میں کچھ اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں قاضی عدیل احمد عباسی کا یہ بیان سب سے مناسب معلوم ہوتا ہے:

خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کی میں نے بڑی کوشش کی، لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس جو 18 دسمبر 1919 کو منعقد ہوئی تھی وہی کانفرنس خلافت کمیٹی میں تبدیل ہوگئی۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس کانفرنس میں ایک تجویز خلافت کمیٹی کے شکریے کی منظور ہوئی۔ اس طرح انہیں اسباب کی بنا پر جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ خلافت کمیٹی 1920 میں قائم ہوئی ان کا بیان بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبد الباری نے خلافت کمیٹی قائم کی اور پھر وہ بمبئی منتقل ہوگئی کیونکہ وہاں کے لوگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری لی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے:

ترکی حکومت کا خاتمہ تنہا ترکی کا مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس سے دنیائے اسلام کے ٹکڑے ہوگئے تھے اور مسلمانوں کے سارے مقامات مقدسہ خطرے میں پڑ گئے تھے۔ ارض حرم تک بالواسطہ انگریزوں کے اقتدار میں آگئی تھی، جس سے ساری دنیائے اسلام خصوصاً ہندستان کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی تھی، اس لیے ترکی حکومت کی بحالی کی کوشش کے لیے مجلس خلافت کے نام سے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا کفایت اللہ، مولانا محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور دوسرے علماء اور سیاسی لیڈر تھے۔

16.3.3 اہم قائدین وارا کین

تحریک خلافت کا آغاز ایک خالص اسلامی تحریک کی حیثیت سے ہوا تھا، لیکن بہت جلد ہی اس تحریک میں ہندستان کے تمام قابل ذکر غیر مسلم لیڈر شامل ہوگئے۔ ان میں سب سے پیش پیش بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی تھے۔ گاندھی جی خلافت تحریک میں ایسی سرگرمی کے ساتھ جڑے کہ یہ بات کہی جانے لگی کہ اگر "مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو کر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر نہ لیتے تو تحریک خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔" اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ گاندھی جی کو

مہاتما گاندھی اور بابائے قوم بنانے میں بھی اس تحریک کا بہت بڑا کردار رہا۔ اس تحریک میں گاندھی جی کی شمولیت کا مقصد بہت واضح تھا۔ وہ اس اعلان کے ساتھ تحریک خلافت میں شریک ہوئے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بارہا کہا ہے کہ تحریک خلافت کو مسلمانوں کا ایک مقدس معاملہ سمجھ کر ہی میں اس تحریک میں شامل ہوا ہوں۔ بلکہ خلافت تحریک کے خاتمے کے بعد بھی گاندھی جی نے کہا کہ "اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہو گا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔" گاندھی جی شمولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو، سی آر داس، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ اسی موقف کے علمبردار بن گئے۔

مسلمانوں میں ہر طبقہ خیال اور ہر مکتب فکر کے علماء ولیڈر خلافت کو خالص مذہبی معاملہ سمجھتے ہوئے اس تحریک میں سرگرم طریقے سے شامل تھے۔ فرنگی محل، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، بریلی، بدایوں اور امرتسر وغیرہ میں حنفی، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث علماء اور خانقاہوں کے سجادہ نشینوں میں بقائے خلافت کے مسئلہ پر زبردست اتفاق ہو گیا تھا۔ شاید کسی ایک مسئلہ پر علمائے ہند کبھی اس طرح متفق نہیں ہوئے۔ سیاسی لیڈروں میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی گوہر، حسرت موہانی اور علی گڑھ، کانگریس، مسلم لیگ سب مضطرب و بے چین تھے اور خلافت اسلامی اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ قاضی عدیل احمد عباسی کے بقول:

جس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہوا مسلمانوں میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے دانشور موجود تھے، مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الٰہ آبادی، مولانا احمد سعید، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مشیر حسین قدوائی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، آغا صفدر (پنجاب) اور ظفر علی خان وغیرہ۔ یہ وہ لوگ تھے جو تحریر و تقریر، علم و فن، فکر صالح اور تحقیق کے علاوہ میدان عمل کے بھی مجاہد تھے۔ ان میں انشا پرداز بھی تھے اور شاعر بھی، علوم دینیہ کے مجتہد اور محقق بھی۔ اور علوم دنیا اور علوم مغرب کے شناسا اور امام بھی۔ یہ تمام اکابرین ملت اس سرفروشانہ جدوجہد میں پورے انہماک اور بے جگری سے شریک ہو گئے اور تحریک خلافت تحریک آزادی ہند میں تبدیل ہو گئی اور ہندوستان کے تمام لیڈر گاندھی جی کی قیادت میں یک دل ہو کر منزل آزادی کی جانب عزم و یقین کے ساتھ چل پڑے۔

اس لحاظ سے تحریک خلافت کے قائدین کی فہرست تیار کرنا بہت مشکل ہے۔ اس تحریک کا جادو اس قوت کے ساتھ سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ ملک کا ہر بڑا عالم، رہنما اور لیڈر اس تحریک میں سرگرم کردار ادا کرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے باوجود اگر اس تحریک کے تین مرکزی

کرداروں کے نام طے کرنے ہی ہوں تو ہم یہ تین نام طے کرسکتے ہیں: مولانا عبدالباری فرنگی محلی، موہن داس کرم چند گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر۔

16.3.4 تحریک کا مقصد اور طریقہ کار

تحریک خلافت کا بنیادی مقصد خلافت عثمانیہ کا تحفظ اور اس کا بقاء تھا۔ یہ مقصد خالص اسلامی تھا اس لیے تمام مسلم طبقات اس سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔ لیکن صورت حال اس وقت بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہوگئی جب اس تحریک کے ساتھ گاندھی جی بھی وابستہ ہوگئے۔ گاندھی جی وابستہ ہوئے تو پوری کانگریس تحریک کا حصہ بن گئی۔ اس طوفانی تحریک کے قائدین میں شامل ہونے سے اگرچہ گاندھی جی کو بھی بے انتہاء مقبولیت ملی اور کانگریس میں بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ان لوگوں کی شمولیت سے تحریک خلافت کا وزن بھی بہت بڑھ گیا۔ اب اس تحریک کے مقاصد میں جزوی طور پر ہی سہی ہندو مسلم اتحاد بھی شامل ہوگیا۔ پھر تحریک خلافت ہی کے اسٹیج سے ہندستان کی آزادی کا نعرہ بھی بلند ہونے لگا۔ لہٰذا خلافت عثمانیہ کا تحفظ اس تحریک کا اصل مقصد اور ہندو مسلم اتحاد اور ہندستان کی آزادی بھی اس تحریک کے فروعی مقاصد بن گئے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ”تحریک خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اسی سے ہمارے ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے باہر نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خود اعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریک خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پالیا۔“

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ملک بھر میں جلسے جلوس منعقد کیے جاتے تھے۔ رسائل اور اخبارات میں مضامین اور اداریے تحریر کیے جاتے تھے۔ چھوٹی بڑی میٹنگیں منعقد کی جاتی تھیں۔ انگریزی حکمرانوں سے مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ساتھ ہی برطانیہ اور فرانس تک وفود بھیجے جارہے تھے، جو وہاں جاکر ان ممالک کے سربراہان سے ملاقاتیں کریں، انہیں مسلمانان ہند کے جذبات سے واقف کرائیں اور خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں ملاقاتیں کریں۔ اس سلسلے میں ہر قابل ذکر ادارہ، تنظیم اور مسلک و مشرب اپنا کردار ادا کررہا تھا۔ قاضی عدیل احمد عباسی کے یہ اقتباسات خلافت تحریک کے قائدین کی جدوجہد اور کام کے طریقہ کار کو بخوبی واضح کرتے ہیں:

مسلمانانِ ہند نے صرف زبانی ہمدردی، فریاد وفغاں، دعاہائے صبح گاہی اور اشک سوگاہی سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا، بلکہ حتیٰ الامکان عمل بھی پیش کیا۔ اس عمل کی ایک مثال تو وہ گراں قدر چندے ہیں جو امراء وغرباء احرار کاسہ کیسان حکومت برطانیہ سب نے بذوق وشوق پیش کیے۔ دوسری مثال ان انجمنوں اور مجالس کی ہے جو قفس کی تیلیوں کے اندر کی دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود قائم کی گئیں۔ اس زمانہ میں ایک صدی سے زائد سے فرنگی محل (لکھنؤ) مسلمانان ہند کی مذہبی وتہذیبی اقدار کا پیشوا اور ہدایت ورشد کا مرکز تھا۔ اس فرنگی محل کا چراغ ایک عظیم انسان سے روشن تھا جو نہ صرف ایک عالم متبحر، اخلاق عالیہ وفاضلہ سے مزین دیدہ وری وبصیرت سے معمور بلکہ دردملت سے بے چین اور روشن خیالی، تدبر اور حکمت عملی سے بھی دنیائے اسلام کے لیے سرگرم عمل تھا۔ یہ تھے مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ خلافت ترکی کے معاملہ میں فرنگی محل قانون کے اندر جدوجہد کا مرکز تھا۔ مولانا کی فراست نے بادلوں کے محیط ہونے سے پہلے بارش کا اندازہ

کر لیا تھا اور ''خدام کعبہ'' کی بنیاد رکھی تھی جس میں خود مولانا خادم الخدام تھے۔ ''خدام کعبہ'' نے ملت اسلامیہ ہند کے ہر فرد میں ایک ولولہ تازہ اور خلافت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ سے ایک عظیم محبت وعقیدت کا جذبہ پیدا کیا۔ گویا کہ یہ حرکت و عمل کے لیے نقش اول تھا۔ بعدہ تحریک خلافت کے زمانہ میں فرنگی محل مرکز رہا۔ مولانا محمد علی، مولانا عبد الباری کے مرید تھے اور وہیں سے ان کو اور شوکت علی کو ''مولانا'' کا اعزازی خطاب عطا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ واقعی مولانا ہو گئے۔ جب تک کہ مولانا محمد علی نے اپنے بے مثال دردِ دل کے ماتحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں لے لیا مولانا عبد الباری ہی کی ذات تھی جن کا نام نامی ہر جگہ آتا تھا۔ ''مہاتما گاندھی کا حکم مولانا عبد الباری کا فتویٰ'' کے اشتہارات جگہ جگہ آویزاں نظر آتے تھے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مہاتما گاندھی کے ساتھ مسلسل دورے کر رہے تھے اور ہر جگہ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے۔ آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش و خروش پیدا ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ شہروں میں تقریباً روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے جن میں مقامی لیڈر تقریریں کرتے تھے۔ اور عوام وخواص ہر ممکن قربانی کے لیے تیار تھے۔ پورا ملک بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس منظر کو جس نے دیکھا وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اب خلافت اور سوراجیہ کی تحریک ایک میں خلط ملط ہو گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کے بھی جلسے ہوتے تھے اور ان میں تو گرمی ہی گرمی تھی۔ لیکن اب خلافت کے حصول کا ذریعہ بھی سوراجیہ قرار دیا گیا تھا اور کل ملک کی نگاہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ کانگریس کی اہمیت روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ دوسری جماعتیں بھی اگرچہ بہت پر جوش تھیں اور انہیں کی بدولت یہ فضا پیدا ہوئی تھی۔ تاہم وہ معین و مددگار کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

مولانا محمد علی کی مذہبیت، دینداری، علم و فضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشا پردازی، فن شعر گوئی کی مہارت، خطابت کے زور، اپنے خلوص و دیانتداری اور ایثار و قربانی جیسے محاسن اعلیٰ سے مزین تھے۔ اور وہ نظر بندی سے نکلنے کے بعد ہی ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن گئے تھے۔ جب وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کرتے تھے تو ہر جگہ مہاتما گاندھی جی کے ساتھ مولانا محمد علی زندہ باد کے بھی نعرے لگتے تھے۔ اور اللہ اکبر ہندو مسلمان دونوں پکارتے تھے۔ گاندھی جی کے دوروں میں خصوصیت سے بالالتزام علی برادران ہی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ مولانا آزاد بھی دورہ کرتے تھے اور بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے تھے۔ ان کا اور گاندھی جی کا بھی کبھی آگے پیچھے اور کبھی ہمراہی میں ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ مولانا کی عظمت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

تحریک کا خاتمہ

یکم نومبر 1922 کو ترکی کے سربراہ مصطفی کمال اتاترک نے سلطان وحید الدین کو معزول کر کے سلطان عبد المجید کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی ترکی کو ایک یورپی طرز کی جمہوریت قرار دے کر سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اس مذموم اقدام کے بعد اس نے 3/ مارچ 1924 کو خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دنیا کے نقشے سے خلافت کا وجود مٹ گیا اور ترکی بھی دیگر حکومتوں اور ملکوں کی طرح ایک عام ملک بن گیا۔ اس واقعہ نے جس طرح پورے عالم اسلام کو خون کے آنسو رلایا، اسی طرح ہندستان میں بھی غم و

غصہ اور رنج والم کی ایک لہر دوڑادی۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اب تحریک خلافت کا اصل مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی تحریک کے دفاتر اور علاقائی مراکز کام کرتے رہے اور احیاء خلافت کی بات کرتے رہے، لیکن عملی دنیا میں یہ ممکن نہ تھا۔ اس لیے یہ تحریک اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

16.3.5 تحریک کے اثرات

تحریک خلافت کے خاتمہ پر انگریزوں اور ان کے طرفداروں نے بہت خوشیاں منائیں، لیکن اُن کی آنکھیں اُن اثرات کو دیکھنے سے معذور تھیں، جو اثرات اس تحریک نے چھوڑے تھے۔ آنے والے وقت نے بتادیا کہ اگرچہ تحریک خلافت بظاہر ختم ہوگئی تھی، لیکن اس کے اثرات سے ہندستان تادیر مستفید ہوتا رہا، یہاں تک کہ 1947 میں ملک کو انگریزی سامراج سے آزادی حاصل ہوگئی۔ مختصر طور پر تحریک خلافت کے اثرات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

1. مسلمانوں میں اسلامی خلافت کی اہمیت اور اس کی برکات سے واقفیت کا شعور بیدار ہوا۔
2. مسلمانوں میں زبردست اتحاد پیدا ہوا۔
3. ہندو مسلم اتحاد کی مضبوط بنیاد حاصل ہوئی اور اس اتحاد کے شاندار مظاہر سامنے آئے۔
4. ملک کو کئی بڑے لیڈر ہاتھ آئے، جیسے گاندھی جی، ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر وغیرہ۔
5. یہ تحریک انگریزوں کے خلاف کئی تحریکوں کا مقدمہ ثابت ہوئی، جس کے نتیجہ میں ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔

16.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تحریک ریشمی رومال 1857 کے بعد اٹھنے والی پہلی سب سے بڑی تحریک تھی۔ تحریک ریشمی رومال میں سب سے مرکزی اور کلیدی شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی شخصیت تھی۔
- تحریک ریشمی رومال کا مقصد عام بغاوت کرکے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنا اور دوبارہ اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ سرحدی اور آزاد قبائلی علاقے تحریک ریشمی رومال کا خصوصی مرکز تھے۔
- دوسرے فوائد کے ساتھ تحریک ریشمی رومال کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تحریک خلافت برپا کرنے کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔
- تحریک خلافت کا مقصد خلافت عثمانیہ کی حفاظت تھا۔
- گاندھی جی نے تحریک خلافت میں شرکت کرکے اس کے وزن میں اضافہ کیا۔ اس سے ان کا قد بھی بہت بلند ہوا۔
- خلافت تحریک کا ایک بڑا فائدہ ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں سامنے آیا، جس سے آزادی کی راہ آسان ہوئی۔

- مولانا عبد الباری فرنگی محلی، گاندھی جی اور محمد علی جوہر کو تحریک خلافت کی سب سے مرکزی شخصیات کہا جا سکتا ہے۔
- تحریک خلافت نے پورے ملک میں انگریز بیزاری اور حصول آزادی کا ماحول پیدا کیا۔

16.5 نمونہ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ریشمی رومال کے بانی کون تھے؟

(a). سید احمد شہید (b). مولانا محمود حسن دیوبندی (c). علامہ شبلی نعمانی (d). سر سید احمد خان

2. تحریک ریشمی رومال کس نوعیت کی تحریک تھی؟

(a). عدم تشدد کی (b). علمی و تحقیقی (c). عوامی و ہنگامی (d). خفیہ و انقلابی

3. ان میں سے کون سا رہنما تحریک ریشمی رومال کا حصہ نہیں تھا؟

(a). گاندھی جی (b). محمد علی جوہر (c). سید سلیمان ندوی (d). ان میں سے کوئی نہیں

4. تحریک خلافت کی پرزور مخالفت کس نے کی؟

(a). مدن موہن مالویہ (b). ولبھ بھائی پٹیل (c). جواہر لال نہرو (d). ان میں سے کوئی نہیں

5. خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اہم ذریعہ کون بنا؟

(a). ملکہ ایلزبتھ (b). سلطان عبد المجید (c). مصطفی کمال اتاترک (d). سلطان عبد الحمید ثانی

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ریشمی رومال کا پس منظر کیا تھا؟
2. مولانا محمود حسن دیوبندی حجاز مقدس کیوں گئے؟
3. تحریک ریشمی رومال کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
4. تحریک خلافت کے بنیادی اور فروعی مقاصد کیا تھے؟
5. تحریک خلافت میں گاندھی جی کی شمولیت سے انہیں اور تحریک کو کیا فائدہ ہوا؟

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تحریک ریشمی رومال کے مقاصد اور اثرات کا جائزہ لیجیے۔
2. خان عبد الغفار خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شخصیت اور خدمات پر دس دس سطریں قلم بند کیجیے۔

3. اسلام میں خلافت کی اہمیت کیا ہے؟ اور تحریک خلافت کے کیا مقاصد تھے۔ واضح کیجیے۔

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تحریک ریشمی رومال : مولانا سید محمد میاں
2. سفر نامہ اسیر مالٹا : مولانا سید حسین احمد مدنی
3. نقش حیات : مولانا سید حسین احمد مدنی
4. تذکرۂ شیخ الہند : مفتی عزیز الرحمان بجنوری
5. تحریک خلافت : قاضی محمد عدیل عباسی
6. تذکرہ : مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

ایم۔اے، اسلامک اسٹڈیز

آٹھواں پرچہ (ہندوستان کے مسلم مفکرین و تحریکات)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. **حصہ اول میں 10 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔** 10x1=10

i. کس کے کہنے پر افغانستان کے باشاہ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا؟

(a). شاہ ولی اللہ (b). شبلی نعمانی (c). اعلامہ اقبال (d). سرسید

ii. درج ذیل میں سے کونسی علامہ اقبال کی تصنیف ہے؟

(a). ارمغان حجاز (b). المامون (c). شعر العجم (d). سحر البیان

iii. انڈیا ونس فریڈم کس کی تصنیف ہے؟

(a). علامہ اقبال (b). شبلی نعمانی (c). ابوالکلام ازااد (d). سرسید

iv. جمیعۃ علمائے ہند کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟

(a). چندی گڑھ (b). کانپور (c). لکھنو (d). دیوبند

v. تبلیغی جماعت کے بانی کا کیا نام تھا؟

(a). مولانا مودودی (b). مولانا الیاس (c). مولانا احمد رضا (d). ان میں سے کوئی نہیں

vi. جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کب ہوئی؟

1945.(a) 1947.(b) 1948.(c) 1951.(d)

vii. مرکزی جمیعت اہل حدیث کے پہلے بانی کون ہیں؟

(a). عبداللہ غازی پوری (b). علامہ شمس الحق (c). مولانا ثنا امرتسری (d). مولانا ابراہیم سیالکوٹی

viii. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پہلا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟

(a). کانپور (b). دہلی (c). لکھنو (d). ممبئی

ix. معرکہ بالاکوٹ کا واقعہ کس تحریک کے ساتھ وابستہ ہے؟

(a). ریشمی رومال تحریک (b). فرائضی تحریک (c) تحریک مجاہدین (d). واقعہ 1857 غدر

x. بغاوت 1857 کی فوری وجہ کیا تھی؟

(a). پھوٹ ڈالنا (b). بندوق کے کارتوس (c). دست کاری کے کارخانے بند کرنا (d). سب غلط

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریبا دو سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔ **6x1=6**

2. علامہ اقبال کے نظریہ و افکار پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. سنی بریلوی جماعت کی خدمات کا تعارف پیش کیجیے۔
4. جامعہ نظامیہ کی علمی خدمات کا خلاصہ پیش کیجیے۔
5. آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
6. جماعت مجاہدین کی جدوجہد آزادی میں خدمات کا تعارف کروایے۔
7. ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشوں کا جائزہ لیجیے۔
8. اسباب بغاوت ہند کس کی تصنیف ہے کتاب اور مصنف کا مختصراً تعارف پیش کیجیے۔
9. جنگ آزادی میں خلافت تحریک کے رول پر گفتگو کیجیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریبا 500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. ہندوستان کی سیاسی فکر و نظر کو تبدیل کرنے میں علامہ شبلی نعمانی کی خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔
11. جمیعت علمائے ہند کے قیام کے اسباب و مقاصد اور خدمات پر ایک مضمون قلمبند کیجیے۔
12. جماعت اسلامی ہند کی خدمات کا تعارف پیش کیجیے۔
13. ہندوستان میں مسلمانوں کی قیادت ختم ہونے کی بنا پر انگریزوں کے دور میں قائم ہونے والے مسلم علمی اداروں کے قیام کے بارے میں اپنے خیالات کو جامع انداز میں قلمبند کریں۔
14. ہندوستان کی جنگ ازادی میں ما قبل اور مابعد 1857ء مسلمانوں کا کیا کردار رہا؟ تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔